قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مئی 2017 قیمت 15₹

ماہنامہ اردو دنیا
نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

چوتھی عالمی اردو کانفرنس

'اردو صحافت کے دوسو سال' کا اجرا کرتے ہوئے عزت مآب پرکاش جاوڈیکر

شعیب رضا فاطمی

نظامت کرتے ہوئے

قمر تبریز

اشفاق عارفی

جویریہ قاضی

حقانی القاسمی

وسیم راشد

ماہنامہ اردو دنیا

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19، شمارہ:05، مئی 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زبیر

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL_New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

کور اسٹوری

چوتھی عالمی اردو کانفرنس — شعیب رضا فاطمی 8

انٹرویو

سنجیدہ اور پاپولر لکھنے والوں کے درمیان فرق مٹ گیا ہے: پروفیسر بیگ احساس — محبوب خان اصغر 13

زبان و تعلیم

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی صورت حال — محمد احسن 16

نصاب تعلیم میں انسانی اقدار کی تلاش — مشتاق احمد 20

ادبی مباحث

زبان زد اشعار میں تحریف — فضل حسنین 23

وجودیت اور اردو ناول — سفینہ بیگم 25

پطرس بخاری کی طنز و مزاح نگاری — ظفر گلزار 29

لسانی رشتے

ادبی تراجم کی روایت — مزمل سرکھوت 33

ذرائع ابلاغ

ریڈیو ترسیل، فکر و فن کی بازیافت — شاہد حسین 38

عالم کاری، زبان و ادب اور سوشل میڈیا — سلیم محی الدین 41

سلسلۂ صحافت

عصر حاضر میں تصویری صحافت کی معنویت — محمد وصی اللہ حسینی 44

نوآبادیاتی ہندوستان اور اودھ پنچ کا مزاحمتی کردار — رضی احمد 48

شخصیات

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی — شہزاد انجم 50

سماجیات

موجودہ تعلیمی نظام میں سوشل ورک کی اہمیت — ابو اسامہ 54

شہر بین

سہسرام: ایک تاریخی اور تہذیبی و ثقافتی شہر — پرویز اشرفی 57

نیا آسمان نئے ستارے

سرسید کا تصور علم — حافظ محمد جہانگیر اکرم 59

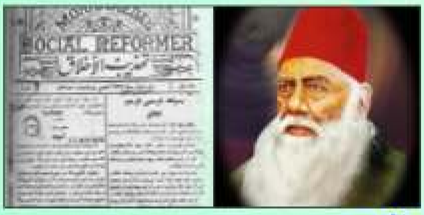

جائزہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' مطبوعات نمبر — م ق سلیم 62

سمت نما

'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ — ارشاد قمر 64

سائنس

اردو ادب میں سائنس کی شمولیت — توصیف خان 67

صحت

بنا دوا بلڈ پریشر پر قابو پائیے — شمس الاسلام فاروقی 70

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 72

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

ہماری بات

قومی اردو کونسل کے لیے یہ بات باعث فخر و مسرت ہے کہ اس ادارے نے فروغ اردو کے امکانات کی جستجو کے لیے جو بھی اقدامات کیے ہیں ان کی ستائش صرف ملک نہیں بلکہ بیرون ملک بھی ہورہی ہے۔ کسی بھی ادارے کے لیے یہ بات بڑی اہم ہوتی ہے کہ اس کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے اور اس کے مشن سے کیسی کیسی شخصیتیں جڑی ہوئی ہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو قومی کونسل نے تاسیس سے لے کر اب تک کامرانی کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں اور اب یہ ادارہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ممالک میں اردو سے محبت کرنے والوں کے لیے خصوصی توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔ اردو کے تعلق سے جتنے بھی مسائل اور مباحث ہیں اس کے لیے سب کی نگاہیں اسی ادارے پر مرکوز ہیں۔ چاہے اصطلاحات سازی کا مسئلہ ہو یا تراجم کے ذریعے اردو کے فروغ کا، سائنسی، سماجی علوم وفنون کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا، یا قانونیات یا ابلاغیات پر نئی تحقیقات کا، قومی اردو کونسل نے اردو زبان کے کسی بھی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے اداروں میں قومی اردو کونسل کو مرکزیت حاصل ہوگئی ہے۔ حال ہی میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام چوتھی عالمی اردو کانفرنس میں غیر ملکی قلمکاروں، فنکاروں کی دلچسپی اور ان کی شرکت سے اندازہ ہوا کہ ہندوستان سے باہر کے ان ملکوں میں جہاں جہاں اردو ہے وہاں قومی اردو کونسل کو بہت ہی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی سرگرمیوں پر پوری اردو دنیا کی نگاہ ہے۔ بیرون ہند کے زیادہ تر اردو سے محبت کرنے والے افراد یہ بھی چاہتے ہیں کہ کونسل کی سرگرمیاں صرف ہندوستان تک ہی محدود نہ ہوں بلکہ پوری اردو دنیا میں اس کا دائرہ کار بڑھے کیونکہ اردو ایک عالمی رابطے کی زبان بن چکی ہے اور دیگر زبانوں سے رشتہ رکھنے والے بھی اردو زبان کے تعلق سے مثبت جذبات اور احساسات رکھتے ہیں۔ چوتھی عالمی اردو کانفرنس کی تقریروں سے بھی اندازہ ہوا کہ ہمیں اردو زبان کو ایک خاص حلقے تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے دانشوروں، قلمکاروں کو بھی اس زبان سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ اس کانفرنس میں بہت سے ایسے مندوبین نے شرکت کی جن کا براہ راست اردو زبان سے تعلق نہیں ہے مگر اردو کی محبت میں انھوں نے نہ صرف اس چوتھی عالمی اردو کانفرنس کی رونق میں اضافہ کیا بلکہ ایسے تجاویز اور مشورے دیے جن سے اس زبان کے دائرے کو وسیع کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مختلف شعبوں اور سیکٹروں میں اردو زبان کے فروغ کی بات کہی اور یہ واضح کیا کہ اس زبان میں بڑی قوت اور وسعت ہے۔ اس کانفرنس میں مختلف ممالک میں اردو کے تدریسی، ادبی اور لسانی منظرنامے کے حوالے سے بھی بہت مربوط اور مفید گفتگو ہوئی جس سے یہ احساس ہوا کہ ہمیں اردو کے تعلق سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا اسکوپ روز بروز بڑھتا جارہا ہے اور مختلف ملکوں میں اردو کے تعلق سے لوگوں میں دلچسپی بھی ہے۔

اس کانفرنس کی خاص بات یہ رہی کہ مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند عزت مآب محترم پرکاش جاوڈیکر نے کانفرنس میں نہ صرف شرکت کرکے ہماری مسرت کو دوبالا کیا بلکہ اردو زبان سے اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے اردو کے مسائل کو بہت غور سے سنا اور مفید مشورے بھی دیے۔ انھوں نے اردو میں تعلیمی مواد مہیا کرانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ یقیناً انھیں یہ احساس ہے کہ اگر اسکولوں میں اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اس کے لیے تعلیمی مواد کی فراہمی بہت ضروری ہے۔ وزیر محترم نے قومی کونسل کی حسن کارکردگی کی ستائش بھی کی۔

چوتھی عالمی اردو کانفرنس میں اردو کے تعلق سے جو اہم موضوعات و مسائل سامنے آئے ہیں ان پر قومی اردو کونسل سنجیدگی سے غور کرے گی اور فروغ اردو کے لیے ہر ممکن اقدامات کی کوشش بھی کرے گی۔ اس موقعے پر ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم تمام غیر ملکی اور ہندوستانی مندوبین کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کریں جن کی شرکت سے کانفرنس کی مقصدیت اور معنویت میں اضافہ ہوا اور ہم اردو زبان و ادب کے کچھ اہم اور نئے مسائل سے روشناس ہوئے۔ اردو اخبارات کا بھی شکریہ ضروری ہے کہ اس کانفرنس کی کامیابی میں ان کا بھی کردار بہت اہم رہا ہے۔

ارتضیٰ

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

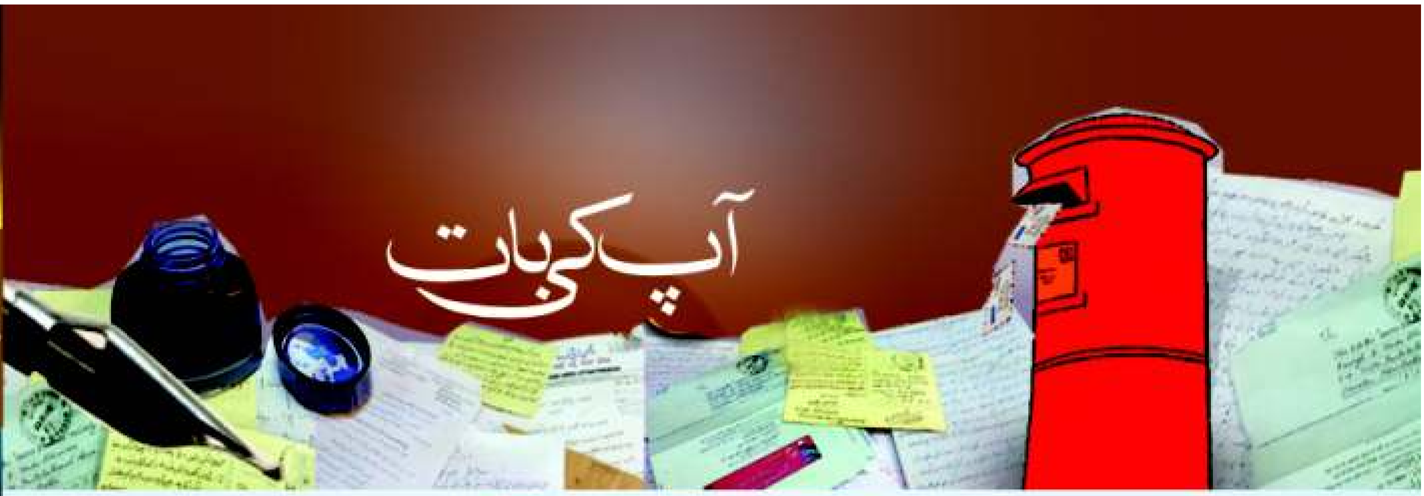

آپ کی بات

اپریل ماہ کا شمارہ جاذب نظر و دیدہ زیب ہے۔ 'ہماری بات' میں مدیر صاحب نے 'قومی اردو کونسل' کی اہم مطبوعات پر مبنی نمبر شائع کرنے کی بات کہی تھی۔ تاہم شمارے کا بیشتر حصہ اسی نصب العین پر مبنی و مختص ہے۔ یہ کتب کے شائقین کا تقاضا بھی تھا۔ اگر ہر ایک کتاب کی تفصیل کے بعد اس کی قیمت بھی درج کر دی جاتی، تب یہ مزید بہتر ہوتا۔

جناب حقانی القاسمی نے شہرۂ آفاق ادیب فاروق ارگلی کے ساتھ جو مشافہ کیا ہے، اس میں ان کی حد درجے دیانت داری و استعداد کو بہ حسن و خوبی منعکس کیا ہے۔ ارگلی صاحب نے صفحہ 9 پر کسی بھی شخص کو اپنا استاد بنانے کی بنسبت اپنے وجدان یا شعور کو ہی اپنا 'استاذ' ٹھہرانے کی بات کی ہے۔ بلند پایہ شاعر بہادر شاہ ظفر نے اگرچہ بادشاہ ہونے کے باوصف محمد ابراہیم ذوق کو اپنا استاد بنایا تھا، تاہم چند شرارتی عناصر نے ظفر کے دیوانوں کا خالق ہی ذوق کے ہونے کی افواہ اُڑا دی تھی۔ جب سر سید احمد خاں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو ان کا یہ جواب قابل داد تھا کہ "بھلا ذوق کیا کھا کر عظیم شاعر ظفر کے دیوان لکھیں گے، یہ کہو کہ ان کو قلعے کے تعلق سے زبان آ گئی ہوگی۔" از خود ظفر کا یہ شاندار اور طنزیہ رنگ و لہجے سے لبریز شعر ہر ایک دور میں تمام شعرا کے لیے قابل تقلید ہو سکتا ہے:

اے ظفر اپنی ریاضت کا نہ جب تک بل ہو
نہ تو بل پیر کا کام آئے، نہ استاد کا بل

محمد آدم نے 'قومی کونسل' کی اشاعتی خدمات کو مختصر سے مقالے میں بہ حسن و خوبی سمیٹا ہے۔ کلی طور پر اس شمارے سے 'کونسل' کی ہمہ جہت کارکردگیوں کی مناسب اور واجب خط کشی ہوئی ہے، جس کے لیے ادارہ درخور تہنیت قرار دیا جائے گا۔

ڈاکٹر کرشن بھاوک: گورو نانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' اپریل کا شمارہ خرید کر مطالعہ کیا۔ کتابوں اور اردو کی اشاعت کے حوالے سے آپ کا اداریہ مبنی برحقیقت ہے۔ رسالہ مکمل طور سے قومی کونسل کی جانب

سے شائع شدہ مختلف موضوعات پر کتابوں کے تعارف پر مشتمل ہے۔ اس سے استفادہ کیا۔ محترم کیا ہی اچھا ہوتا اگر اسی کے ساتھ کونسل کی مالی امدادی اسکیموں تاریخوں اور اس کی شرائط کا بھی تذکرہ ہوتا۔ یا کتابوں کی خریداری کے متعلق رہنما اصول کا بھی ذکر ہوتا تو اس کے مستفیدین کا دائرہ مزید پھیلتا۔ حقانی صاحب کے ذریعے جناب فاروق ارگلی صاحب کا لیا گیا تفصیلی انٹرویو بہت پسند آیا جس میں انھوں نے بڑے بسط وصداقت کے ساتھ اپنی ادبی حیات کا ذکر کیا ہے۔ ارگلی صاحب سے غائبانہ تعارف ان کے ان مضامین کے ذریعے ہوا جسے وہ سہارا میں شعرا اداروں اور فلمی شخصیات کے تعارف میں پورے اخباری صفحے پر لکھتے تھے۔

انصار احمد معروفی: مئو، یوپی

'اردو دنیا' مارچ 2017 کا تازہ شمارہ ذرا تاخیر سے ملا، بہرکیف شکریہ! زیر نظر شمارے کے اداریے 'ہماری بات' میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو زبان کی عالمی وسعت اور ملک کے اندر کی تشویش ناک صورت حال کا مختصر اور جامع جائزہ لیا ہے۔ یہ بات یقیناً سوچ اور فکر کی ہے کہ اردو کی جتنی عظمت غیر ممالک کے اردو دانوں میں ہے ہمارے ملک کے اندر ایسی بات نہیں ہے اور یہاں کے اردو گھرانوں میں بھی نہیں ہے۔ بقول ارتضیٰ کریم اس کی وجہ خود اردو زبان والے ہیں جو خود اپنی اولاد کو اردو پڑھانے سے گھبرا رہے ہیں ان کی یہ گھبراہٹ اور جھلاہٹ کا جائزہ لیا جائے تو اس بات کا جواب اور جواز عیاں ہو جاتا ہے کہ اردو روٹی روزی کی حامل نہیں ہے جبکہ یوں سوچنے اور محسوس کرنے والوں کی مثال ایسی ہی ہے جو پانی کو سراب اور سراب کو پانی سمجھے ہوئے ہیں یعنی انگریزی زبان کی تعلیم بیشک انھیں روزی دے رہی ہے لیکن اردو زبان میں جتنا تہذیب و ثقافت اور ادب و مذہبیات کا خزینہ زنبیل اردو میں موجود ہے اتنا میرے خیال سے کسی اور زبان میں نہیں ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کا یہ کہنا درست ہے کہ یہاں بستی بستی، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ میں اردو ہندی بولنے والے موجود ہیں لیکن انھیں اردو سیکھنے اور پڑھنے کی سہولت میسر نہیں ہے۔ موصوف بھیونڈی (مہاراشٹر) میں کتابوں کا میلہ لگا کر یہ جائزہ لینے میں کامیاب ہو گئے کہ آج انٹرنیٹ کے ماحول کے باوجود اردو کتابوں کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ قائم ہے اور بقول مدیر شاعر افتخار امام صدیقی اردو اپنی جگہ زندہ اور توانا ہے لیکن سیکھنے والوں کا فقدان خود انھیں اپنی تہذیب اور اردو گھرانے سے محروم رکھا ہوا ہے۔ یعنی "گھر میں رہتے ہوئے محروم ہیں گھر کی چھت سے۔"

ایسی بے حسی اور بے ثباتی بے شک اردو دانوں کے لیے ایک المیہ ہے۔ اس المیے کو کاٹنے اور پیٹنے کے لیے 'اردو دنیا' نے جو نئے سلسلے شروع کیے ہیں وہ بلاشبہ قابل پذیرائی اور لائق مستحسن ہیں۔

طلحہ نقشبندی القادری نے اپنے مضمون 'اختر شیرانی بحیثیت صحافی' پیش کر کے اختر شیرانی کی کائنات فکر و فن سے آگاہ کیا ہے جہاں سے وہ آغاز سفر کرتے ہوئے اپنے متعدد صحافتی لوح و قلم کی اختریت کی ضوفشانیاں تادم آخر بکھیرتے چلے گئے۔

ف س اعجاز نے مضمون 'راج کپور' کو پوری صراحت کے ساتھ پیش کیا ہے اس مضمون میں انھوں نے راج کپور کو

کلچر بوائے سے لے کر ایک ممتاز عالمی شومین کے مرتبے تک کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ان کی ہدایت اور ذاتی پروڈکشن میں بنی ہوئی فلمیں آگ، آہ، برسات، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، شری چار سو بیس، آوارہ سے میرا نام جوکر تک انھیں جتنی شہرتیں اور دولتیں نصیب ہوئیں شاید ہی فلم انڈسٹری کے کسی بھی فلم ساز اور ہدایت کار کے حصے میں آئی ہوں جبکہ اس وقت گرودت، بمل رائے، محبوب خان، کے آصف، شانتارام اور دلیپ کمار جیسے بلند بانگ فلم ساز اور ہدایت کار بھی موجود تھے— ان تمام کے مدمقابل اپنی فلم سازی اور ہدایت کاری کا لوہا منوانا ایک بڑا (Challenge) رہا ہے جسے راج کپور نے پوری فن کارانہ صلاحیت کے ساتھ نبھایا اور منوایا ہے۔ آخرش وہ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ کی اعزازی منزل تک پہنچ کر راج کپور نے نہ صرف دم لیا بلکہ دمے کا شکار ہو کر اپنے آخری سفر کا اعلان کیا۔

علیم صبا نویدی: رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی، تمل ناڈو

اردو دنیا کا شمارہ مارچ 2017 مطالعہ کے لیے موصول ہوا۔ تبصرہ کے کالم میں جناب محمد رضا فراز صاحب کے تبصرے پڑھ کر خوشی ہوئی کیونکہ آپ نے کتابوں کا تفصیل سے مطالعہ کر کے تبصرے بے باک لکھے ہیں اور ان کتابوں کی خصوصیات کو بڑی ہی خوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔

انیس الحسن صدیقی: 679، سیکٹر 22B، گڑگاؤں

'اردو دنیا' کا شمارہ (مارچ 2017) باصرہ نواز ہوا۔ دنیائے ادب میں 'اردو دنیا' کا نہ جواب تھا اور نہ ہے۔ یہ رسالہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی پروقیع تخلیقات باذوق حضرات کی تسکین روح و قلب کا سامان مہیا کرتی ہے۔ یقیناً یہ شمارہ پچھلے شماروں کی طرح امتیازی خصوصیتوں یعنی حسن کتابت وطباعت سے مالا مال ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد گراں قدر، معلوماتی اور محققانہ مضامین و مشمولات کا مجموعہ ہے۔ اس میں مضامین صرف اردو ادب تک محدود نہیں بلکہ اس میں تہذیب و ثقافت، صحت و تعلیم پر بھی گراں قدر مضامین شائع ہوتے ہیں۔

پروفیسر شبنم حمید نے کرشن چندر کی علمی، افسانوی اور دیگر خصوصیات کو جس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔

طالب اکرام: 1238، دائرہ شاہ رفیع الزماں، الہ آباد، یوپی

مارچ کا شمارہ موصول ہوا۔ 'ہماری بات' میں ارتضیٰ کریم صاحب نے دنیا کے دیگر ممالک میں اردو زبان

کے پھلنے پھولنے کا جو منظر پیش کیا وہ اپنے آپ میں خوش آئند تو ضرور ہے مگر موصوف کی یہ تشویش کہ "عالمی سطح پر جہاں اردو زبان کا دائرہ پھیل رہا ہے وہیں ملکی سطح پر ہم سکڑتے اور سمٹتے جارہے ہیں۔" یقیناً ایک خطرناک صورت حال ہے۔ جس سے نمٹنا آخر ہم اردو والوں کو ہی ہے کیونکہ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں ہمارا عظیم ورثہ، تہذیب اور شناخت بھی ہے جس سے ہمارا تشخص قائم ہے اس لیے ہر حال میں ہمیں ہماری زبان کی پرداخت کرنی ہے۔

محترم عبدالرحیم نشتر ودربھ کی وہ مایہ ناز ہستی ہے جو اپنی شاعری اور نثر میں منفرد لہجہ و برجستہ اسلوب سے پورے برصغیر میں جانے جاتے ہیں۔ یوں تو آپ کی غزلیں، نظمیں ملک کے موقر رسائل و جرائد میں تواتر سے شائع ہوتی رہتی ہیں مگر شاذ ہی آپ کی نثر سے قارئین حظ حاصل کر پاتے ہیں۔ عبدالرحیم نشتر کی نثر میں دیگر خصوصیات کے ساتھ ان کا انداز بیان، جملوں میں چستی، شگفتہ الفاظ کا انتخاب تحریروں میں سہل نگاری اور بات کو مخصوص انداز سے کہنے کا طریقہ جو تسلسل کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ قاری کو آخری سطور تک باندھے بھی رکھتا ہے۔

'عکس رفتہ' کالم میں عبدالرحیم نشتر نے برصغیر کا '2016 کا ادبی جائزہ' بڑے جامع انداز میں پیش کیا جس کے مطالعے کے بعد میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ موصوف نے گذشتہ برس کا ایک ایک واقعہ، سانحہ، ادبی سرگرمیاں، وہ شخصیات جو ہم سے بچھڑ گئیں اور وہ بھی جو آج موجود ہیں اور ادبی دنیا کی رونقیں بڑھا رہی ہیں ان تمام شخصیات کا احاطہ اس طرح کیا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کیا ہو۔ ساتھ ہی ان تمام رسائل و جرائد کا بھی تذکرہ کیا جنھوں نے خاص نمبر شائع کیے پھر چاہے وہ

نثر میں ناول، افسانہ، مضامین یا تنقید ہوں یا پھر شاعری میں نظم غزل اور دوسری اصناف سخن ہوں۔ ان تمام کا اجمالی جائزہ تحریر کر کے اسے ایک مکمل دستاویزی شکل عطا کر دی گئی جسے پڑھ کر سال رفتہ کی یادیں دل و ذہن میں پیوست ہوگئیں۔

ڈاکٹر اظہر ابرار: ایس کے پوروال کالج، کامٹی (ناگپور)

'اردو دنیا' کے جنوری کے شمارے میں تبصروں کے کالم میں بنگال کے افسانہ نگار محمود یٰسین کے افسانوی مجموعے 'نئی بستی کا رزمیہ اور دیگر افسانے' پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ تبصرہ پڑھ کر یہ تاثر ملا کہ مبصر نے کتاب کو پڑھے بغیر تبصرہ کر دیا ہے۔ کم از کم جن افسانوں کا ذکر کیا ہے ان کو بھی انھوں نے نہیں پڑھا ہے۔ مثال کے طور پر ٹائٹل افسانے 'نئی بستی کا رزمیہ' کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

"محمود یٰسین کی نئی بستی میں ابہام ہے۔ یہاں کی نئی بستی میں موجودہ عہد کا نوجوان طبقہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے یا پورا عہد یا پھر اس سے اس دنیا کی تخصیص ہوتی ہے جو روزگار اور اچھے مستقبل کی تلاش میں مختلف ممالک میں آباد ہیں۔"

"پہلی بات تو یہ کہ 'نئی بستی کا رزمیہ' میں کوئی ابہام ہی نہیں ہے۔ یہ افسانہ بیانیہ اسلوب میں بنگال کے سماجی نظام کی کہانی ہے جس میں ایک مقامی کلب سے وابستہ طاقتور افراد ایک کنبے کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ کیونکہ وہ حکمراں طبقے کے حاشیہ بردار نہیں بننا چاہتے اور اپنے نظریات اور ترجیحات کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔ اس کلب کو حکمراں طبقے، پولس اور نام نہاد دانشوروں کی پشت پناہی حاصل ہے اس لیے کوئی بھی اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ محمود یٰسین نے حاشیے میں یہ

اشارہ بھی کر دیا ہے کہ یہ بستی ایک بہت بڑی نوآبادی کا استعارہ بھی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس طرح یہ کلب امریکہ اور اس کے حلیف ممالک ناٹو کو Represent کرتا ہے۔ جس نے تمام دنیا کو اپنی سیاسی گرفت میں لے رکھا ہے اور جو ممالک ان کی اطاعت گزاری نہیں کرنا چاہتے انھیں کسی بہانے سے برباد کر دیتا ہے اور اس کام کے لیے وہ نام نہاد دانشوروں، حقوق انسانی ایجنسیوں اور میڈیا کا بھی استعمال کرتا ہے۔

فاضل مبصر نے ان کے افسانے 'رسائی' کے بارے میں لکھا ہے: ''کتاب میں شامل افسانہ 'رسائی' کا مطالعہ کرنے سے زمانے کے مکر وفریب اور بے وفائی اور نارسائی کی صورت سامنے آتی ہے۔''

ان کا یہ بیان بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے اس افسانے کو بھی نہیں پڑھا اور محض قیاس کی بنا پر اپنی رائے دے دی۔

افسانہ 'رسائی' دراصل اس اسلامی عقیدے پر مبنی ہے کہ خدا انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایک ایسے شخص کی نفسیاتی کیفیت کو بیان کیا ہے جسے ہمیشہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا اس کے بہت قریب کہیں ہے اور وہ اس تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً اسے محسوس ہوتا ہے کہ سامنے کو میدان ہے اس میدان کے اس پار جانے پر خدا تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے یا پھر سامنے کھڑی عمارت کے اس پار خدا سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ اس طرح یہ افسانہ اس 'بندے' کی معصوم حسیت کا آئینہ دار ہے۔ مگر جب ہر بار وہ خدا تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو وہ اپنی اس کوشش کو ترک کر دیتا ہے۔

اب اس خلاصے کی روشنی میں 'زمانے کے مکر وفریب' والا جملہ پڑھیں تو خود مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ مبصر نے مجموعے میں شامل افسانے 'سائیکی' کا بھی غیر نفسیاتی تجزیہ کیا ہے یہ ایک پیچیدہ موضوع سائیکی سے متعلق ہے۔

یہ افسانہ دراصل انسان کی جنسی نفسیات، خوف، عدم تحفظ اور انسان کی سائیکی میں چھپے ہوئے شرانگیز خیالات کا بہت ہی فنکارانہ Treatment ہے جسے مبصر پوری طرح (یا پھر جزوی طور پر بھی) سمجھنے میں ناکام رہیں۔ تبصرے میں انھوں نے جو بقیہ باتیں لکھی ہیں وہ کسی بھی جدید افسانہ نگار کے افسانوں کے متعلق کہی جاسکتی ہیں۔

'اردو دنیا' ایک معتبر رسالہ ہے لہٰذا اس میں ایسے تبصرے نہ شائع کیے جائیں جو کتاب کو پڑھے بغیر روا روی میں لکھے گئے ہوں اور کتاب کے مواد اور معیار سے متعلق قاری کو گمراہ کرتے ہوں۔ ایک مصنف اپنے دل و دماغ کے خون کو جلا کر کسی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔ اس کا کم از کم اتنا تو حق ضرور بنتا ہے کہ اس پر ایک ایماندارانہ اور عالمانہ تبصرہ شائع ہو۔

عبدالحلیم انصاری: آسنسول ،مغربی بنگال

'اردو دنیا' دسمبر 2016 کے سرورق پر ہم اپنے رفتگان کو یاد رکھنا چاہتے ہیں اس کے تحت جملہ 18 ادیبوں، شعرا، نقاد، محققین کی تصویریں شائع ہوئی اور جن کا انتقال 2016 میں ہوا۔ ان 18 ادیبوں و شعرا کی رحلت سے زبان و ادب کا بے پایاں نقصان ہوا ان کی یاد آتی رہے گی۔

جنوری 2017 کا شمارہ اپنی معنی خیزی کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ مدیر نے اہم بات کہی کہ اردو زبان کا کوئی نیا علاقہ دریافت ہوا یا اردو پڑھنے والوں کا نیا طبقہ وجود میں آیا کیا اردو میں قارئین کی تعداد بڑھی ان تین سوالوں کا ایک ہی جواب ہے نسل نو کو اردو سکھانا ضروری ہے جب ہم اردو کا بنیادی کام ٹھوس انداز سے کریں تو اس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

فروری 2017 کے شمارے میں مدیر صاحب کا یہ کہنا کہ کتب خانے یقیناً ہمارے لیے روشنی کے مینار ہیں اس سے میں متفق ہوں لیکن ہندوستان میں مطالعہ کلچر بتدریج مفقود ہوتا جا رہا ہے خاص کر کتب خانوں میں اردو کتب پر گرد جمی ہوئی ہے کوئی پڑھنے والا نہیں آرہا ہے یہاں حیدرآباد میں آصفیہ لائبریری میں بے شمار کتب ہیں لیکن اردو قاری ندارد ہے۔

ماہ مارچ کے شمارے میں مدیر صاحب کا یہ کہنا کہ عالمی سطح پر جہاں اردو زبان کا دائرہ پھیل رہا ہے وہیں ملکی سطح پر ہم کچھ سکڑتے اور سمٹتے سے جارہے ہیں۔ وہ علاقے جہاں اردو کی بہار تھی یقیناً اب یہی صورت حال ہے اس کے ذمے دار اردو والے ہیں اردو والوں نے دانستہ اردو سے دوری اختیار کی۔ شمال ہو کہ جنوبی ہند اردو کی حالت بتدریج متاثر ہورہی ہے۔ ٹی آر رینا نے اردو زبان کی بین الاقوامی شہرت میں اردو کے تعلق سے تفصیلات پیش کی ہیں لیکن ملک میں اردو کا کیا حال ہے اس پر ہمیں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ، نظام آباد

خواتین دنیا

خواتین کے لئے اردو میں سرکاری سطح پر شائع کئے جانے والا یہ واحد رسالہ ہے۔ آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان اس مجلہ کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ جس میں خواتین کے مسائل ومتعلقات کے حوالے سے خیال افروز اور فکر انگیز تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ ادبیات کا بھی ایک اہم گوشہ ہے۔ خواتین کے مزاج اور ذوق کے مطابق نگارشات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس میں آپ کو ہر صفحہ پر تنوع نظر آئے گا۔ خواتین کے لئے ایک مکمل رسالہ ہے جسے آئندہ اور بھی بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس کے لئے آپ کے مشورے اور تجاویز درکار ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ اپنی تخلیقات ارسال کریں اور اس رسالے کی ممبر سازی کے لئے بھی اپنا تعاون پیش کریں۔

ہندوستانی خریداروں کے لئے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ 10 روپے

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھئے:

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی۔
110066 . فون: 26109746، فیکس: 26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

ہندوستان اور بیرونی ممالک میں اردو زبان وادب کا منظرنامہ

شعیب رضا فاطمی

دہلی ....خواجۂ خواجگان کی چوکھٹ، سلاطین و فرمان روا کی کارگاہ عمل، رشیوں اور منیوں کا آستانہ، شاعر و ادیبوں کا فکری گہوارا، فن کاروں و دستکاروں کی نمائش گاہ۔ جس دہلی نے تاریخ کے اوراق ہی نہیں ان گنت ابواب پر اپنے ایسے دستخط ثبت کیے کہ جس کی سیاہی آج تک روشن ہے۔ دہلی جس نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جہاں جمنا کے تٹ پر بنسی کی آواز کے ساتھ اذان کی آواز بھی گونجی، اسی تٹ پر گوپیوں نے اشنان بھی کیے اور مُلّا وضو بھی بناتے رہے۔ گیان دھیان کے ساتھ چلّوں اور ہوَن کے ساتھ مراقبے نے ہم آہنگ ہو کر دنیا کو کثرت میں وحدت کا پیغام دیا اور اپنی ایک الگ زبان تشکیل دی ایسی زبان جس کی ساخت عرب سے لی گئی قواعد فارس و اصفہان سمیت سنسکرت سے کچھ الفاظ بھاکا کے لیے تو کچھ دراوڑی کے برج کے تحفے بھی قبول کیے اور علاقائی بولی ٹھولی کو بھی صیقل کر کے اسے مرصع و مسجع بنا ڈالا اور نام اردو رکھ دیا۔ وہ اردو جس کے خمیر میں خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی ساحرانہ کشش ہے اور صوفیوں و ولیوں کی خود فراموشی بھی۔ وہ اردو جس کے اشعار ولیوں کی درگاہوں، صوفیوں کے تکیوں، مے خانے کی دیواروں، مساجد کے محرابوں، بادشاہوں کے درباروں سے ہوتے ہوئے پارلیامنٹ کے ایوانوں میں بھی نہایت فخر کے ساتھ بولی سنی اور سمجھی جاتی ہے۔ آج یہاں دہلی میں اسی زبان کا عالمی جشن ہے جس کی میزبانی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کر رہی ہے اور ساری دنیا سے میکشانِ اردو زبان وادب اس سمینار میں شریک ہو رہے ہیں۔ فروری اور مارچ کا مہینہ، دہلی میں ادبی بہار کا سیزن ہوتا ہے۔ خوشگوار اور پر فضا موسم کے سائے میں ادبی رونق کا چہار جانب چکا چوند کا سماں، اپنی خاموش زبان سے دعوت نظارۂ ادب دیتا نظر آیا۔ 2017 کا مارچ بھی اسی روایت کی پاسداری کرتا ہوا گزرا۔ شہر کی جملہ ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کے درمیان قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 18,17 اور 19 مارچ کو عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں زبان وادب سمیت تہذیبی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں افتتاحی پروگرام دہلی کے مشہور پانچ ستارہ اشوک ہوٹل میں منعقد کیا گیا جبکہ 18 اور 19 مارچ کے تمام پروگرام لودھی روڈ پر واقع اسکوپ کمپلیکس کے خوبصورت آڈیٹوریم میں انعقاد پذیر ہوئے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی قیادت میں منعقد ہونے والے اس عالمی سمینار کا عنوان تھا

'ہندوستان اور بیرونی ممالک میں اردو زبان و ادب کا منظر نامہ' اور اس موضوع پر کناڈا، برلن، جرمنی، ایران، سعودی عرب، انگلینڈ، ماریشس، قطر، ترکی، دبئی، امریکہ اور ازبکستان کے تیس سے زیادہ سفیر زبان و ادب اور ملک کی تقریباً ہر ریاست سے اردو کے دانشور و اسکالرز نے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے پر مغز مقالے پیش کیے۔ اردو زبان اسی ملک میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی، یہ ملک کے ہر طبقے کی زبان ہے۔ اردو انسانوں کے درمیان محبت کی زبان ہے۔ یہ ملک گنگا جمنی تہذیب کا علمبردار ہے اور اردو اسی تہذیب کی ترجمان ہے۔ ان خیالات کا اظہار وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل ڈاکٹر مہیندر ناتھ پانڈے نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چوتھی عالمی اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کونسل کے کاموں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ یہ نہایت خوشی کا موقع ہے کہ قومی اردو کونسل نے اپنی کانفرنس میں پوری اردو دنیا کی اہم شخصیات کو اکٹھا کرلیا ہے جو یقیناً اردو زبان کے لیے خوش آئند ہے۔ میں اس کانفرنس میں شریک تمام مندوبین کا حکومتِ ہند کی جانب سے استقبال کرتا ہوں اور کانفرنس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔ ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر اُدت راج نے کہا کہ اردو ہندوستان کی اپنی زبان ہے اور اس زبان کو کسی مذہب سے جوڑنا اردو کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ سابق وزیر اور ممبر پارلیمنٹ جناب سید شاہنواز حسین نے اس موقعے پر کہا کہ موجودہ سرکار کے تحت اردو کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی۔ کیونکہ ہماری سرکار ملک کے تمام شعبوں میں ترقی کی خواہش مند ہے۔ اردو کے فروغ کو ایک تحریک بنا دینے کی ضرورت ہے۔ قومی اردو کونسل اور تمام اردو والوں کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اردو کو ہر گھر میں پہنچانے کا عزم کریں۔ میں برسراقتدار پارٹی کا ترجمان بنایا گیا ہوں لیکن اردو کا پیدائشی ترجمان ہوں اور اس کی فلاح و بہبود نیز ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتا ہوں۔ اس سے قبل قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سبھی مہمانوں کا استقبال کیا اور عالمی اردو کانفرنس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے وزیر موصوف سے 3 مارچ کو یوم اردو منانے کی منظوری دینے کی بھی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ کانفرنس میں شرکت کرنے والے کئی لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ یہ کانفرنس ملک کے باہر بھی ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سرکار سے مدد کی درخواست کی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اسکولوں میں کونسل کی طرف سے اردو اساتذہ مہیا کرانے کی بھی یقین دہانی کرائی۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل ڈاکٹر مہیندر ناتھ پانڈے، ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر اُدت راج، سابق ممبر پارلیمنٹ سید شاہنواز حسین، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، اسرار الحق قاسمی، پی اے انعامدار وغیرہ نے شمع روشن کرکے کیا۔

کانفرنس کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے نامور ناقد و محقق پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو کی تاریخ پر

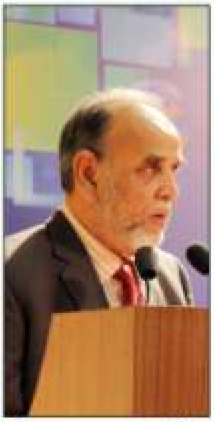
ظہور الاسلام جاوید (دبئی)

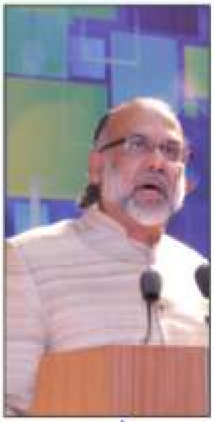
جاوید دانش (کناڈا)

دویہ راج امیا (جرمنی)

احمد اشفاق (دوحہ قطر)

آصف علی عادل (ماریشس)

سائی ناتھ منتھال چاپلے (ترکی)

ریحان خان (دبئی)

رجب درگن (ترکی)

تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کے پچہتر فیصد الفاظ سنسکرت سے لیے گئے ہیں۔ اردو کے نامور فکشن نگار سید محمد اشرف نے اس موقعے پر کہا کہ اردو کا بنیادی مسئلہ اردو کی تعلیم و تدریس ہے۔ انھوں نے سرکار سے درخواست کی کہ حکومت کو اس سمت میں کونسل کی زیادہ سے زیادہ مدد کرنی چاہیے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد کناڈا سے تشریف لائے جاوید دانش نے قدیم صنف 'داستان گوئی' کی وساطت سے بیرون ملک رہنے والے لوگوں کی جذباتی کیفیت کو نہایت ڈرامائی انداز میں پیش کر کے ایک سماں باندھ دیا۔ افتتاحی تقریب کے آخری مرحلے میں ممبئی سے تشریف لائے رحمٰن علی اور ان کے ہمنواؤں نے اردو کے معروف شعرا کے کلام کو اپنی ساحرانہ آواز میں پیش کر کے سامعین کو مسحور کر دیا۔

جمیلہ (ماریشس)

فرزانہ اعظم لطفی (ایران)

تاشیانہ شیام تقی (ماریشس)

زینب سعیدی (ایران)

وفا یزدان منش (ایران)

قومی اردو کونسل کی عالمی اردو کانفرنس کے دوسرے دن صدارتی خطاب کرتے ہوئے الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رتن لال ہانگلو نے کہا کہ اردو زبان پوری دنیا میں رابطے کی سب سے بڑی زبان ہے۔ اسی زبان نے پورے ملک کو جوڑ رکھا ہے۔ قومی اردو کونسل قابل ستائش ہے کہ اس نے نہایت اہم موضوع ہندوستان اور بیرونی ممالک میں اردو زبان کے منظرنامے پر اس عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ موجودہ دور اردو زبان کی ترقی کا دور ہے اور ہمیں نئی تحقیق کے ساتھ ساتھ علاقائی تاریخ اور ادب پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ کانفرنس کے دوسرے دن کے دوسرے اجلاس میں سب سے پہلا مقالہ جرمنی سے تشریف لائے ڈاکٹر دویہ راج امیا نے پیش کیا۔ ان کے علاوہ دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی (ایران)، ڈاکٹر ہاجرہ بانو (مہاراشٹر)، جناب فہیم اختر (برطانیہ)، ڈاکٹر مشتاق احمد (دربھنگہ) اور پروفیسر نعمان خان (بھوپال) نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر ہانگلو کے علاوہ رانچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر شین اختر، دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر زماں آزردہ (کشمیر)، پروفیسر حبیب نثار (حیدرآباد) اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر شامل تھے۔ پروفیسر شین اختر نے کہا کہ ہندوستان میں اگر مسلمان نہ بھی آتے تب بھی اردو زبان زندہ رہتی۔ یہ زبان اسلامی، ایرانی، ہندی اور دیگر تہذیبوں کے میل جول سے بنی تھی۔ نظامت ڈاکٹر اشفاق عارفی نے اپنے خوبصورت انداز میں انجام دی۔

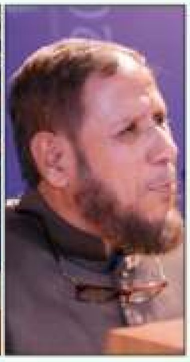
مہتاب قدر (جدہ)

خاقان قیوم ہڈ (ترکی)

شہاب الدین احمد (دوحہ قطر)

فہیم اختر (لندن)

افروز عالم تاج (امریکہ)

کانفرنس کے دوسرے دن کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ملک اور بیرون ملک سے تشریف لائے بھی مہمانوں کا استقبال کیا۔ سیمینار کے پہلے اجلاس کا آغاز جناب فیروز بخت احمد کے مقالے سے ہوا۔ اس اجلاس میں ماریشس کی تاشیانہ شمتالی، ترکی کے جناب سائی ناتھ وتھال چاپلے، ماریشس کے جناب آصف علی عادل نے مقالے پڑھے۔ اس سیمینار کی صدارت پروفیسر ناشر نقوی، جناب مشتاق احمد نوری، ریحان خان (دبئی)،

پروفیسر سجاد حسین (چنئی)

ایم سعید الدین (چنئی)

ڈاکٹر ساجد حسین (دہلی)

کیول دھیر (پنجاب)

بیگ احساس (حیدرآباد)

سید محمد اشرف

پروفیسر رتن لال ہانگلو

پروفیسر شین اختر

امتیاز کریمی

پروفیسر اختر الواسع

جناب امتیاز احمد کریمی نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض جویریہ قاضی نے انجام دیے۔ صدارتی خطبے میں ناشر نقوی نے قومی اردو کونسل سے درخواست کی کہ وہ قومی بہادری ایوارڈ یافتہ بچوں کے حوالے سے کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کریں۔ امتیاز احمد کریمی اور جناب مشتاق احمد نوری نے اپنے صدارتی خطبے میں اردو اور نئی نسل کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ ریحان خان (دبئی) نے بھی اردو کی موجودہ صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔

ظہرانے کے بعد تیسرا اجلاس پروفیسر فاروق بخشی، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر سید سجاد حسین، پروفیسر شبنم حمید اور مہمانِ خصوصی ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر قمر تبریز نے کی۔ اس اجلاس میں محترمہ وفا یزداں منش (ایران)، جناب مہتاب قدر (جدہ)، جناب محمد امان اللہ ایم بی (چنئی)، معصوم عزیز کاظمی (گیا)، محترمہ جمیلہ (ماریشس) اور ڈاکٹر ریسپ درگن (ترکی) نے مقالے پڑھے۔ ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی نے بے حد پرمغز گفتگو کی اور اردو کی بنیادی تعلیم کو درپیش مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ بنیادی تعلیم مادری زبان میں حاصل کرنے والا اپنے ملک اور تہذیب سے جڑا ہوتا ہے۔ اردو تا قیامت زندہ رہنے والی زبان ہے۔ مجلس صدارت کے دیگر اراکین نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس سیشن کے بعد اردو کی ہم عصر ادبی و لسانی صورتِ حال پر ایک مباحثے کا انعقاد کیا گیا جس کی نظامت محترمہ وسیم راشد نے کی۔ بحث کا آغاز معروف

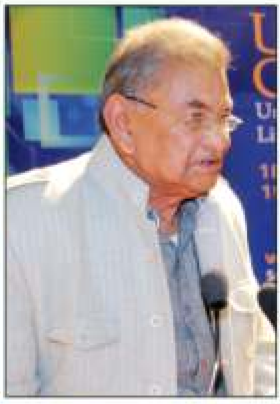

پروفیسر قدوس جاوید (جموں)

مشتاق احمد نوری (پٹنہ)

پروفیسر حسین الحق (گیا)

فکشن نگار پروفیسر حسین الحق نے کیا۔ اس مباحثے میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر غضنفر علی اور امریکہ سے تشریف لائے جناب افروز تاج نے حصہ لیا۔ مباحثے کے بعد ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک اور بیرونِ ملک کے شعرائے کرام نے معیاری کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل عزت مآب پرکاش جاوڈیکر نے قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ عالمی اردو کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں کہا کہ ہر زبان بہت پیاری ہوتی ہے اور اردو تو بہت ہی پیاری اور میٹھی زبان ہے۔ یہ کسی خاص مذہب نہیں بلکہ سب کی زبان ہے۔ بہت سی ہندوستانی زبانوں کے میل جول سے ایک ہندوستانی بھاشا وجود میں آئی جس کا نام اردو ہے۔ امیر خسرو کے کلام سے جو کچھ بھی وجود میں آیا ہے وہ آج تک ہم پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اردو میں زیادہ سے زیادہ تعلیمی مواد فراہم کیا جانا بہت ضروری ہے کیونکہ اگر ہندوستانی زبانوں میں نصاب نہیں تیار ہوگا تو اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے بچے کہاں سے آئیں گے۔ انھوں نے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا کہ اردو میڈیم اور ہندوستانی زبانوں کے اسکول بند ہو رہے ہیں۔ ان اسکولوں کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہمارے ذہنوں پر انگریزی کا بھوت سوار ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ انگریز جب ملک سے چلے گئے تو انگریزی زبان ہمارے اندر اور زیادہ شدت سے داخل ہوگئی۔ لوگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ بغیر انگریزی کے ترقی ممکن نہیں ہے۔ جبکہ بنیادی تعلیم مادری

پروفیسر غضنفر (دہلی)

پروفیسر شریف حسین قاسمی (دہلی)

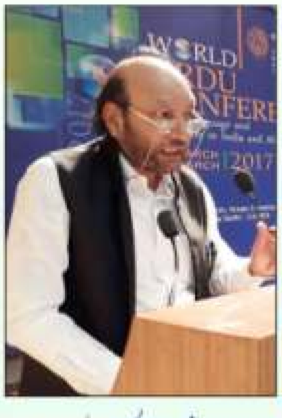

پروفیسر معین الحسن (دہلی)

فاروق بخشی (اودے پور)

پروفیسر نعمان خان (بھوپال)

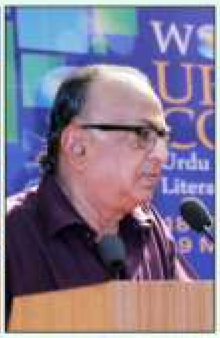
معصوم عزیز کاظمی (گیا)

ڈاکٹر مشتاق احمد (دربھنگہ)

نند کشور وکرم (دہلی)

اسلم جمشید پوری (میرٹھ)

زبان میں ہونی چاہیے۔ انھوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ عبرانی بولنے والوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن سائنس، میڈیکل، انجینئرنگ اور دیگر علوم وفنون کا سارا مواد عبرانی زبان میں موجود ہے۔ وزیر محترم نے عالمی یوم خواتین کے موقعے پر شائع ہونے والے قومی اردو کونسل کے نئے مجلّے 'ماہنامہ خواتین دنیا' اور دو حصوں پر مشتمل نئی کتاب 'اردو صحافت کے دو سو سال' کا بھی اجرا کیا۔ محترم پرکاش جاوڈیکر نے قومی اردو کونسل کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے کہا کہ اردو کی ترقی کے لیے ٹھوس تجاویز پیش کریں تو حکومت ان پر سنجیدگی سے غور کرے گی اور ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اٹھارہ ملکوں سے آئے ہوئے مندوبین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو کو صرف ہندوستان نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی فروغ دینے کی کوشش کی جائے گی۔ انھوں نے اس موقعے پر یہ بھی کہا کہ میں تمام زبانوں کا احترام کرتا ہوں۔

واضح رہے کہ سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کا افتتاح اشوک ہوٹل میں 17 مارچ کو کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کے سارے اجلاس اسکوپ آڈیٹوریم لودھی روڈ نئی دہلی میں منعقد کیے گئے۔ سہ روزہ عالمی کانفرنس میں پرکناڈا سے تشریف لائے جاوید دانش نے اردو کے حوالے سے کچھ تجاویز پیش کیں۔ انھوں نے حکومت اور کونسل کے تعاون سے امریکہ، لندن، دوحہ قطر میں غالب چیئر کے قیام کی تجویز رکھی اور ڈیجیٹل دنیا میں اردو کو اور زیادہ بہتر اور موثر بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ ہندوستانی سفارت خانوں میں اردو سینٹرز کے قیام اور اردو کتب ورسائل کی فراہمی کی

پروفیسر شبنم حمید (الٰہ آباد)

ڈاکٹر ہاجرہ بانو (اورنگ آباد)

قمر سرور (مہاراشٹر)

صدف اقبال (گیا)

بھی تجویز رکھی۔ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے عزت مآب پرکاش جاوڈیکر جی کی اردو دوستی کے جذبے کو سلام کیا اور یہ واضح کیا کہ قومی اردو کونسل کی ترقی کا سفر ان کی سرپرستی میں جاری ہے اور آئندہ بھی ان کی سرپرستی میں قومی کونسل ترقی کی نئی عبارتیں رقم کرے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وزیر محترم اردو کی ترقی کے لیے اتنے فکرمند ہیں کہ خود اردو زبان سیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس موقعے پر غیرملکی مندوبین کو مرکزی وزیر محترم پرکاش جاوڈیکر، ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی اور جناب احتشام عابدی کے ہاتھوں مومنٹو اور توصیفی اسناد بھی دی گئیں۔

اختتامی اجلاس سے قبل مقالات کا سیشن ہوا جس کی صدارت ظہیر آئی قاضی، پروفیسر اختر الواسع، ظہور اسلام جاوید، پروفیسر عین الحسن، خواجہ عبدالمنتقم، قاسم خورشید اور معصوم عزیز کاظمی نے کی اور نظامت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے جناب حقانی القاسمی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر محترمہ زینب سعیدی (ایران)، نند کشور وکرم (دہلی)، خاقان قیوم ہو (ترکی)، احمد اشفاق (قطر)، شہاب الدین احمد (دوحہ قطر)، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (میرٹھ)، ڈاکٹر ایم سعید الدین (چنئی) نے اپنے پرمغز مقالات پڑھے اور عالمی سطح پر اردو کی مجموعی صورت حال کا جائزہ پیش کیا۔ اردو کے مسائل اور متعلقات کے حوالے سے پرمغز گفتگو ہوئی۔ مقالہ خوانی کے بعد 'شام افسانہ' کا انعقاد کیا گیا جس میں ہندوستان کے ممتاز افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے پیش کیے۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی بیشتر ریاستوں کے ممتاز قلم کاروں اور دانشوروں کے علاوہ دہلی کی تینوں جامعات کے طلبہ اور معززین شہر نے شرکت کی۔

Mr. Shoaib Raza Fatmi
Mob.: 9968778671
razashoaib57@gmail.com

خواجہ عبدالمنتقم (دہلی)

فیروز بخت احمد (دہلی)

پروفیسر ناشر نقوی (پنجاب)

امان اللہ ایم بی (چنئی)

محبوب خان اصغر

سنجیدہ اور پاپولر لکھنے والوں کے درمیان فرق مٹ گیا ہے

پروفیسر بیگ احساس

پروفیسر بیگ احساس کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ بطور افسانہ نگار، ناقد انھوں نے اپنی منفرد شناخت بنائی ہے۔ حال ہی میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'دخمہ' شائع ہوا ہے۔ کرشن چندر پر لکھی ان کی کتاب حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی تنقید متوازن اور مدلل ہوتی ہے۔ بطور ناقد بھی وہ اردو حلقے میں مقبول رہے ہیں۔ ان کے مضامین کی کتاب 'شور جہاں' بے حد معیاری مضامین پر مشتمل ہے۔ اس شمارے میں پیش ہے پروفیسر بیگ احساس کا انٹرویو جو حال ہی میں اردو دنیا کے لیے خصوصی طور پر لیا گیا ہے۔ (ادارہ)

محبوب خان اصغر: اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے متعلق کچھ بتائیے۔

بیگ احساس: میں اپنے والدین کا سب سے چھوٹا اور اکلوتا لڑکا ہوں جو سات لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا۔ ظاہر ہے بہت ہی لاڈ و پیار سے پرورش ہوئی۔ والد صاحب محکمہ کروڑ گیری میں مہتمم تھے۔ جب میں عمر کے آٹھویں برس میں تھا، دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے والد صاحب کا اچانک انتقال ہوگیا۔ پھر تو سب کچھ بدل گیا۔ بڑی بہنوں نے پوری کوشش کی کہ مجھے یتیمی کا احساس نہ ہونے پائے۔ لیکن حقیقت تو حقیقت ہوتی ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد میں نے تعلیم جاری رکھنے کی بجائے ملازمت کرنے کو ترجیح دی۔ آخرکار 21 برس کی عمر میں اپنے بہنوئی کی مدد سے اگریکلچرل یونیورسٹی میں باقاعدہ ملازم ہوگیا۔ اس زمانے میں ایوننگ کالج ملازمت کرنے والوں کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ ایوننگ کالج سے تعلیم جاری رکھی۔ 1976 میں بی۔اے اور 1979 میں ایم اے (اردو) میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد میں شعبہ اردو قائم ہوا۔ پی ایچ ڈی میں داخلوں کا اعلان ہوا تو وہاں داخلہ لیا۔ نامور محقق پروفیسر گیان چند جین کے زیر نگرانی پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ 'کرشن چندر: شخصیت اور فن' لکھا۔ پروفیسر محمد حسن اور پروفیسر گوپی چند نارنگ ممتحن مقرر ہوئے۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود دونوں نے مقالے کو سراہا۔ 1985 میں یونیورسٹی کے پہلے کانوکیشن میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1993 میں یہ مقالہ شائع ہوسکا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کو کرشن چندر پر لکھا گیا اساسی نوعیت کا مقالہ قرار دیا۔ نامور محقق جناب رشید حسن خاں کے ہاتھوں اس کی رسم اجرا ہوئی۔ انھوں نے بھی مقالے کی تعریف کی۔

م خ ا: تخلیقی سفر کب اور کیسے شروع ہوا؟

بیگ احساس: والد صاحب رسالہ 'نظام المشائخ' پابندی سے منگواتے تھے۔ جس میں ایک اصلاحی ناول قسط وار شائع ہوتا تھا۔ لائبریری سے روزانہ ایک ناول منگوا کر ہماری بہن با آواز بلند سناتی تھیں۔ 'شمع'، 'افشاں'، 'انور' انھیں کی زبانی سنیں۔ صادق حسین سردھنوی کے تمام ناول بشمول 'آفتاب عالم' سنے۔ گھر میں 'نور' اور 'کھلونا' منگوائے جاتے تھے۔ لائبریری میں 'گھسیٹا کی بھتنا شاہی' جیسی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھیں۔ 'چڑیوں کی الف لیلیٰ'، 'الٹا درخت'، 'کھلونا' میں قسط وار شائع ہوتے تھے۔ چھٹی جماعت سے جاسوسی دنیا، رومانی دنیا اور شمع کا چسکا لگا۔ جب بھی تمام خالہ زاد بہن بھائی مل کر بیٹھتے کتابوں اور رسائل کی باتیں ہوا کرتیں۔ اخباروں میں 'بچوں کا صفحہ' کے لیے کہانیاں بھیجا کرتا۔ جو کبھی شائع ہوتیں کبھی واپس کردی جاتیں۔ میری ایک خالہ زاد بہن جو نہ ناول پڑھتی تھیں اور نہ ہماری گفتگو میں حصہ لیتی تھیں، بی۔اے کرنے کے بعد 'خاتون مشرق' میں افسانے لکھنے لگیں تو بڑی شرم محسوس ہوئی۔ ایک افسانہ 'سراب' لکھ کر ماہنامہ 'بانو' کو بھیجا۔ جو شائع ہوگیا۔ معاوضہ بھی ملا۔ اس کے بعد

'بانو' میں کچھ افسانے لکھے۔ بیسویں صدی، شمع، بانو، روبی میں بھی افسانے شائع ہونے لگے۔

م خ ا : پہلا افسانہ کون سا تھا؟

بیگ احساس : پہلا افسانہ 'سراب' ہی تھا۔ لیکن وہ ابتدائی کوشش تھی۔ اس افسانے کو میں نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل بھی نہیں کیا۔ لیکن افسانوں کی وجہ سے ادبی حلقوں میں پہچانا جانے لگا۔ بعد میں ادبی رسائل میں افسانے بھیجے 'اندھیری دھوپ' وہ پہلا افسانہ ہے جو ماہنامہ 'کتاب' میں شائع ہوا۔ 'خوشۂ گندم' تحریک میں شائع ہوا۔ شہر کی ادبی انجمنوں میں بلایا جانے لگا۔ ادیبوں شاعروں سے متعارف ہوا۔ ایک انجمن 'معمار ادب' کے نام سے بنائی جس کے صدر مشہور مزاح نگار جناب نریندر لوتھر آئی اے ایس تھے، نائب صدور جناب عابد علی خاں (ایڈیٹر سیاست) جناب رحمت علی (ممبر پارلیمنٹ) مشہور افسانہ نگار اقبال متین اور جناب وید پرکاش وساج (میئر بلدیہ) تھے۔ دوسرے نوجوان ساتھی مختلف عہدوں پر تھے اور میں جنرل سکریٹری رہا۔ شہر میں اس انجمن کا کافی چرچا رہا۔ ہر مکتب فکر کے ادیبوں و شاعروں کو مدعو کیا جاتا۔ جب میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوگیا اور لوتھر صاحب نے اپنا تبادلہ آگرہ کروالیا تو انجمن کی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔

حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں نے کبھی انتہاپسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تمام اچھے ادیب و شاعر حلف کے رکن تھے۔ اردو انگریزی کے دانشور بھی اس سے وابستہ تھے۔ میں ایک لمبے عرصے تک اس کا جنرل سکریٹری رہا۔ ہمارے جدید نقادوں نے حیدرآباد کے فن کاروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ویسی توجہ نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔ بعد میں 'شب خون' کا انتخاب شائع ہوا تو اس میں حیدرآباد کے کئی فن کار شامل نہیں تھے۔

م خ ا : جدید ادب کی جانب آپ کی رغبت کی وجہ کیا ہے؟

بیگ احساس : پی ایچ ڈی کی تکمیل سے قبل ہی ڈاکٹر زینت ساجدہ کے دور صدارت میں 1984 میں بحیثیت لکچرار تقرر ہوگیا۔ پروفیسر مغنی تبسم حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) کے صدر تھے اور پروفیسر غیاث متین جنرل سکریٹری۔ دونوں نے اصرار کیا کہ 'حلف' کا ممبر بن جاؤں۔ حلف جدید ادیبوں اور شاعروں کی انجمن تھی۔ اس وقت کا غالب رجحان یہی تھا۔ حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں نے کبھی انتہاپسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تمام اچھے ادیب و شاعر حلف کے رکن تھے۔ اردو انگریزی کے دانشور بھی اس سے وابستہ تھے۔ میں ایک لمبے عرصے تک اس کا جنرل سکریٹری رہا۔ ہمارے جدید نقادوں نے حیدرآباد کے فن کاروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ویسی توجہ نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔ بعد میں 'شب خون' کا انتخاب شائع ہوا تو اس میں حیدرآباد کے کئی فن کار شامل نہیں تھے۔

م خ ا : ترقی پسند تحریک کے زوال پذیر ہونے کی وجہ کیا ہے؟

بیگ احساس : اس پر کافی لکھا جاچکا ہے۔ سب سے پہلے حیدرآباد کے رسالے 'صبا' میں 'سخن گسترانہ بات' لکھ کر وحید اختر نے ہی ترقی پسند تحریک پر سوال قائم کیے تھے۔ اب تو ترقی پسند تحریک کی مخالفت میں ابھرنے والے رجحان جدیدیت کو بھی زوال آگیا۔ ہر تحریک اور رجحان اپنا رول پورا کرکے ختم ہوجاتے ہیں ان کے مثبت پہلو روایت کا حصہ بن کر باقی رہ جاتے ہیں۔

م خ ا : پھر موجودہ عہد کو آپ کس رجحان اور تحریک سے وابستہ سمجھتے ہیں؟

بیگ احساس : مابعد جدیدیت کے بعد تو کوئی نیا نظریہ وجود میں نہیں آیا۔

م خ ا : مابعد جدیدیت کیا ہے۔ اس کا عمل ادب میں کس طرح موجود ہے؟

بیگ احساس : مابعد جدیدیت ایک صورت حال ہے۔ ادب، آرٹ، اور فکر کے نئے رویوں کے لیے اس اصطلاح کا استعمال کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور کسی ایک نظریۂ ادب کا نہیں نظریہ ہائے ادب کا ہے۔ ساختیات، پس ساختیات، قاری اساس تنقید، ردتشکیل، تانیثیت، نئی تاریخیت، پچھڑے ہوئے طبقات کا ادب سب اسی زمانے میں سامنے آئے۔ ایک عرصے سے نہ ویسی شاعری کی جارہی ہے اور نہ افسانہ لکھا جارہا ہے۔ جیسا جدیدیت کے دور میں لکھا گیا۔ مابعد جدیدیت مقامیت، ثقافتی تشخص، تکثیریت، دبے کچلے عوام، نسوانی آزادی اور جڑوں کی تلاش پر زور دیتی ہے۔ ناول کا دور واپس آیا صرف 2000 سے 2016 تک 55 سے زیادہ ناول لکھے گئے۔ جامعات میں بھی تانیثیت، دلت ادب اور ثقافتی حوالوں سے کام ہورہا ہے۔ تنقید بھی لکھی گئی۔ تھیوری پر بھی مضامین شائع ہوئے۔ ایک کھلی فضا کا احساس ہوا۔ لیکن اب پھر منظر نامہ بدل رہا ہے۔ حاشیے سے جو مرکز میں آرہے تھے وہ پھر سے حاشیے پر ڈھکیل دیے گئے۔ عالمی منظر نامہ بھی تبدیل ہورہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے دنیا میں پھر سے ڈکٹیٹر شپ کا دور آنے والا ہے۔

م خ ا: آپ کے صرف تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے کم لکھنے کی کیا وجہ ہے؟

بیگ احساس : میرا تھیسس 'کرشن چندر شخصیت اور فن' تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'شور جہاں' بھی شائع ہوئے۔ چار برس تک عثمانیہ یونیورسٹی میں اور چھ برس تک یونیورسٹی آف حیدرآباد میں صدر شعبہ اردو رہا۔ ان دنوں عثمانیہ یونیورسٹی میں 18 سے زیادہ تدریسی عملہ تھا۔ تین پی جی سنیٹر تھے۔ افسوس اس عظیم یونیورسٹی میں اب صرف دو پروفیسر اور دو لکچرار رہ گئے ہیں۔ ایک لکچرار صدر شعبہ اردو ہے۔ جب تک کوئی کہانی مجھے لکھنے پر مجبور نہیں کرتی میں نہیں لکھتا۔ میں خود کو دہرانے سے گریز کرتا ہوں۔ موضوعات کے تنوع کا نقادوں نے بھی اعتراف کیا۔

توقیت نامہ/کوائف

نام : محمد بیگ

قلمی نام : بیگ احساس

پیدائش : 10 اگست 1948

تعلیم : ایم اے (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (یونیورسٹی آف حیدرآباد)

مصروفیات : پروفیسر و صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر و صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد

تصانیف

(1)	افسانے	خوشۂ گندم، حنظل
(2)	تحقیق	کرشن چندر، شخصیت اور فن
(3)	تنقید	شور جہاں
(4)	تعلیم بالغان	بوجھ کیوں، ہنوں، مرزا غالب
(5)	مونوگراف	شاذ تمکنت
(6)	ترتیب	دکنی فرہنگ
(7)	انگریزی ترجمہ	Twilight of the Mind (بیگ احساس کی منتخب کہانیاں)
(8)	ادارت	سب رس۔ اقبال ریویو

اعزازات
- بیسٹ ٹیچر ایوارڈ 2002 آندھراپردیش اردو اکاڈمی
- کارنامہ حیات ایوارڈ 2009 آندھراپردیش اردو اکیڈیمی

بیرون ملک : پاکستان، لندن اور ریاض

شاید کرشن چندر پر کام کرنے کی وجہ سے بھی بسیار نویسی سے گریز کیا۔ بسیار نویسی نے ایک اچھے افسانہ نگار کا قد گھٹا دیا۔ منٹو زیادہ دن زندہ رہتے تو شاید ان کا بھی یہی حشر ہوتا۔

م خ ا : شعر و حکمت بہت ہی ضخیم رسالہ تھا، دو جلدوں میں شائع ہوا کرتا تھا۔ گوشے بھی شائع کیے جاتے تھے۔ آپ کا کوئی گوشہ شائع ہوا؟

بیگ احساس : صلاح الدین پرویز نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں گوشوں کا قائل نہیں ہوں۔ مغنی تبسم اور شہریار صاحب سے میری کتنی قربت تھی سبھی جانتے ہیں۔ منع کرنے کے باوجود صلاح الدین پرویز نے استعارہ میں 'باب بیگ احساس' کے عنوان سے ایک گوشہ شائع کیا۔ ساجد رشید نے بھی 'نیا ورق' میں ہمیشہ مجھے بڑی محبت سے شائع کیا۔ دونوں جلد ہی ہم سے بچھڑ گئے۔ 'استعارہ' کے بند ہونے کا افسوس ہے 'نیا ورق' ساجد رشید کے صاحب زادے اور ان کے دوستوں نے جاری رکھا لیکن ساجد رشید کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ 'شعر و حکمت' بھی مغنی صاحب اور شہریار صاحب کے انتقال کے بعد بند ہوگیا۔

م خ ا : اتنا کم لکھنے کے باوجود آپ اکثر نقادوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

بیگ احساس : 1980 کے بعد میرا نام لیا جانے لگا۔ میری کہانیوں کے حوالے دیے جانے لگے۔ نئے اسکالرز متوجہ ہوئے۔ میں نے خود کو جدیدیت کی انتہا پسندی سے بھی دور رکھا اور بے رس اکہرے بیانیہ سے بھی......! جو بھی لکھا بہت سوچ سمجھ کر لکھا۔

م خ ا : آپ اپنے افسانوں کے نام اتنے مشکل کیوں رکھتے ہیں جیسے 'خوشہ گندم'، 'حنظل' اور اب 'دخمہ'!!

بیگ احساس : محض اتفاق ہے کوئی شعوری کوشش نہیں ہے۔ بقول مجتبیٰ حسین "بیگ احساس نے کم از کم دو مرتبہ مجھ جیسے ضعیف آدمی کو ڈکشنری دیکھنے پر مجبور کیا" میں نے افسانوں کے وہی عنوان رکھے جو مناسب تھے۔ کم سے کم اردو کا قاری ان الفاظ کے معنی تو تلاش کرے گا۔

م خ ا: تنقید کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ؟

بیگ احساس : جدیدیت کے دور میں بے معنی افسانوں کی تشریح کرکے ایسے فن کاروں کے سر پر عظمت کا تاج رکھ دیا گیا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ جو بہت جلد خاموش بھی ہوگئے۔ جن میں لکھنے کی صلاحیت تھی۔ انھوں نے خود کو بدلتے ہوئے وقت کے مطابق ڈھال لیا۔ تخلیق کار کی شہرت اور مقام نقاد کے رحم و کرم پر

اب پاپولر لکھنے والوں اور سنجیدہ لکھنے والوں کے درمیان فرق ہی مٹ گیا۔ اب تمام فن کار صف اول کے لکھنے والے ہیں۔ ایسے میں شناخت بنانا مشکل ہے۔ فیس بک پر افسانہ فورم چل رہے ہیں۔ جو پاپولر رسائل کا نعم البدل ہیں۔ ان افسانوں پر سنجیدہ تنقید نہیں ہوتی نہ اس کی گنجائش ہوتی ہے۔ فوری ردعمل ہوتا ہے۔ جس میں کوشش ہوتی ہے کہ آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔

ہوگئے تھے۔ نئے لکھنے والوں سے کہا گیا کہ اپنے نقاد خود پیدا کرو۔ ایک وجہ پیشہ تدریس سے وابستگی بھی ہے۔ سیمناروں میں شرکت اور اسکالرز کو گائیڈ کرنے کے لیے بھی تنقید سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ مغنی تبسم صاحب، گوپی چند نارنگ صاحب کی رہنمائی۔ وارث علوی صاحب اور شمیم حنفی صاحب کے تنقیدی رویے نے بھی متاثر کیا۔ اب تو باضابطہ نئے نقادوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور اچھی تنقید لکھی جارہی ہے۔ ان دنوں میرے علاوہ اور تخلیقی فنکاروں نے بھی تنقید کی طرف توجہ کی تھی۔

م خ ا : موجودہ دور میں بے پناہ ناول لکھے جارہے ہیں۔ کیا آپ بھی ناول لکھیں گے؟ موجودہ ناولوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

بیگ احساس : اگر جی چاہے گا تو ضرور لکھوں گا۔ بہت سے اچھے ناول لکھے گئے لیکن آج بھی ہماری سب سے بڑی ناول نگار قرۃ العین حیدر ہیں۔ ان کے فن پر لکھنے کی ہمت ہمارا کوئی نقاد نہ کرسکا یا حق ادا نہ کرسکا۔ قرۃ العین حیدر کے فن تک پہنچنے کے لیے ہماری تنقید کے پر جلتے ہیں۔ بعض ناول نگاروں کے ناولوں پر بہت لکھا گیا لیکن وہ عظیم نہ بن سکے۔

م خ ا : افسانے کا موجودہ منظر نامہ...... نئے لکھنے والوں سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

بیگ احساس : بے شمار نئے لکھنے والے آئے ہیں۔ لیکن پاپولر رسائل بند ہوجانے کی وجہ سے بڑا نقصان ہوا۔ اب پاپولر لکھنے والوں اور سنجیدہ لکھنے والوں کے درمیان فرق ہی مٹ گیا۔ اب تمام فن کار صف اول کے لکھنے والے ہیں۔ ایسے میں شناخت بنانا مشکل ہے۔ فیس بک پر افسانہ فورم چل رہے ہیں۔ جو پاپولر رسائل کا نعم البدل ہیں۔ ان افسانوں پر سنجیدہ تنقید نہیں ہوتی نہ اس کی گنجائش ہوتی ہے۔ فوری ردعمل ہوتا ہے۔ جس میں کوشش ہوتی ہے کہ آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے۔ اکثر فن کاروں کے ہاں 'کاتا اور لے دوڑی' والا عمل ہے۔ افسانچے اور مشہور افسانوں کے متن پر افسانے لکھنے کا بھی چلن ہے لیکن یہ ہماری روایت کا حصہ نہیں بن سکے۔

م خ ا : ایک استاد کی ذمے داری کیا ہوتی ہے؟

بیگ احساس : طالب علموں میں ادبی ذوق پیدا کرنا۔ ادب کی سمت و رفتار سے واقف کروانا۔ ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا۔ ایسے مضامین کو دلچسپ بنا کر پڑھانا جن سے طالب علم جی چراتے ہیں۔ پڑھاتے وقت اپنی پسند ناپسند کو ترجیح نہ دینا۔ طالب علم کو لگے کہ اس کی معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ کلاس کے باہر بھی ان کی تربیت کرنا۔ ایسے تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر ادب کے نئے رجحانات سے باخبر کرنا۔

م خ ا : آپ ادبی صحافت سے کب اور کیوں وابستہ ہوئے۔ موجودہ رسائل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

بیگ احساس : جن دنوں پی۔ ایچ ڈی کررہا تھا ملازمت سے رخصت لینی پڑی۔ اس لیے ایک فلمی رسالے 'فلمی تصویر' میں کام کرنے لگا۔ اس کے ادبی حصے کو ترتیب دینے کی ذمے داری سنبھالی۔ 1998 میں پروفیسر مغنی تبسم نے 'سب رس' کا معاون مدیر بنایا۔ مغنی صاحب نے بیماری کے بعد ادارہ آنا چھوڑ دیا اور بطور معتمد ادارہ مستعفی ہوگئے تو 2010 سے 'سب رس' کی ادارت سنبھالی۔ 'سب رس' کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ ضخامت میں اضافہ کیا جس کے نتیجے میں اشاعت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ادبی رسائل میں صرف سرکاری اداروں سے ماہنامے شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر، سب رس، شگوفہ، بیباک، سہیل اور انشا ہیں۔ سہ ماہی رسائل نکلتے ہیں۔ جن کی تعداد میں کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے۔

■

Mahboob Khan Asghar
1-5-214, First Floor, Pension Lane
New Bowenpally, Secunderabad
Telangana - 500011
Ph:0091-9246272721
e-mail: mahboobkhanasghar@gmail.com
Prof. Beg Ehsas
Prof. & Head Dept. of Urdu
Usmania University
Prof. & Head Dept. of Urdu
University of Hyderabad

محمد احسن

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی صورتِ حال

طلبا کی تعداد کے لحاظ سے چین اور امریکہ کے بعد ہندوستان کا اعلیٰ تعلیمی نظام دنیا کا تیسرا بڑا اعلیٰ تعلیمی نظام ہے۔ تاہم چین کے برعکس ہندوستان کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کی بنیادی زبان عمومی طور پر انگریزی ہے جس سے اس کی وسعت دوسری زبانوں میں کی ہوئی تحقیق کے مقابلے بڑھ جاتی ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں صرف 11 فیصد عوام کو اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل ہے۔ اس کے برعکس چین میں 20 فیصد لوگوں تک اعلیٰ تعلیم کی رسائی ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے اہم اداروں میں یونیورسٹیاں اور ان سے منظور شدہ/ملحقہ کالج شامل ہیں۔ فی الوقت ہندستان میں حکومت سے منظور شدہ تقریباً 769 یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں 47 مرکزی یونیورسٹیاں، 123 ڈیمڈ یونیورسٹیاں، 14 اوپن یونیورسٹیاں اور 353 ریاستی سطح کی یونیورسٹیاں ہیں۔ ریاستی یونیورسٹیوں کے اپنے الحاق شدہ کالج ہیں جہاں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن سطح تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے رجحان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا ملک جلد ہی چین کو پیچھے چھوڑ کر دنیا کا سب سے کثیر آبادی والا ملک بن جائے گا نیز ہندوستان معیشت کے میدان میں 8-7 فیصد سالانہ کی اوسط ترقی (Gross Domestic Product) کی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں متوسط طبقے کے درمیان اعلیٰ تعلیم کی مانگ میں اگلے دس برسوں میں 500 ملین سے زائد لوگوں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے تعلیمی نظام بالخصوص اعلیٰ تعلیمی نظام کا اصل موقف طبقہ اشرافیہ کی خدمت/مدد فراہم کرنا تھا۔ آزاد ہندستان میں اعلیٰ تعلیمی نظام کا موقف بدل چکا ہے۔ اب اسے عوام کی معاونت اور فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھ کر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص ابھرتے ہوئے نئے تکنیکی منظر نامے کے پیش نظر ہمارے تعلیمی نظام میں جدید کاری اور تبدیلی لازمی ہوگئی ہے۔

جب ہم اعلیٰ تعلیم میں تبدیلی کے سیاق و سباق پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا تعلیمی نظام ایک غیر معمولی تبدیلی کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ اس کی اصل وجہ ہماری بڑھتی ہوئی معیشت و ڈیموگرافک تبدیلی ہے۔ ہندوستان سال 2020 تک دنیا کی سب سے بڑی مڈل کلاس آبادی والے ملک کے ساتھ ایک بڑی معیشت بن کر ابھرے گا۔ گزشتہ دس برسوں میں اہم پیش رفت کے باوجود ہندوستانی اعلیٰ تعلیمی نظام متعدد چیلنجوں کا سامنا کر رہا ہے۔ ان میں سب سے بڑا چیلنج طلب اور فراہمی کے درمیان ایک طویل خلا کا ہونا ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم میں داخلوں کی شرح (16 فیصد) دوسرے ہم پلہ ممالک کے نسبتاً کم ہے۔ جبکہ چین میں اعلیٰ تعلیم میں داخلوں کی شرح 26 فیصد اور برازیل میں 36 فیصد ہے۔ ہمارے یہاں فی الوقت اعلیٰ تعلیم کی دستیابی مانگ کے مطابق نہیں ہے۔ جبکہ ہماری حکومت 2020 تک مجموعی داخلے (Gross Enrolment Rate) کی شرح کو 18 فیصد سے بڑھا کر 30 فیصد تک لے جانا چاہتی ہے۔ اس ضمن میں دوسری سب سے بڑی مشکل ہمارے یہاں تعلیم کا کمزور معیار ہے۔ دراصل ہمارا اعلیٰ تعلیمی نظام معیار کے متعدد مسائل مثلاً اساتذہ کی سخت قلت، غیر معیاری تدریس، فرسودہ اور زمانے سے مناسبت نہ رکھنے والا نصاب، تدریسیات کی عدم احتسابی، معیار کی عدم ضمانت (Ineffective quality assurance) اور تعلیم و تحقیق کو الگ الگ نہ کیے جانے (Segregation of Education and Reserach) جیسے مسائل سے گھرا ہوا ہے۔

تحقیق میں جدت کا فقدان اور ان سے وابستہ دیگر بندشیں بھی ہماری مشکلوں میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ ہمارے یہاں تحقیق میں داخلوں کی شرح اچھی نہیں ہے نیز اعلیٰ معیار کے محققین کا فقدان ہے۔ بین الکلیاتی اور کثیر شعبہ جاتی کام کرنے والوں کو بھی مواقع حاصل نہیں ہوتے۔ ہمارے ریسرچ اسکالروں میں ابتدائی مرحلے کے تحقیقی تجربے کی کمی بھی محسوس کی جاتی ہے۔ ان سب کے علاوہ ہندوستان میں جدت طرازی کے لیے کمزور ماحولیاتی نظام' تحقیق کرنے والوں کو صنعتی سرپرستی حاصل نہ ہونا جیسی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نیز ہندوستان کی مکمل آبادی کو یکساں ترقی اور مواقع تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ نیز سماجی و معاشرتی یکسانیت نہیں ہونے کے سبب ہندوستان کی آبادی ڈیموگرافی کی سطح پر کئی حصوں میں منقسم ہے۔ دوسری طرف کثیر الابعاد عدم مساوات (Multi dimensional Inequality) کے سبب ملک کے وسیع جغرافیائی حصے و طبقے میں پھیلی ہوئی مکمل آبادی کو اعلیٰ تعلیم تک رسائی حاصل نہیں ہے۔

'ہندوستان میں اقتصادی ترقی' 20-29 سال کے نوجوانوں کی کثیر آبادی' موجودہ بین الاقوامی صورت حال' وسیع تر عالمی عوامل اور تعلیم کی عالم گیریت وغیرہ وہ عوامل ہیں' جو اگلے 10 برسوں میں ہندوستان کے تعلیمی نظام کو نہ صرف متاثر کریں گے بلکہ یہ تحقیق کے لیے مالیہ (فنڈ کی فراہمی) کی شرائط کو اس قدر بدل دیں گے کہ تعلیمی ادارے ایک تجارت وصنعت کی حیثیت حاصل کرلیں گے۔ ہندوستانی معیشت میں اضافے کے سبب 2025 تک ملک کی کثیر نوجوان آبادی کے درمیان ثانوی و اعلیٰ تعلیم کی مانگ میں خاصا اضافہ ہوگا۔ قیاس یہ ہے کہ

تحقیق میں جدت کا فقدان اور ان سے وابستہ دیگر بندشیں بھی ہماری مشکلوں میں مزید اضافہ کرتی ہیں. ہمارے یہاں تحقیق میں داخلوں کی شرح اچھی نہیں ہے نیز اعلیٰ معیار کے محققین کا فقدان ہے. بین الکلیاتی اور کثیر شعبہ جاتی کام کرنے والوں کو بھی مواقع حاصل نہیں ہوتے. ہمارے ریسرچ اسکالروں میں ابتدائی مرحلے کے تحقیقی تجربے کی کمی بھی محسوس کی جاتی ہے.

ثانوی اعلیٰ تعلیم کی مانگ اس حد تک بڑھ جائے گی کہ مانگ کے مطابق فراہمی مشکل ہوگی۔ ثانوی و اعلیٰ تعلیم کے خواہاں وہ لوگ ہوں گے جو حکومت کی مالی معاونت کے بغیر اپنے تعلیمی اخراجات کو بخوبی برداشت کرسکیں گے۔

دراصل معیشت یا گھریلو پیداوار کے اضافے سے ثانوی و اعلیٰ تعلیم کی مانگ میں اضافہ ہونا لازمی ہے۔ یہ شرح اضافہ خصوصاً ان ممالک میں اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جن ملکوں میں گھریلو پیداوار (GDP) کی شرح پہلے سے کمزور ہوتی ہے۔ ہندوستان کی مضبوط ہوتی ہوئی معیشت میں پہلی نسل کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم تک رسائی کا مطالبہ کرے گی۔ آئندہ 10 برسوں میں یہاں تقریباً ڈھائی کروڑ خاندان (Household) ایسے ہوں گے جن کی آمدنی 10 لاکھ روپے سالانہ سے تجاوز کر جائے گی۔ ظاہر ہے یہ طبقہ اس قابل ہوگا کہ اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم پر ہونے والے اخراجات کو بخوبی برداشت کرسکے گا۔ تاہم یہ ترقی ناہموار ہوگی۔ نتیجتاً سب سے بڑی چنوتی یہ ہوگی کہ ہمارے یہاں ایک طرف وہ طبقہ ہوگا جن کے پاس بہتر زندگی کے مواقع میسر ہوں گے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہوں گے جن کی بہتر زندگی تک رسائی حاصل نہیں ہوگی۔ پرائمری اندراج کی شرح میں بڑی کامیابی حاصل کرنے کے باوجود بھی آؤٹ آف اسکول (Out of School) بچوں کی تعداد افریقی ملکوں کے مقابلے ہمارے یہاں سب سے زیادہ ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان کی 69 فیصد آبادی آج بھی اپنے اوپر 100 روپیہ روزانہ سے کم خرچ کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عالمی بینک نے ہندوستانی معیشت کو دوہری معیشت کے زمرے میں رکھا ہے۔

ہندوستان ثانوی تعلیم کے حصول کی خواہاں آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ فی الحال ہندوستان کی نصف آبادی سے زیادہ کی عمر ابھی اوسطاً 25 برس سے کم ہے۔ OECD کی ایک رپورٹ کے مطابق 2020 تک دنیا بھر میں 25-34 سال عمر والے 20 کروڑ لوگ کسی نہ کسی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوں گے۔ ان میں 40 فیصد چین اور ہندوستان سے ہوں گے۔ اس طرح ہندوستان اور چین عالمی طور پر باصلاحیت لوگوں (Global Talent Pool) کے ایک بڑے تناسب کی نمائندگی کریں گے۔

2020 تک ہندوستان میں 4 کروڑ لوگ اعلیٰ تعلیم کے لیے کوشاں ہوں گے جو موجودہ تعداد سے تقریباً ڈھائی گنا زیادہ ہوگا۔ گزشتہ دہائی میں ہمارے یہاں اعلیٰ

ہندوستان میں تقریباً 3کروڑ طلبا و طالبات ثانوی سطح کے اداروں میں اندراج کراچکے ہیں. اس حساب سے ہمیں 2020تک 800یونیورسٹیوں اور 40000 کالجوں کی ضرورت ہوگی. اتنی تعداد میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کا قیام وہ بھی اتنی کم مدت میں ایک دشوار مرحلے کے ساتھ مالی اخراجات کے بوجھ کو بڑھانے والا ہدف ہے. اس لیے حکومت نے اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے جرأت مندانہ منصوبہ بنا یا ہے جس میں پرائیویٹ و بیرونی تعلیمی اداروں کو فروغ دینا اور ان کے قیام میں آنے والی رکاوٹوں کو آسان کرنا شامل ہے.

تعلیم کے شعبے میں نمایاں ترقی رونما ہوئی ہے۔ اب ہندوستان اعلیٰ تعلیم فراہم کرنے والے اداروں کی تعداد کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک اور طلبا کی تعداد کے لحاظ سے دوسرا سب سے بڑا ملک بن گیا ہے۔ تاہم اپنی مثالی ترقی کے باوجود اعلیٰ تعلیم میں مجموعی داخلہ تناسب (Gross Enrolment Number) کے لحاظ سے ہندوستان ابھی بہت پیچھے ہے۔ یعنی یہاں داخلے کا تناسب ابھی بھی 20 فیصد تک ہی ہے جب کہ عالمی داخلہ تناسب 30 فیصد سے تجاوز کرچکا ہے۔ مجموعی داخلہ تناسب کی سطح پر جب ہم اپنا موازنہ اپنے پڑوسی ملک چین یا برازیل سے کرتے ہیں تو اپنے آپ کو ان ممالک کی صف میں نہیں پاتے۔ 2010 کی رپورٹ کے مطابق چین اور برازیل میں مجموعی داخلہ تناسب بالترتیب 26 فیصد اور 36 فیصد تھا۔

فی الحال ہندوستان میں تقریباً 3 کروڑ طلبا و طالبات ثانوی سطح کے اداروں میں اندراج کراچکے ہیں۔ اس حساب سے ہمیں 2020 تک 800 یونیورسٹیوں اور 40000 کالجوں کی ضرورت ہوگی۔ اتنی تعداد میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کا قیام وہ بھی اتنی کم مدت میں ایک دشوار مرحلے کے ساتھ مالی اخراجات کے بوجھ کو بڑھانے والا ہدف ہے۔ اس لیے حکومت نے اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے جرأت مندانہ منصوبہ بنایا ہے جس میں پرائیویٹ و بیرونی تعلیمی اداروں کو فروغ دینا اور ان کے قیام میں آنے والی رکاوٹوں کو آسان کرنا شامل ہے۔ ہندوستان میں ثانوی اور اعلیٰ سطح کی تعلیم فراہم کرنے والے اداروں

کی درجہ بندی تین قسموں میں کی جاسکتی ہے (1) یونیورسٹی اور یونیورسٹی سطح کے ادارے، (2) کالج، (3) ڈپلوما فراہم کرنے والے ادارے۔ اسی طرح فنڈ کی فراہمی کی سطح پر ان اداروں کو تین زمرے میں رکھا جاسکتا ہے:

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیمی ادارے

اداروں کی نوعیت/تعداد	مرکزی	ریاستی	پرائیویٹ	کل تعداد
یونیورسٹی اور یونیورسٹی سطح کے ادارے	152	316	191	659
کالج	669	13024	19930	33,023
ڈپلوما دینے والے ادارے	0	3,207	9,541	12,748
داخلوں کی فیصد	2.6%	38.6%	58.9%	100%

(ماخذ: بھارت میں اعلیٰ تعلیم: بارہویں پنج سالہ منصوبہ اور اس کے آگے، ارنسٹ اینڈ ینگ)

دراصل یونیورسٹیوں سے الحاق شدہ کالج ہندوستان کے اعلیٰ تعلیمی نظام کا اہم و مضبوط ڈھانچہ ہیں۔ طلبا کی ایک وسیع تعداد انھیں ریاستی یونیورسٹیوں سے الحاق شدہ سرکاری اور غیر سرکاری کالجوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنا رخ کرتی ہے۔ یہ تمام کالج کسی نہ کسی یونیورسٹی سے ملحقہ ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی ڈگری دینے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں الحاق شدہ کالج بڑی تعداد میں ہیں۔ جہاں ملک کے 90 فیصد سے زیادہ انڈر گریجویٹ طلبا 70 فیصد پوسٹ گریجویٹ اور 17 فیصد ڈاکٹریٹ کے طلبا مندرج ہیں۔ بعض یونیورسٹیوں میں الحاق شدہ کالجوں کی تعداد 1000 تک پہنچ چکی ہے۔ الحاق شدہ کالجوں کی اتنی بڑی تعداد کا نظم ونسق اور کوالٹی کنٹرول ایک چیلنج ہے۔ کچھ کالجوں کو چھوڑ کر اکثریت میں معیار کا فقدان ہے۔ اس طرح ریاستی یونیورسٹیاں اپنی مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی فراہمی میں ایک اہم کردار نبھاتی ہیں۔ یہ تمام یونیورسٹیاں اپنی متعلقہ ریاستی حکومتوں کے ذریعے مالی امداد حاصل کرتی ہیں۔ یونیورسٹیوں کی مالی امداد کی رقم مختلف ریاستوں میں مختلف نوع کی ہیں۔ لیکن صحیح صورت حال یہ ہے کہ گزشتہ 20 برسوں سے ریاستی یونیورسٹیوں کی مالی امداد میں خاصی کمی آئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کالجوں سے حاصل شدہ فیس اور حکومت کی مالی امداد سے ریاستی یونیورسٹیاں تدریسی عملے اور غیر تدریسی عملے کی تنخواہیں دینے کے علاوہ نیا کچھ نہیں کر پاتیں۔ اکثر یونیورسٹیوں میں تدریس اور اکتساب کے لیے درکار لازمی ڈھانچے دستیاب نہیں ہیں۔ ان اداروں میں استعداد رہتے ہوئے بھی تحقیق کی طرف کوئی مائل نہیں ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر طلبا کالجوں کی بجائے یونیورسٹیوں میں داخلے لینا پسند کرتے ہیں۔ ریاستی یونیورسٹیوں کا زیادہ تر وقت ان سے منسلک کالجوں میں داخلے اور امتحانات کا نظم ونسق سنبھالنے میں ہی ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف نج کاری کے سبب ثانوی تعلیم کے فروغ میں ریاستی حکومتوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پرائیوٹ سیکٹر کی طرف سے نت نئے کالجوں کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ نجی شعبے اعلیٰ تعلیم کے میدان میں بڑی تیزی سے اپنا جال بچھا رہے ہیں۔ آج ثانوی سطح کے تقریباً 59 فیصد طلبا انھیں اداروں میں مندرج ہیں۔ فی الحال پرائیوٹ یونیورسٹیوں کا قیام بڑی تیزی سے عمل میں آ رہا ہے اور ہر سال اس میں تقریباً 40 فیصد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کو درپیش مسائل کو چار زمروں میں رکھا جاسکتا ہے۔ (1) تدریس اور اکتساب کا کمزور معیار، (2) فراہمی اور طلب میں خلا، (3) ناہموار ترقی اور مواقع تک رسائی، (4) تحقیق اور جدت طرازی کی کمی۔ صحیح معنوں میں ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کو درپیش سب سے بڑا چیلنج اساتذہ کی شدید کمی ہے۔ مختلف رپورٹوں کے سامنے آنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ 30-40 فیصد اساتذہ کے عہدے خالی پڑے ہیں۔ زیادہ تر اساتذہ کو موجودہ تعلیمی چیلنجز کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی ٹریننگ نہیں دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ تدریس اور اکتساب سے جڑے ہوئے دوسرے مسائل اس طرح ہیں:

☆ فرسودہ اور غیر لچک دار نصاب اور کورس کے مواد اور مہارت کی ترقی میں Employer کی غیر موجودگی، نیز بین الکلیاتی تعلیم کے لیے بہت کم مواقع

☆ ہماری تدریسیات اور اندازۂ قدر (Assessment) کا انحصار کم و بیش رٹ کر یاد کرنے (Rote Learning) اور Input کی بنیاد پر ہونا، طلبا کو تنقیدی سوچ کے لیے راغب نہ کرنا، 'تجرباتی استدلال' مسئلہ کو حل کرنے اور باہمی تعاون کے ساتھ کام کرنے نیز ایک وسیع تناظر و بین الکلیاتی مہارتوں (Transversal Skills) کے مواقع حاصل نہ ہونا۔

☆ طلبا اور اساتذہ کا تناسب میں کافی فرق ہونا۔ دراصل تدریسی عملے کی کمی اور زیادہ سے زیادہ طلبا کے داخلے کا دباؤ سے طلبا و اساتذہ کا تناسب بگڑ جاتا ہے۔

☆ تحقیق و تدریس کی علیحدگی: طلبا کو ابتدائی مرحلے کی تحقیق تجربے کی کمی۔

☆ ایک غیر موثر کوالٹی اشورینس (معیار کی ضمانت) کا نظام، اور ریاستی و مرکزی اداروں، طلبا اور دیگر Stakeholders کی طرف سے احتساب کا مکمل فقدان۔

ان ہی اسباب کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے جنوبی ایشیا میں Low Employability گریجویٹس کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔ دوسری طرف ہمارے ملک میں گریجویشن کے بعد اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے لیے ناکافی سہولیات اور لازمی بنیادی ڈھانچا کا نہ ہونا۔

(بحوالہ High University enrolment, low graduate employment', British Council with the Economist Intelligence Unit 2014)

ہندوستان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں بشمول مایہ ناز اعلیٰ تعلیمی اداروں بالخصوص الحاق شدہ کالجوں اور سرکاری یونیورسٹیوں میں یہ مسئلہ ایک عام سی بات ہے۔ گذشتہ دہائی میں 7 فیصد سے زائد اوسط اضافے کی شرح کے باوجود ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا مجموعی داخلہ تناسب (GER) بہت کم ہے۔ بعض اندازوں کے مطابق ہندوستان 2020 تک اعلیٰ تعلیم میں 30 فیصد تک مجموعی

داخلے کے ہدف اگر حاصل بھی کر لیتا ہے تو اس صورت میں ہماری یونیورسٹیوں کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہوگی کہ ثانوی تعلیم سے مزین ان تمام طلبا کو داخلہ دے سکیں۔ اس پس منظر میں فاصلاتی نظام تعلیم کی اہمیت و افادیت بڑھ جاتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی اس اضافی مانگ کو پورا کرنے کا یہ واحد طریقہ ہوگا جس کے ذریعے ہم مختلف پروگراموں کی شروعات یونیورسٹیوں میں کر سکتے ہیں۔ ثانوی درجے تک تعلیم یافتہ طلبا کی اتنی بڑی تعداد کے لیے یونیورسٹیوں میں داخلہ کو یقینی بنانا ایک دشوار کن عمل ہوگا۔ ادھر یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مانگ کے مطابق مختلف النوع پروگراموں کی کمی کے سبب انجینئرنگ، ٹیکنیکل اور ایم بی اے گریجویٹس کی طلب میں خاصی کمی آئی ہے۔

ملک کے تمام خطوں اور ریاستوں میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کا نیٹ ورک ہونے کے باوجود ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے درمیان بالخصوص شہری اور دیہی علاقوں کے اداروں میں بڑا فرق ہے۔ یہ فرق کثیر الجہت عدم مساوات کے سبب ملک کے مختلف علاقوں، بالخصوص دیہی و شہری آبادی، امیر و غریب اقلیت اور اکثریت، مردوں اور عورتوں کے درمیان اندراج کی شرح میں اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال میں شمولیتی ترقی کو ہندوستانی تعلیمی اصطلاحات میں ترجیح دینی ہوگی۔ متوسط طبقے میں غیر معمولی ترقی کے ساتھ ہمارے طلبا کے پروفائل میں بھی نمایاں تبدیلی آئے گی جس کے لیے ہماری یونیورسٹیوں کو تیار رہنا ہوگا۔

ہندوستان میں اعلیٰ معیار کے محققوں کی خاصی کمی ہے۔ پی ایچ ڈی اور تحقیقی خطوط پر کام کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چین کی 30,000 اور امریکہ کی 25,000 پی ایچ ڈی اسناد کے مقابلے ہندوستان میں صرف 4500 پی ایچ ڈی اسناد سائنس و انجینئرنگ کے شعبوں میں ہر سال دی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں تدریس و تحقیق کا شعبہ منظم طور پر علیحدہ علیحدہ ہے۔ ہمارے یہاں ان تعلیمی اداروں کی واضح اکثریت دکھائی پڑتی ہے، جہاں طلبا کو تحقیقی تجربات سے مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ نتیجتاً مستقبل میں وہ اپنے آپ کو تحقیق کی طرف راغب نہیں کر پاتے۔

(بحوالہ: The Future of Higher Education and Opportunities for International Cooperation: British Council)

یہ وہ تمام دشواریاں و رکاوٹیں ہیں جن کے سبب ہمارے اعلیٰ تعلیمی ادارے عالمی رینکنگ میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں۔ یہاں ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا چیلنجز کے حل کے لیے 12 واں پنج سالہ منصوبے کا لائحہ عمل بنایا گیا اور بہت حد تک اس پر عمل آوری بھی ہوئی۔ یعنی ہمیں بہتر کارکردگی حاصل کرنے کے لیے ان تھک کوشش کرنی ہوگی تاکہ ہر شعبے میں امتیازی مقام حاصل کر سکیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنے تدریس و آموزش کے معیار کو بلند کرنا ہوگا۔ نیز آموزش کے نتائج (Learning outcomes) پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ تدریس کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے فیکلٹی کی ترقی نیز تدریس و اکتساب میں ہو رہے نئے تجربات و رجحانات سے اساتذہ کی واقفیت و شمولیت لازمی ہے۔ تحقیق و تعلیم کے درمیان جو فرق ہے اس کو ختم کرنا ہوگا اور اسے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کرنا ہوگا بلکہ انھیں ایک دوسرے کے لیے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ تحقیق و تعلیم کے معیار کی بہتری کے لیے بین الاقوامی اشتراک کے رجحان کو فروغ دینا ہوگا۔ تحقیق میں جدت و ندرت کے لیے صنعت اور تحقیقی اداروں کے درمیان بہتر روابط و شمولیت لازمی ہوگی۔ نیز تمام تحقیقی و تعلیمی اداروں کے نیٹ ورک کو ایک Consortium کے ذریعے جوڑنا ہوگا۔

ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم مجموعی طور پر بہت اعلیٰ معیار کی نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے معیار کو بلند کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں کا معیار اداروں کے ذاتی وسائل مثلاً انسٹی ٹیوٹ کے آخری صفحے پر درج کی ہوئی تفصیلات، فیکلٹی کی تعلیمی ڈگریاں، لائبریری میں کتابوں اور رسالوں کا ذخیرہ، ایک انتہائی جدید (Ultra-modern) کیمپس میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔

بہتر تو یہ ہوگا کہ تعلیم عامہ کے بجٹ کو بڑھایا جائے۔ کم از کم دوسرے ہم پلہ ممالک انڈونیشیا، سری لنکا کے قومی تعلیمی بجٹ کے مساوی کیا جائے۔ تاکہ ملک کے طول و عرض میں اعلیٰ تعلیم کے لیے تمام جدید سہولیات سے مزین نئے ادارے کھولے جا سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ موجودہ تعلیمی اداروں کی صلاحیت پیمائی (Scaling Capacity) کی جائے۔ انجینئرنگ اور دوسرے ٹیکنیکل کالجوں کے قیام کی جو ایک دوڑ لگی ہے اس پر روک لگائی جائے اور ان ہی کالجوں کے قیام کی اجازت دی جائے جو معیار پر کھرے اترتے ہوں۔ لچک دار اور ہنر سکھانے والے (Skill based Learning) کورسز فراہم کرنے والے اداروں کو مالی تعاون دیا جائے۔ نیز ان اداروں کی طرف لوگوں کو راغب کیا جائے جو ہماری معیشت کی ضروریات کے مطابق کورسوں کا انعقاد کر رہے ہوں تاکہ نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ صحیح معنوں میں ہندوستان کے اعلیٰ تعلیمی نظام کو بین الاقوامی معیار کا بنانے کے لیے کئی سطحوں پر کام کرنے کی ضرورت ہوگی۔

مختصر یہ کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم مجموعی طور پر بہت اعلیٰ معیار کی نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے معیار کو بلند کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں کا معیار اداروں کے ذاتی وسائل مثلاً انسٹی ٹیوٹ کے آخری صفحے پر درج کی ہوئی تفصیلات، فیکلٹی کی تعلیمی ڈگریاں، لائبریری میں کتابوں اور رسالوں کا ذخیرہ، ایک انتہائی جدید (Ultra-modern) کیمپس میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی کمیٹیوں اور ماہرین تعلیم نے ہمارے تعلیمی نظام کو درپیش مسائل مثلاً تعلیم یافتہ عوام کی بے روزگاری میں اضافہ، طلبا کی عدم حوصلہ افزائی، کیمپس میں بڑھتی ہوئی بدامنی و نظم و ضبط کی کمی، انتظامیہ کے بار بار بدلنے سے درپیش رکاوٹیں، معیار کی کمی وغیرہ کی طرف نشاندہی کی ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اس کی معنویت (Relevance) پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست داں اور پالیسی ساز ہمارے تعلیمی نظام میں مکمل تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہاں! آزادی کے طویل سفر کے بعد ہندوستان ایک مضبوط قوم و ملک کی شکل میں ابھر رہا ہے لیکن اپنے آپ کو مکمل طور پر ترقی یافتہ ملک کی صف میں کھڑا کرنے اور ایک مضبوط ہندوستان کی تعمیر کے لیے ہمیں تعلیمی نظام پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ اس مقام و حیثیت کے حصول کے لیے سب سے بڑی طاقت ہمارے انسانی وسائل ہیں؛ جنھیں معیاری تعلیم مہیا کر کے ان کا بہتر سے بہتر استعمال کرنا ہوگا۔ تعلیم ہی قوم کی بقا کا واحد ذریعہ ہے۔

■

Dr. Mohammad Ahsan
Regional Director, Regional Centre, Maulana Azad National Urdu University
12 Ahemdabad Palace Road
Koh-e-fiza, Bhopal- 462001
Email: ahsanmohd1@yahoo.co.in

مشتاق احمد

نصابِ تعلیم میں انسانی اقدار کی تلاش!

عہد حاضر میں عالمی برادری کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا انسانی سماج مختلف اقسام کے تشدد کا شکار ہے اور اس تشدد کی آگ نے یقیناً ہمارے سماج کی صالح و تعمیری اقدار کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا ہے اور اس کے اسباب پر جب ہم سنجیدگی سے غور و فکر کرتے ہیں تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ عصر حاضر میں بچوں کی تعلیم کے لیے جو نصاب مرتب کیا گیا ہے اس میں تحفظ انسانیت، اخلاقیات، سماجی مساوات، انصاف پسندی، اجتماعی شعور اور اسلاف کے کردار و عمل کے اسباق کا فقدان ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ طلبا کو صرف انفرادی زندگی جینے اور ان کو اپنی منزل تک پہنچانے کا راستہ دکھاتی ہے۔ ہمارا نصاب بچوں کو یہ سبق نہیں سکھاتا کہ ان کے اوپر ملک و قوم کی بھی کچھ ذمے داریاں ہیں، بالخصوص ہندوستان جیسے جمہوری نظام والے ملک میں اگر طلبا کے کردار و افکار میں تضاد رہتا ہے تو وہ کبھی بھی اجتماعی شعور کے مالک نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہماری نئی نسل سماج اور ملک کی بات تو دور وہ اپنے خاندان بلکہ اپنے والدین کے تئیں بھی حساس نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج نہ صرف مغرب بلکہ مشرقی ممالک میں بھی اولڈ ایج ہوم کا تصور فروغ پا رہا ہے۔ ہندوستان جہاں کبھی 'شروَن' پیدا ہوتا تھا، یہاں بھی اپنے ماں باپ کو اولڈ ایج ہوم پہنچانے والوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچ گئی ہے۔

واضح ہو کہ بچوں کی معاشرت کا آغاز خاندان کے اندر ہوتا ہے پھر سماجی روابط کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ بچوں کو سماجی یا انسانی رشتوں کا درس اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور اساتذہ سے ملتا ہے۔ اس بات پر تمام ماہرین تعلیم اور ماہرین علم نفسیات اتفاق رکھتے ہیں کہ بچوں کی نشو و نما میں اس کی بنیادی تعلیم کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ بنیادی تعلیم اس کے ذہن کو زرخیزی عطا کرتی ہے اور ثانوی تعلیم اس کے شعور کو پختگی بخشتی ہے، جبکہ کالج کی تعلیم اس کے اندر غور و فکر کرنے کی قوت عطا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلیم کے ان مراحل میں نصاب کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے کہ بچے اپنے نصاب کے سہارے ہی درجہ بہ درجہ سفر طے کرتے ہیں۔ ہم اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ انسان کے شعوری فروغ کا محور و مرکز تعلیم ہے، ایسی صورت میں اگر تعلیم کے اندر ہی انسانی ہمدردی اور سماجی شعور کے درس کا فقدان ہوگا تو آخر بچوں کے اندر کس طرح تعمیری فکر و نظر پیدا ہوگی۔ ایک عظیم فلسفی اور ماہر تعلیم سر ہینری واٹسن (1556-1639) نے بچوں کی تعلیم کے لیے خاکہ نصاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی کارآمد بات کہی تھی کہ تعلیم کا مطلب ہے کہ طلبا کے اندر چھ خوبیاں پیدا کی جائیں۔ (1) بچوں کو اپنا مذہب اور اپنی تہذیب سکھائی جائے، (2) اس کے اندر تجسس پیدا کیا جائے، (3) اس کے کردار کو مثالی بنایا جائے، (4) اس کے اندر انسانیت کا جذبہ پیدا کیا جائے، (5) اس کے اندر قوت فیصلہ پیدا کی جائے اور (6) اس کو اخلاقیات کا سبق پڑھایا جائے۔ واضح ہو کہ واٹسن نے یہ بات 1626 میں کہی تھی اور اس وقت کے تعلیمی نصاب میں مذکورہ اسباق کو شامل کرنے کی انھوں نے وکالت کی تھی۔ اگر ہم ان اسباق پر غور و فکر کریں تو یہ عقدہ با آسانی اجاگر ہوتا ہے کہ واٹسن نے تعلیمی نصاب میں جن اجزا کی شمولیت کو لازمی قرار دیا ہے ان میں مذہب اور اخلاقیات بھی شامل ہیں، لیکن افسوس ہے کہ عصر حاضر میں ہم نے اپنے تعلیمی نصاب کو مذہب اور اخلاقیات کے اسباق سے کوسوں دور رکھا ہے۔ نتیجہ ہے کہ ہماری تعلیم حروف شناسی اور ڈگریوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں تشدد کے واقعات میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے، انسان دوستی کا چراغ بجھتا جا رہا ہے اور تحفظ انسانیت کا شعور ختم ہوتا جا رہا ہے۔ غرض کہ موجودہ تعلیم کی روشنی سے ایوان انسانیت میں روشنی کی بجائے تاریکی پھیلتی جا رہی ہے۔ اسی طرح شوپنہار نے بھی اپنی کتاب 'پریگا' (Parerga) میں اپنے فلسفہ تخلیق، نظریہ حیات انسانی اور جہد البقا پر روشنی

ڈالتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ ''انسان کی زندگی اسی وقت صحت منداور صالح عقل سلیم کی آئینہ دار بن سکتی ہے جب بچپن میں اس کی آبیاری صحت مند قدروں سے کی جائے۔'' بلا شبہ جب تک تعلیم کے ذریعے صالح انسان نہیں پیدا کیے جائیں گے اس وقت تک انسانی معاشرہ تحفظ انسانیت کا گہوارہ نہیں بن سکتا۔ آج باہری دنیا کی بات تو چھوڑیے اب اسکول اور کالج کے احاطے بلکہ کلاس روم میں بھی غیر انسانی فعل کے واقعات رونما ہونے لگے ہیں۔ چند سال قبل امریکہ کے ایک اسکول میں ایک طالب علم نے اپنے دس ساتھیوں کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا جبکہ ہندوستان میں چنئی کے ایک اسکولی طالب علم نے اپنی استانی کو ہی محض اس لیے گولی ماردی کہ اس نے سبق یاد نہیں کرنے پر اس کو کلاس میں کھڑا کردیا تھا۔ یہ لمحہ فکریہ ہے۔ کاش ہم نے بہت پہلے اردو کے ایک دانشور شاعر اکبرالہ آبادی کے اس شعر کی روشنی میں اپنے اسکول وکالج کے نصاب کو ترتیب دیا ہوتا تو شاید کم از کم ہمارے ملک ہندوستان کی اسکولی تعلیم کے نصاب میں انسانی اقدار کے اسباق کا فقدان نظر نہیں آتا۔ اکبرالہ آبادی نے نصابوں میں انسانی اقدار اور اخلاقیات کے اسباق نہ ہونے پر اپنی ناراضگی اور فکرمندی کا اظہار یوں کیا تھا۔

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اور اکبرالہ آبادی نے انسان کی زندگی میں علم کی کیا اہمیت ہے اس پر بھی روشنی ڈالی تھی۔

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے ناتمام
بے علم وہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے کہ بن کر رہے غلام

واضح ہو کہ انسان دو ذرائع سے علم حاصل کرتا ہے، ایک علم بالوحی ہے یعنی مذہبی کتابوں کے ذریعے علم حاصل کرنا، دوسرا علم بالسعی یعنی انسان اپنے معاشرے اور اسلاف کے کردار وعمل کے مشاہدات وتجربات سے حاصل کرتا ہے۔ ہم مذہبی کتابوں میں تو کوئی تبدیلی نہیں کرسکتے جبکہ علم بالسعی میں تغیر زمانہ کے مدنظر تبدیلی لاسکتے ہیں۔ تمام مذاہب میں تعلیم کو انسانی زندگی کی بقا کا ضامن بتایا گیا ہے۔ مذہب اسلام میں قرآن وسنت کی تعلیم کو فرض قرار دیا گیا ہے اور قرآن وسنت کا علم انسان کو نہ صرف اس کے مقصد حیات سے واقف کراتا ہے بلکہ اسے انسانی حقوق وفرائض سے بھی آشنا کراتا ہے۔ سناتن دھرم یعنی ہندو مذہب تعلیم کا مفہوم کائنات کو سمجھنے اور انسان بننے کی تلقین کرتا ہے۔ عیسائی، سکھ، بودھ اور جین مذہب کی کتابوں میں تعلیم کا مفہوم ایک مکمل انسان کی تعمیر وتشکیل بتائی گئی ہے۔ انگریزی لفظ 'ایجوکیشن' (Educastion) جو لاطینی لفظ Educere سے مشتق ہے کے معنی بچوں کی ہمہ جہت پرورش ہے۔

تعلیمی نصاب کی تاریخ تقریباً تین سو سالہ سفر طے کرچکی ہے اور اس راہ منزل کے سنگ میل کومینس، پستالوزی، روسو، ہربارٹ، واٹسن، مارگریٹ مالیان، فریڈریک فروبیل، ماریا مانٹیسری، سرسید، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، سرپلی رادھا کرشنن، رابندر ناتھ ٹیگور، مسز اینی بیسنٹ اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ماہرین تعلیم نے خاکہ نصاب کی اہمیت وافادیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور بالخصوص بنیادی تعلیم کے نصاب کو اخلاقی تعلیم سے آراستہ وپیراستہ کرنے کی وکالت کی ہے۔ بچوں کے لیے بنیادی تعلیم کے طریقہ کار کے موجد فریڈریک

ہم مذہبی کتابوں میں تو کوئی تبدیلی نہیں کرسکتے جبکہ علم بالسعی میں تغیر زمانہ کے مدنظر تبدیلی لاسکتے ہیں. تمام مذاہب میں تعلیم کو انسانی زندگی کی بقا کا ضامن بتایا گیا ہے .مذہب اسلام میں قرآن وسنت کی تعلیم کو فرض قرار دیا گیا ہے اور قرآن وسنت کا علم انسان کو نہ صرف اس کے مقصد حیات سے واقف کراتا ہے بلکہ اسے انسانی حقوق وفرائض سے بھی آشنا کراتا ہے.

فروبیل جس نے جرمنی میں K.G یعنی کنڈرگارٹن اسکول کی بنیاد رکھی تھی، اس نے بچوں کی ذہنی نشو ونما میں اخلاقی اسباق اور کھیل وثقافت کو لازمی جز وقرار دیا تھا۔ اسی طرح نرسری اسکول کے موجد مارگیریٹ ملیان نے بچوں کے اندر سماجی شعور پیدا کرنے کی وکالت کی ہے اور مانٹیسری اسکول کی موجد ماریا مانٹیسری جس نے 1907 میں اٹلی میں ایک مانٹیسری اسکول قائم کیا تھا، اس نے بھی بچوں کے لیے طریقہ تعلیم ترتیب دیتے وقت بچوں کی متوازن نشو ونما اور ان میں خود انضباطی صفت پیدا کرنے اور ان کے حواس خمسہ کی صحیح تربیت کے اسباق کی شمولیت کو لازمی بتایا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں جب پہلا کانونٹ اسکول لوریٹا کانونٹ 1874 میں قائم ہوا تو اس کے نصاب میں بھی اخلاقی اسباق کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ بعدہ رابندر ناتھ ٹیگور اور مسز اینی بیسنٹ نے بھی مشترکہ طور پر اسکولی نصاب ترتیب دیا اور پرائمری تعلیم کے خطوط واضح کیے۔ مہاتما گاندھی نے 1937 میں جو اپنا تعلیمی تصور پیش کیا اس میں بھی اخلاقی تعلیم کی وکالت کی اور جب ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں ایک تعلیمی کمیٹی تشکیل دی گئی تو اس کی رپورٹ میں بھی جو بنیادی تعلیم سے متعلق سفارشیں کی گئی تھیں ان میں بھی دستکاری، جسمانی اور اخلاقی اسباق کو شامل کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ اس کے بعد بھی پرائمری تعلیم کے لیے کھیر کمیٹی (1939)، سارجنٹ رپورٹ (1944)، سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن (1953)، کوٹھاری کمیشن (1966) اور نئی تعلیمی پالیسی (1986) میں بھی بنیادی تعلیم کے نصاب میں انسانی اقدار اور سماجی ومذہبی اخلاقیات کی تعلیم پر زور دینے کی تلقین کی گئی تھی اور ان تمام سفارشات کا مقصد صرف یہ تھا کہ تعلیم کے ذریعے ایک صالح فرد پیدا کیا جائے تاکہ اس کی تعمیری فکر ونظر کی بدولت ایک مثالی معاشرہ تشکیل پا سکے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے 20 اکتوبر 1962 کو یونیورسٹی آف جموں وکشمیر کے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''تعلیم کا مقصد نمو پذیر ذہن اور تمدنی اشیا کے درمیان، جن میں روز مرہ استعمال کی چیزیں، سماجی جماعتیں، جمالیات، ادبی اور تکنیکی کامیابیاں، فلسفہ اور مذہب جیسی چیزیں جو ماحول میں تشکیل پاتے ہوئے ذہن کی تجسیم ہوتی ہیں، شامل ہیں۔ تعلیم نئی نسلوں اور پچھیوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے۔ اپنی کامرانیوں میں زندہ رہنے والے لوگوں اور ان لوگوں کے درمیان رابطہ ہے جن کے لیے کامرانیاں تفہیم کا ایک ذریعہ ہے۔ تعلیم مزید تخلیق کے لیے ایک مہمیز ہے، تکمیل اور خود افروزی کی رہنما ہے۔''

(اعلیٰ تعلیم۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، مترجم مسعود الحق، ص 132-131)

پروفیسر ہچنگ (Hutchings) جس نے امریکہ کے تعلیمی نظام میں ایک بڑا انقلاب پیدا کیا، نے اپنی مشہور زمانہ کتاب 'یونیورسٹی آف یوٹوپیا' میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ کسی بھی ملک وقوم کی تقدیر تعلیم کے ذریعے ہی بدلی جاسکتی ہے، لیکن تعلیم اسی وقت بامقصد اور انسانی برادری کے لیے فلاح وبہبود کی ضامن بن سکتی ہے جب اس کا تعلیمی نصاب صحتمند فکر ونظر کا درس دیتا ہو۔ اسی طرح ڈاکٹر المہرسٹ (Elmhirst) کا خیال ہے کہ علم بے کار ہے اگر وہ پراسرار جتھے یا گروہ کے نجی فیصلے میں رہتا ہے۔ علم میں نجات دلانے والی توانائی اور زندگی بخشنے والی قوت صرف اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ سماجی

زندگی اور انسانی شعور کے اسباق سے لبریز ہوتی ہے۔

بلاشبہ تعلیم کا ایک واضح اخلاقی تصور ہے جو انسان کے اندر حقیقی سماجی شعور کو بیدار کرنے کا وسیلہ بنتا ہے اور انسانی معاشرے کو حساس بناتا ہے اور یہی اجتماعی شعور ایک فرد کو انسانی معاشرے کے تحفظ کا علمبردار بناتا ہے لیکن یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب ہم بنیادی تعلیم سے ہی اپنے بچوں کے اندر انسانی اقدار اور سماجی شعور کا چراغ روشن کریں گے۔ اس کے لیے طریقہ تعلیم یعنی نصابی خاکہ کو مفید بخش نظریے کا حامل بنانا ہوگا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی یہ بات حرف بہ حرف صداقت پر مبنی ہے کہ ''اگر تعلیم کا مقصد واقعی تعلیم دینا یعنی ذہن کی مکمل نشو ونما میں مدد کرنا ہے اور ہماری قومی زندگی کو درپیش کارکردگی اور اخلاقی دیانت داری کے دو بڑے بحرانوں کے تدارک میں معاون ہونا ہے اور یہ مدد صرف تعلیم ہی کر سکتی ہے تو ہمارے تعلیمی اداروں کو اسکول سے یونیورسٹی تک سب کو فعال ذہنی کاموں کے مراکز، مشترکہ تجربات اور مشترکہ اقدار کی برادریاں بننا ہوگا۔ یہ سمجھانے کی غالباً ضرورت نہیں ہے کہ اسکول اور یونیورسٹی دونوں کے کاموں کے حدود، ان کی نوعیت اور ان کی اہمیت الگ الگ ہوگی۔ انھیں اپنے آپ کو مجہول تاثر پذیری کی بجائے خود رو فعالیت کے مراکز بنانے ہوں گے۔ معلومات کے محض حصول کے بجائے معلومات کے استعمال، انفرادی مسابقتی ولولوں کی بجائے خدمت کے سماجی تعاون کے جذبے کے مراکز میں تبدیل کرنا ہوگا، ذہنی یک سمتی کی جگہ پر عملی انسانی ہمہ جہتی کو اپنانا ہوگا۔'' (خطبہ جلسہ تقسیم اسناد، انکل یونیورسٹی کٹک، 6 دسمبر 1959، مشمولہ کتاب اعلیٰ تعلیم، ص 55-56)

جب 1986 میں نئی تعلیمی پالیسی تیار کی جا رہی تھی تو اس میں بھی موجودہ تعلیمی نصاب بالخصوص اسکولی نصاب میں بڑی تبدیلی کی وکالت کی گئی تھی اور مجوزہ تعلیمی پالیسی کے تحت بنیادی اسکول کے نصاب میں Ten core elements کو شامل کرنے کی تلقین کی گئی تھی اور تمام ریاستوں کی حکومتوں کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ اسکولی نصاب میں ان دس بنیادی اجزا کو خصوصی اہمیت دی جائے۔ یہاں ان دس بنیادی اجزا کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو مندرجہ ذیل ہیں، (1) ہندوستان کا مشترکہ ثقافتی ورثہ، (2) ہماری آئینی اور دستوری ذمے داریاں، (3) قومی تشخص و وقار کے لیے اقدام، (4) ہندوستان کا مشترکہ تہذیبی ورثہ، (5) مساوات، مذہبی رواداری اور جمہوری اقدار کی پاسداریاں، (6) مساوات مرد و زن، (7) تحفظ ماحولیات، (8) سماجی برائیوں اور رسومات کا خاتمہ، (9) چھوٹے خاندان کی اہمیت اور (10) سائنسی رجحان کا فروغ۔

مذکورہ نصابی اجزا پر غور و فکر کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مجوزہ تعلیمی پالیسی بنانے والوں کو بھی درپیش یہی مسئلہ تھا کہ ملک کا موجودہ تعلیمی نصاب ناقص ہے اور اس میں ایک بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے مگر افسوس صد افسوس کہ اس نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے بعد بھی جو تعلیمی نصاب مرتب کیے گئے اس میں مذکورہ اجزا کی صد فیصد شمولیت نہیں ہوئی۔ دراصل آزادی کے بعد سے اب تک تعلیمی شعبے میں تجربے ہی تجربے ہو رہے ہیں۔ آزادی سے قبل میکالے کی تعلیمی پالیسی جس کا مقصد صرف اور صرف انگریزی حکومت کے لیے دفتری کلرک پیدا کرنا تھا اس نے ہم ہندوستانیوں کو تعلیم کے اصل مطالب و مقاصد سے کوسوں دور کر دیا۔ آزادی کے بعد جمہوری نظام ہونے کی وجہ سے حکومت کا بدلنا تو فطری عمل ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہم اچھی بری تمام چیزوں کو بدلنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت بدلنے کے ساتھ ساتھ پالیسیاں نہیں بدلنی چاہیے، بلکہ میرا مدعا صرف یہ ہے کہ جو پالیسی ملک و قوم کے مفاد میں ہو اس پر سیاست نہیں ہونی چاہیے۔ یورپ کا ایک عظیم ماہر تعلیم رابرٹ موراں جس نے 1904 سے 1926 تک صرف اسکولی تعلیم پر تحقیق کی تھی، اس نے بھی یہ کہا تھا کہ ہندوستان میں جو تعلیم گروکل اور مدارس میں دی جاتی تھی وہ ایک انسان کو مکمل طور پر انسان بناتی تھی اور آج کی تعلیم انھیں حرف شناس بنا رہی ہے۔ غرض کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے اسکولی نصابوں میں اخلاقی قدروں کی تعلیم پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ اسکول انتظامیہ اور معلم اپنے طالب علموں کو ملک کی تہذیبی وراثت، عظیم رہنماؤں کے کردار و عمل، صوفیوں اور سنتوں کے پیغامات کے علاوہ مذہبی اسباق سے روشناس کرائیں۔ طالب علموں کو صرف اسکولی احاطے تک ہی مہذب رہنے کا سبق نہ سکھایا جائے بلکہ ان کے اندر قومی اور سماجی فرائض بالخصوص احساس تحفظ انسانیت پیدا کیا جائے۔ اگر اسکولی احاطے میں طلبا کو نسل پرستی، تشدد، عدم رواداری اور تعصبات و منافرت سے پرہیز کرنے کی تعلیم دی جائے تو ممکن ہے کہ ہمارے بچے منفی فکر کے دائرے سے باہر نکل کر تعمیری فکر و نظر کا علمبردار بن جائیں۔ ہندوستان کے ایک معروف سیاسی مفکر راج گوپالا چاری نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ''اگر ہندوستان کے تمام لوگ اپنے اپنے مذہبوں، سماجی فرائض اور انسانی قدروں پر ایمانداری سے عمل کرنے لگیں تو ملک سے قتل و غارت گری، بدامنی اور فرقہ پرستی کا خاتمہ خود ہی ہو جائے گا۔

> **ہندوستان کی سماجی زندگی میں مذہب کو روح کی حیثیت حاصل ہے اور کیوں کر نہ ہو کہ یہاں رام اور کرشن کا جنم ہوا ہے جنھوں نے انسانی برادری کو آپسی بھائی چارہ اور امن کی تعلیم دی، گوتم بدھ اور مہابیر پیدا ہوئے جنھوں نے سماج سے اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کو مٹا کر ایک مساواتی سماج کا تصور دیا. مذہب اسلام کے پیشواؤں اور صوفیوں نے پیغمبر حضرتؐ محمد کے پیغامات کو گھر گھر پہنچانے کا کام کیا اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے محبت سے پیش آنے کا ابدی سبق سکھایا. گرو نانک جی نے 'نہ تو مسلمان نہ تو ہندو' کہہ کر سارے انسان کو ایک دوسرے کا احترام کرنے کا سبق پڑھایا**

بلاشبہ ہندوستان کی سماجی زندگی میں مذہب کو روح کی حیثیت حاصل ہے اور کیوں کر نہ ہو کہ یہاں رام اور کرشن کا جنم ہوا ہے جنھوں نے انسانی برادری کو آپسی بھائی چارہ اور امن کی تعلیم دی، گوتم بدھ اور مہابیر پیدا ہوئے جنھوں نے سماج سے اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کو مٹا کر ایک مساواتی سماج کا تصور دیا۔ مذہب اسلام کے پیشواؤں اور صوفیوں نے پیغمبر حضرت محمد کے پیغامات کو گھر گھر پہنچانے کا کام کیا اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے محبت سے پیش آنے کا ابدی سبق سکھایا، گرو نانک جی نے 'نہ تو مسلمان نہ تو ہندو' کہہ کر سارے انسان کو ایک دوسرے کا احترام کرنے کا سبق پڑھایا۔ ایسے کثیر المذاہب، کثیر التہذیب و تمدن والے ملک میں اگر انسانیت دم توڑ رہی ہے اور ہمارا سماج تشدد کا شکار ہے تو اس مسئلے پر سر جوڑ کر نہ صرف بیٹھنے کی ضرورت ہے بلکہ ملک کے تعلیمی نصاب کو اسباق فلاح بہبود و بشر کے اجزا سے مزین کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ تعلیم کے ذریعے ہی ہم اپنی معاشرتی بیماریوں کو دور کر سکتے ہیں۔

■

Dr. Mushtaque Ahmad
Principle Marwari College
Darbhanga - 846003 (Bihar)

فضل حسنین

زبان زد اشعار میں تحریف

کتب و رسائل میں پروف کی غلطیاں تو کتابت کے زمانے میں بھی چھپ جایا کرتی تھیں لیکن جب سے کمپیوٹر کمپوزنگ کا چلن ہوا، غلطیاں زیادہ چھپنے لگی ہیں۔ نثر میں یہ اغلاط اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا کہ نظم یعنی شاعری میں کیونکہ کسی لفظ کے غلط چھپ جانے سے پورا مصرعہ کیا بلکہ شعر ہی غارت ہو جاتا ہے۔ اساتذہ کے اشعار جو ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکے ہیں، ان کے ساتھ کچھ زیادہ زیادتی ہو رہی ہے۔ شعر غلط چھپ گیا تو پھر اسی طرح دہرائے جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں کیونکہ عام قاری کی معلومات عموماً اتنی گہری نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ عروض سے واقف ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ شعر یا مصرعے کے معمولی سقم کو نظر انداز کر جاتا ہے لیکن طلبہ کو اس سے نقصان پہنچتا ہے اور وہی غلطی دہرائی جاتی رہتی ہے۔

اساتذہ کے بہت سے اشعار یا مصرعے جو ایک بار نادرست چھپ گئے تو پھر وہی چھپتے رہتے ہیں اور اصل شعر یا مصرعہ کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار کا ذکر کرتا ہوں۔

میر کا یہ شعر عموماً اسی طرح لکھا ہوا ملتا ہے۔

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

جب کہ میر نے اصل شعر یوں کہا تھا۔

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

میر کا بہت مشہور شعر عموماً یوں لکھا ہوا ملتا ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

جبکہ میر نے اصل شعر یوں کہا تھا۔

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میر کا ایک اور شعر اب عموماً یوں لکھا ہوا ملتا ہے۔

ابتدائے عشق میں روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

جبکہ میر نے اصل شعر یوں کہا تھا۔

راہِ دورِ عشق میں روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

داغ دہلوی کا یہ مصرعہ اب عموماً یوں ہی لکھا جانے لگا ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

جبکہ اصل مصرعہ کیا بلکہ شعر یوں ہے۔

خط ان کا بہت خوب، عبارت بہت اچھی
اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ

جہاندار شاہ جہاندار کا بہت مشہور شعر اب عموماً یوں لکھا ہوا ملتا ہے۔

آخر گل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

جبکہ اصل شعر یوں ہے۔

آخر گل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچے وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر ہو

لیکن سچ تو یہ ہے کہ کثرتِ استعمال سے اب نادرست مصرعہ یعنی۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ہی زیادہ اچھا معلوم ہونے لگا۔

مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اپنے حافظے سے مہتاب رائے تاباں کا شعر یوں درج کیا ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

جبکہ تاباں نے اصل شعر یوں لکھا تھا۔

شعلہ بھڑک اٹھا مرے اس دل کے داغ سے
آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

لیکن سچ تو یہ ہے کہ آزاد نے شعر جس طرح لکھ دیا اب اسی طرح زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

قائم چاندپوری کا مندرجہ ذیل شعر طرح طرح سے لکھا پایا جاتا ہے۔

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
دوچار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

قائم کے دیوان میں اصل شعر یوں درج ہے۔

قسمت تو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

لیکن سچ تو یہ ہے کہ کثرتِ استعمال سے اب مصرعہ

دوچار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

غالب کا یہ شعر کبھی کبھی یوں چھپا ہوامل جاتا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

جبکہ اصل مصرعۂ اولیٰ یوں ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

علامہ اقبال نے بھی اپنی ایک تحریر میں بے خیالی میں تیز رو کی بجائے 'راہ رو' لکھ دیا تھا یا پھر یہ پروف کی غلطی بھی ہوسکتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے خیالی میں سہو کسی سے بھی ہوسکتا ہے۔ شعر۔

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

بہادر شاہ ظفر سے منسوب ہوکر خوب مشہور ہوا جبکہ یہ شعر علامہ سیماب اکبرآبادی کا ہے اور یوں ہے۔

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

ذرہ حیدر آبادی نے اپنے مضمون 'شاعر کوئی اور ہے' (تحریک ادب) میں بعض دیگر اشعار کے بارے میں لکھنے کے بعد مشہور شعر۔

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

کے سلسلے میں لکھا ہے کہ بعض حضرات اسے علامہ اقبال سے منسوب کرتے ہیں جبکہ یہ شعر صادق حسین صادق کا ہے جو شکر گڈھ، سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کی ولادت یکم اکتوبر 1898 اور وفات 4 مئی 1989 شکر گڈھ سیالکوٹ ہے۔ دیکھیے 'برگِ سبز' صادق حسین صادق 1970۔

مشہور قطعہ

جدا رہیں تو جدائی سے آہ آہ کریں
جو ایک جا ہوں تو کمبخت زہر اگلنے لگیں
عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتے دار
الگ رہیں تو دھواں دیں ملیں تو جلنے لگیں

بعض لوگ اکبر الہ آبادی سے منسوب کرتے ہیں جبکہ راقم اسے نوح ناروی کا کلام سمجھتا تھا لیکن ابھی حال ہی میں سہ ماہی 'اسباق' میں داغ دہلوی کے شاگرد مولانا نظیر حسن سخا دہلوی پر شاہد احمد کا مضمون نظر سے گذرا جس میں انھوں نے اس قطعہ کو سخا دہلوی سے منسوب کیا ہے جو انتخاب کلیات سخا دہلوی میں درج ہے۔

ذرہ حیدرآبادی نے اپنے مضمون میں ایک اور دلچسپ انکشاف کیا ہے مشہور مغنیہ اقبال بانو کی گائی ہوئی ایک غزل 1970 کی دہائی میں بہت مشہور ہوئی اور اقبال بانو کی شہرت کی اصل وجہ بنی۔

داغ دل ہم کو یاد آنے لگے
لوگ اپنے دیے جلانے لگے
ایک پل میں وہاں سے ہم اٹھے
بیٹھنے میں جہاں زمانے لگے

یہ غزل باقی صدیقی کی ہے جو ریڈیو پاکستان میں ملازم تھے اور انھوں نے یہ غزل لکھ کر خود اقبال بانو کو گانے کے لیے دی تھی لیکن کیسٹ میں غزل داغ دہلوی سے منسوب کردی گئی اور انھیں کے کلام کے طور پر سارے عالم میں مشہور ہوئی۔

غزل گانے والوں سے متعلق بات نکلی ہے تو میں اپنا بھی ایک تجربہ بیان کردوں۔ ابھی حال ہی میں میرے ایک دوست کے ہاں ٹی وی پروگرام پیش کرنے والے عرفان صاحب آئے ہوئے تھے۔ میرے دوست نے موصوف سے تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا کہ آپ ان کا ایک مسئلہ حل کردیجیے۔ میں نے کہا بتایئے! تو عرفان صاحب نے حبیب ولی محمد کی آواز میں بہادر شاہ ظفر کی اس غزل کا ٹیپ آن کردیا۔

شمشیر برہنہ، مانگ غضب، بالوں کی مہک پھر ویسی ہے
جوڑے کی گندھاوٹ بہرِ خدا، زلفوں کی لٹک پھر ویسی ہے
ہر بات میں اس کی گرمی ہے ہر ناز میں اس کے شوخی ہے
قامت ہے قیامت چال بھری، چلنے میں پھڑک پھر ویسی ہے

پھر انھوں نے ٹیپ بند کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا، 'پھر ویسی ہے' یعنی کیسی ہے؟'' سوال سن کر میں بھی چکرا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بھاگ کر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے گھر گیا۔ لائبریری سے بہادر شاہ ظفر کا کلیات نکال کر دیکھا (دیوان ظفر جلد اول ص 312، مطبع منشی نول کشور (مئی 1872) تو غزل اس طرح درج ملی۔

شمشیر برہنہ، مانگ غضب، بالوں کی مہک پھیر ویسی ہے
جوڑی کی گندہاوٹ قہر خدا بالوں کی مہک پھیر ویسی ہے
ہر بات میں اوسکے گرمی ہے ہر ناز میں اوسکی شوخی ہے
قامت ہی قیامت چال ہے پر چلنی میں پھڑک پھیر ویسی ہے

اب مجھے خیال آیا کہ مطلع کے دونوں مصرعوں میں 'بالوں کی مہک پھر ویسی ہے' تو نہ ہونا چاہیے۔ غالبًا یہ سہو کتابت ہے۔ چنانچہ میں نے 'نوائے ظفر' (مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، فروری 1958 ص 107) دیکھی تو یہ اشعار یوں درج ملے۔

شمشیر برہنہ، مانگ غضب، آنکھوں کی چمک پھر ویسی ہے
جوڑے کی گندھاوٹ قہر خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہے
ہر بات میں اس کی ہے گرمی، ہر ناز میں اس کے ہے شوخی
قامت ہے قیامت چال پری، چلنے میں پھڑک پھر ویسی ہے

لیکن 'پھر ویسی ہے' والا مسئلہ پھر بھی حل نہ ہوسکا تو میں نے فاروقی صاحب سے رجوع کیا، جیسا کہ وقت پڑنے پر کیا کرتا ہوں۔ فاروقی صاحب نے بتایا کہ جس زمانے میں دیوان پہلی بار چھپا تھا اس زمانے (1882) میں ی اور ے کے املا میں فرق نہ تھا۔ یعنی ی کی جگہ ے لکھا ہے۔ 'پھر ویسی ہی' پڑھنے پر مصرعہ بامعنی ہوجاتا ہے۔ اب اگر فاروقی صاحب نہ بتاتے تو میں 'جوڑی' کو جوڑے اور 'چلنی' کو چلنے کیونکر پڑھ سکتا تھا؟ خلیل الرحمٰن اعظمی نے 'نوائے ظفر' میں جوڑی کو جوڑے اور 'چلنی' کو چلنے تو کردیا لیکن 'پھر ویسی ہے' کو جوں کا توں رہنے دیا۔ چنانچہ مغنیوں نے 'ویسی ہے' ہی گایا اور یہ غزل آج تک اسی طرح یعنی غلط ردیف (جو بے معنی ہے) کے ساتھ ہی گائی اور سنی جارہی ہے۔ فاروقی صاحب کے بتانے پر مجھے یاد آگیا کہ کوئی دس برس قبل جب میں دوردرشن کے لیے اکبر الہ آبادی پر ڈاکیومنٹری (فلم) بنا رہا تھا تو کتابستان، الہ آباد کے مالک انوراللہ خاں نے مجھے اکبر الہ آبادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط دکھایا تھا جو انھیں اکبر کے پوتے محسن رضوی سے ملا تھا۔ اس میں بھی ''نظمیں تو بہت ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسے نظم بھیجوں (کون سی نظم بھیجوں)'' جیسے جملے تھے۔ اس وقت تک دوچشمی ھ کا استعمال بھی نہیں کیا جاتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر نے کہا تھا۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

ایک دوسری غزل میں کہا۔

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامن باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا
پس مرگ قبر پہ اے ظفر کوئی فاتحہ بھی پڑھے کہاں
جو وہ ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے اڑا دیا

بہادر شاہ ظفر کی بدنصیبی وہیں ختم نہیں ہوگئی بلکہ آج بھی ان کی غزل غلط گائی اور سنی جارہی ہے۔

■

Fazle Hasnain
A/7, Patrakar Colony,
Ashok Nagar, Allahabad-211001
Moh.:07499178776

وجودیت اور اردو ناول

سفینہ بیگم

یوروپی مفکرین اور فلسفیوں کے زیر اثر پروان چڑھنے والے متعدد افکار و نظریات کے تحت زندگی کے فلسفے کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اور زندگی کے متعلق سقراط اور افلاطون کے نقطہ نظر کی روشنی میں چند نکات کے رد و قبول اور ترمیم و اضافے کے ساتھ فلسفہ حیات کی تفہیم میں مزید وسعت پیدا ہوئی ہے۔ دنیا میں ہونے والے فسادات پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے پیدا شدہ حالات نے انسانی وجود کی شناخت اور اس کی اہمیت پر بہت سے سوالیہ نشان لگائے۔ عقلیت کی بنا پر مادہ پرستی کے غالب رجحان نے انسانی وجود کی عظمت کو پس پشت ڈال دیا۔ مسائل و مصائب سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ذات کے انخلا کو پر کرنے کے لیے انسان اپنی زندگی کے معانی و مطالب تلاش کرنے میں سرگرداں تھا۔ لہٰذا اس وقت فلسفہ وجودیت نے عوام کو زندگی کے معنی فراہم کرتے ہوئے وجود کی اہمیت کو تمام اشیا پر فوقیت دی۔ اور بتایا کہ زندگی میں رونما ہونے والی تمام مشکلات اور اپنے اعمال کا ذمے دار انسان خود ہے۔

انیسویں صدی میں پیدا ہونے والے Soren kierkegaard اور Friedrich Nietzsche کو فلسفہ وجودیت کا موجد قرار دیا جاتا ہے، ان کے ساتھ Marcel,Karl jaspers, Merleau ponty ,Jean-paul sartre,Martin heidgger,Albert camus,Simon de beauvoir بھی فلسفہ وجودیت کے اہم ستون اور وجودیت پرست ادیب کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وجودیت کے ضمن میں ان تمام نظریہ ساز مفکرین و ادیب کی آرا کے درمیان فرق ہے۔ لیکن ان کا طرز فکر یکساں ہے جو وجودیت کے غوامض کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ان مفکرین نے داخلیت پر زور دیتے ہوئے وجود کی اصل حقیقت کی شناخت کی جانب توجہ دلائی اور کہا، "I am therefore i think"، ''میرا وجود ہے اس لیے میں سوچتا ہوں''۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کا وجود اصل چیز ہے اور اس کی وجہ سے ہی خیالات و افکار اور دیگر عوامل وجود میں آتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ انسان اپنے تجربات کی بنیاد پر ہی اشیا سے واقفیت حاصل کرتا ہے اور آگہی تک پہنچتا ہے۔ اس کا وجود کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عمل نہیں کرتا بلکہ اس کا فوری عمل اور انتخاب اس کو تجربات سے ہمکنار کرکے جوہر کی تخلیق کرواتا ہے۔ وجودیت پرست مفکرین انسان کو اس کی فطرت (Nature) کے مطابق جانچنے کے بجائے اعمال (Actions) کے ذریعے اس کا تعین قدر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ فلسفہ اقدار اور رسم و رواج پر بھی یقین نہیں رکھتا۔

فلسفہ وجودیت کا بنیادی مقصد اپنے وجود کو معنی فراہم کرتے ہوئے انسان کی مکمل آزادی پر زور دینا ہے۔ ایسی آزادی جو اس پر کسی بھی قسم کے پہرے نہ بٹھائے اور نہ ہی کوئی پابندی عائد کرے بلکہ اپنی زندگی کی سمت متعین کرنے کے لیے انتخاب کی آزادی دے۔ اسی اعتبار سے انسان اپنی منتخب کردہ راہ پر چلنے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کا ذمے دار بھی خود ہوتا ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے سبب ہونے والی تباہی و بربادی اور اموات کا جو Ratio سامنے آیا تھا اس نے انسان کے ذہن و دل میں اس بات کو مرتسم کر دیا تھا کہ زندگی محض لایعنیت اور مہملیت کے سوا کچھ نہیں۔ اگر زندگی کے کوئی معنی ہیں تو پھر یہ جنگیں اور فسادات کیوں ہوتے ہیں۔ اگر خدا موجود ہے اور اس نے کائنات کو صحیح طور پر چلانے کے کچھ اصول متعین کر رکھے ہیں تو پھر زمین پر یہ بگاڑ کیسا۔ اس کشمکش نے انسان کو ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا۔ فرد اور سماج کا باہمی تعلق منقطع ہونے لگا انسان خود اور خدا سے بیگانگیت کا شکار ہونے لگا۔ لہٰذا اسی کے سبب نطشے نے 'خدا کی موت' کا اعلان کیا اور اپنے وجود کو اصل اور سب سے اہم بتا کر زندگی کی معنویت کی طرف توجہ دلائی اور انسانی وجود کو انفرادی حیثیت عطا کی۔

وجودیت کے ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ درج بالا تمام فلسفیوں میں کامیو، سارتر، پانٹی اور ہیڈگر خدا کے وجود کے قائل نہیں تھے لیکن اس کے باوجود تمام مفکرین وجودی فکر کے سلسلے میں چند بنیادی نکات کو اہم قرار دیتے ہیں۔ Thomas R.Flynn نے ان تمام وجودیت پرست فلسفیوں کے نظریات کی روشنی میں وجودیت کی بنیاد درج ذیل تقسیم پر رکھی ہے۔ اور اس کو وجودیت کی اساس قرار دیا ہے۔

1. Existence precedes essence. what you are (your essence) is the result of your choices(your existence) rather than the reverse. Essence is not destiny.you are what you make yoursell to be.
2. Time is of the essence. We are fundamentally time-bound beings.Unlike measurable,'clock' time,lived time is qualitative:the 'not yet' the 'already' and the'present' differ among themselves in meaning and value.
3. Humanism. Existentialism is a person-centered philosophy. Though not anti-science, its focus is on the human individual's pursuit of identify and meaning amidst the social and economic pressures of mass society for superficiality and confirmism.
4. Freedom/responsibility. Existentialism is a philosophy of freedom. Its basis is that fact that we can stand back from our lives and reflect on what we have been doing. In this sense, we are always 'more' than ourselves.But we are as responsible as we are free.
5. Ethical consideration are paramount. Though each existentialist understands the ethical, as with 'freedom' in his or her own way, the underlying concern is to invite us to examine the authenticity of our personal lives and of

our society. (1)

ان تمام نکات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وجودیت پرست، جوہر کی تخلیق پر فرد کے وجود کو اہمیت دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ انسان کا وجود ہی جوہر کی تخلیق کا سبب ہے۔ اس کے بغیر جوہر/تصورات/خیالات کی کوئی اہمیت نہیں۔ وجودی طرز فکر رکھنے والوں کے لیے وقت ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں فرد لمحہ لمحہ زندگی جیتا ہے اور اس سے استفادہ کرتا ہے۔ ماضی سے متعلق یادیں اور مستقبل سے وابستہ خواب انسان کو جذباتی بنا دیتے ہیں اور یہ صورت حال فرد کے لیے دائمی عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی جذبات فرد کو جنون، تشویش، خوف اور خواہش وغیرہ میں مبتلا کر کے وجود کی اہمیت کو اسفل سطح پر پہنچا کر خود غالب آجاتے ہیں۔ لہٰذا وجودی طرز فکر ان تمام باتوں سے آزادی دلا کر فرد کو اساسی حیثیت عطا کرتی ہے۔ یہ فلسفہ فرد کی انفرادیت اس کی شناخت اور اس کی آزادی پر زور دیتے ہوئے اپنے افعال و اعمال کا ذمے دار بھی فرد کو قرار دیتا ہے اور صداقت کی بنیاد پر اپنی زندگی میں ہونے والے تجربات کا جائزہ بھی لیتا ہے۔ ڈی جے کوناچ، سارتر پر اپنے مضمون میں وجود کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:

''آدمی کے لیے اس کا مطلب صرف یہ نہیں کہ وہ 'ہے' بلکہ یہ کہ وہ ''ایک صورت حال میں ہے'' جو اس کے ماحول کے متعدد حالات، حیاتیاتی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، کے تحت تشکیل پاتی ہے۔ آدمی کو دوسرے مظاہر فطرت کے برخلاف جو چیز بطور خاص عطا ہوئی ہے، وہ اپنا 'جوہر' خود تخلیق کرنے کی آزادی ہے۔ یعنی اپنی مخصوص صورت حال میں رہ کر اپنے انتخابات اور اعمال کے ذریعے، اسے خود فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی بننا چاہتا ہے۔ لہٰذا بنیادی طور پر ''اپنے آزاد فیصلوں اور اعمال کے مجموعے کے سوا آدمی اور کچھ نہیں ہے''۔ اور اس کی صورت حال میں ایسی کوئی شے نہیں ہوتی، جو کسی قدر کی حامل ہو، سوائے اس کے کہ وہ خود اپنے انتخابات کے وسیلے سے کوئی قدر تخلیق کرلے۔ نتیجتاً آدمی کی زندگی کا سب سے بڑا بنیادی تجربہ اپنی آزادی کی مطلقیت کا احساس ہے۔ اس آزادی کا جتنا کم احساس اس کو ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ وہ اپنی صورت حال کا غلام ہوتا ہے، اور اتنا ہی زیادہ وہ اس حالت فطرت کی دوسری 'اشیا' سے قریب ہوتی ہے.... بہرکیف اپنی صورت حال کی سمجھ، اس صورت حال کے پیش نظر اپنے انتخابات کے ذریعے اقدار و معانی کی تخلیق کی مکمل ذمے داری کی آگہی... یہ وہ باتیں ہیں، جو ان اعمال کے لیے لازمی اساس فراہم کرتی ہیں، جن کے سبب آدمی اپنی آزادی کا اعلان کرتا ہے اور اپنی تشکیل کرتا ہے۔''2

وجودیت کے متعلق ان تمام مباحث کے زیر اثر مغرب میں ادب تخلیق کیا جاتا رہا ہے۔ کامیو اور سارتر کی تحریریں فلسفہ وجودیت کی تفہیم میں مزید معاون ثابت ہوئی ہیں۔ جنھوں نے کردار اور ان کی صورت حال کو وجودی طرز فکر کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔ مغربی ناولوں کے مقابلے میں برصغیر میں ایک بھی مکمل اردو ناول وجودی نقطۂ نظر کے حوالے سے تشکیل نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن چند ناولوں میں وجودی عناصر کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جن میں بانو قدسیہ کا ناول راجہ گدھ، عبداللہ حسین کا اداس نسلیں اور خالدہ حسین کا کاغذی گھاٹ قابل ذکر ہیں اور انھیں تینوں ناولوں کے حوالے سے وجودیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

مغرب میں دوسری جنگ عظیم اور مشرق میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا شدہ حالات انسانی وجود کے کرب کا باعث بنے۔ بانو قدسیہ نے اپنے ناول راجہ گدھ میں انسانی ذات کے کرب و انتشار، تنہائی، وجود کی بے وقعتی، روحانی اضطراب اور ذہنی پیچیدگیوں کو موضوع بناتے ہوئے، صورت حال کی عکاسی کی ہے جس سے اس دور کا ہر شخص نبرد آزما تھا۔ اس ناول میں قیوم، سیمی اور آفتاب وجودی فکر کے نمائندہ کردار ہیں۔ جو زندگی کی معنویت کو سمجھنے اور آزادانہ طور پر اپنے انتخاب کے حصول میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ سیمی کا کردار محبت میں ناکامی کے سبب وجودی شکست و ریخت کا شکار ہو کر موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ آفتاب سے بچھڑنے کے بعد اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہ جاتا۔ وہ اپنے جسم و جان کی اہمیت سے بے بہرہ ہو جاتی ہے۔ قیوم سے جسمانی تعلق قائم کر کے اور اس سے آفتاب کی باتیں کر کے وہ ایسا خود ساختہ راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے جو آفتاب کی یادوں کو زندہ رکھ سکے۔ وہ خودکشی کرنا چاہتی ہے اور بیماری کی حالت میں زیادہ تعداد میں نیند کی گولیاں کھا کر اپنی جان دے دیتی ہے۔ آفتاب اور سیمی محبت میں باہمی کشش کے باوجود ایک دوسرے سے عدم توافق رکھتے ہیں۔ عشق لاحاصل کی یہ منزل سارتر کے نزدیک محبت کا ایک وجودی تجربہ ہے۔ پروفیسر خورشید احمد سارتر کے اس نظریے کے متعلق رقمطراز ہیں:

''سارتر کے نزدیک محبت بھی موت کی طرح انفرادی وجودی تجربہ ہے۔ سارتر کے ناولوں اور افسانوں میں جس نظریہ محبت کا اظہار ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ دو محبت کرنے والے بیک وقت ایک دوسرے کو اپنا مکمل معروض بنانا بھی چاہتے ہیں اور ایک دوسرے کی آزادی کو چھیننا بھی نہیں چاہتے۔ لیکن دوسرے کو اپنا معروض بنانے اور ساتھ ہی اس کے حق آزادی کو قبول کرنے میں جو تضاد ہے، اس کی وجہ سے محبت ٹوٹنے اور بکھرنے پر مجبور ہے۔ اس لیے محبت کا رشتہ ناکامی پر منتج ہوتا ہے اور محبت ایک لاحاصل جذبہ نظر آتی ہے۔''3

سیمی کی موت کے بعد قیوم کا کردار زندگی کی بے معنویت کا بوجھ اٹھائے، نفسیاتی بحران کے سبب اپنے تشخص کی پامالی کا احساس لیے خواہشات کے حصول میں راندۂ درگاہ نظر آتا ہے۔ جبلی قوتوں کا باہمی تصادم، اپنے وجود کی بے سمتی اور انفرادی شناخت سے بیگانگی اس کو سوال اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

''میں کون ہوں؟

''کہاں سے آیا ہوں؟

''مجھے یہاں سے کہاں جانا ہے؟ اور اگر مجھے کہیں نہیں جانا اور اس مٹی میں نائیٹروجن کی بھاری مقدار بن کر واپس لوٹنا ہے تو پھر یہ ساری تگ و دو کیوں؟... یہ سارا عذاب کس لیے؟

کائنات کیا ہے؟

اس کائنات سے پرے کون چھپا بیٹھا ہے؟ کیا کائنات والے سے ہمارا بے حقیقت ذرات کا کوئی تعلق ہے؟ کیا اس نے ہمیں صرف اپنی تفنن طبع کے لیے بنایا ہے؟''4

ایک جگہ اس انداز سے کہتا ہے:

''یہ سب کیا ہے؟

انسانی رشتے؟... نفرتیں محبتیں؟

یہ سب کچھ کیا ہے۔

زندگی کا سفر؟

ہمیں کیا چاہیے؟... ایک دوسرے سے؟... اپنے آپ سے؟

عمر کا فریب، عقل کا فریب، محبت کا فریب...

معاشرہ اور فرد... فرد اور قانون... قانون اور قانون فطرت.... ان سب کی حدیں کون سی ہیں؟''5

انسانی وجود ایک پیچیدہ اکائی ہے لہٰذا وجودی کرب کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہر دور میں اس قسم کے سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں۔ قیوم کا کردار بھی ذات کی ناآسودگی اور محبت میں زیاں کا احساس لیے زندگی کے وجودی تجربے سے روشناس (ہمکنار) ہوتا ہے

اور اس راز سے آگاہی حاصل کرتا ہے کہ انسان محض خواہشات کا غلام ہے جس کو پانے کے لیے وہ موت تک تگ و دو کرتا رہتا ہے اور صرف موت ہی اس کو خواہشات اور آرزوؤں سے آزادی دلا سکتی ہے۔ قیوم وجودی فکر پر محمول خیالات کا بیان اس طور سے کرتا ہے:

''شادی سے چند دن پہلے مجھ میں دو خواہشیں آگاہی کے ساتھ ابھری تھیں۔ اب مجھ پر یہ حقیقت بھی کھل رہی تھی کہ انسان جب تک چاہے جانے کی، رب بننے کی آرزو رکھتا ہے، وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ چاہا جانا اور آزاد رہنا صلیب کے بازو ہیں جن پر آدمی مصلوب ہو جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ مجھے مہاتما بدھ کی سمجھ آئی کہ وہ کیوں خواہشات کو ختم کر کے اپنی مکتی چاہتا تھا۔ جب تک انسان میں ہلکی سی خواہش بھی ہو وہ تابع رہتا ہے، خواہش کی وجہ سے قیدی ہوتا ہے۔ کبھی حاکم نہیں ہو سکتا۔ خواہش سے آزادی کیونکر ممکن ہے؟

کیونکر کیسے؟

موت سے پہلے موت... زندگی کے ساتھ زندگی کی نفی... آخری نجات سے پہلے کلی فرار۔

نجات کی آرزو تک سے... ہر مسلک سے، ہر بت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان ہر قسم کے بت توڑ دے، ہر مسلک سے آزاد ہو جائے۔ کسی ملت میں شامل نہ ہو۔ کسی ملک کا باشندہ نہ ہو۔ کسی معاشرے کا فرد نہ ہو۔ کسی کلچر سے وابستہ نہ ہو۔ کسی خاندان کا فرد نہ ہو۔ نہ کسی کا عاشق ہو نہ محبوب۔ ہر کیفیت سے آزاد... ایسی حالت میں وہ سوائے موت کے اور کسی کا مرہون منت نہیں ہوگا۔ کسی اور کا عاشق نہ ہوگا۔ موت جو یقینی ہے۔ موت سے پہلے موت''۔ 6

وجودی عناصر کے ضمن میں امتل کا کردار بھی قابل توجہ ہے جو ایک طوائف ہے۔ اور اپنی زندگی میں رونما ہونے والے حالات کے باوجود اپنی ذات کی ناآسودگی اور خلا کو پر کرنے کے لیے اپنے پیشے سے باز نہیں آتی اور اپنے وجود کے استقرار کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ مرد کے ذریعے کیے جانے والے استحصال کے نتیجے میں وہ جسمانی اور ذہنی اضمحلال میں مبتلا تو نظر آتی ہے لیکن اپنی آزادانہ روش سے مایوس نہ ہو کر قیوم کو اپنے تمام حالات سے آگاہ کر کے اس سے ہمدردی کا رشتہ بھی قائم رکھنا چاہتی ہے۔ ماضی کے متعلق یادوں کی، اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ وہ کوئی بھی کام سوچ سمجھے منصوبے کے تحت نہیں کرتی ہے۔ اپنے شکستہ و درماندہ وجود کی کرچیاں اور زخم خوردہ دل کو سنبھالے ہوئے آزادانہ طور پر آگے بڑھتی رہتی ہے۔ امتل کے تئیں قیوم کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''وہ بچوں کی طرح Sustained emotion کے قابل نہ تھی۔ اس کا لڑنا جھگڑنا پیار محبت، نفرت سب موڈ کے تابع تھے۔ کسی تھیوری، مسلک، دباؤ کے تحت وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ سب کچھ بغیر سوچے سمجھے کرتی۔ جی چاہا مدد کر دی، دل میں آیا گالی دے دی۔ کسی کو کھانا کھلا دیا، نیا پرس عطا کر دیا.......... وہ وقت، ضابطے اور طریقے کی پابند نہیں تھی۔ اس کا سارا نظام Impulses پر چلتا تھا۔ اسی لیے اس کی رائے پر چلنا مشکل تھا۔ کیونکہ اس کی دوستی، دشمنی نظریے سب منٹ کی سوئی کے تابع تھے۔ کچھ بھی گھنٹوں، دنوں، سالوں پر محیط نہ تھا۔'' 7

عبداللہ حسین کے ناول اداس نسلیں میں بھی وجودی عناصر کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس میں مذہب اور موت کے وجودی طرز فکر پر کی گئی فلسفہ طرازی وجودیت پرست مفکرین کے نظریات سے مطابقت رکھتی ہے ساتھ ہی ناول کا مرکزی کردار نعیم کا ذہنی رویہ، کامیو کے ناول Outsider کے مرکزی کردار مرسال کے Attitude سے قدرے مشابہت رکھتا ہے۔ مرسال کا کردار وجودی فکر کے زیر اثر تراشا گیا ہے جو کوئی بھی کام بغیر سوچے سمجھے انجام دیتا ہے۔ جس میں ایک عربی کا قتل اور شادی کے متعلق قردونہ کے دریافت کرنے پر اس کا اس لیے حامی بھر لینا کیونکہ قردونہ اس سے شادی کرنے کی خواہشمند ہے قابل ذکر ہے۔ اداس نسلیں میں جب شیلا نعیم سے شادی کی خواہش ظاہر کرتی ہے اور اس کے توسط سے حسین خیالات بیان کرتی ہے تو نعیم بھی بغیر کسی سوچ کے تحت اس کی تمام باتوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔ لیکن جلد ہی اس کو تنہا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ایک سپاہی کا قتل بھی بغیر منصوبے کے تحت انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی مثبت اور منفی پہلوؤں کو مدنظر نہ رکھ کر نعیم کانگریس کے ایسے خفیہ گروہ میں شامل ہو جاتا ہے جہاں جان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ موت کو نہایت قریب سے دیکھنے، ذات کی شکست و ہزیمت اور پے در پے رونما ہونے والے حالات کے مدوجزر سے نعیم کا وجود شدید تنہائی اور خلا کا شکار ہو جاتا ہے۔ فالج کا اثر اس کے وجود کو مزید مضمحل اور منتشر کر دیتا ہے۔ عذرا اس کو علاج کی غرض سے روشن محل لے آتی ہے اور ظاہر و باطن دونوں قسم کے زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش میں لگ جاتی ہے۔ نعیم ڈاکٹر انصاری کے زیر علاج رہتا ہے وہ اس کو مذہب کے متعلق ان باتوں سے آگاہ کرتا ہے جو اس کے درد کا مداوا کر سکے اور وہ مذہبی فکر، فلسفہ وجودیت سے ہم آہنگ ہے۔ جس کا تعلق روحانیت سے وابستگی کے سبب اپنے وجود کی شناخت ہے۔ نعیم سے گفتگو کے دوران ڈاکٹر انصاری کہتا ہے؛

''مذہب کا سب سے بڑا آلہ عبادت ہے۔ عبادت، جو انسان کی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک جذبہ بن جاتی ہے، جو انسان کو اپنے اندر جھانکنے کی استطاعت بخشتی ہے۔ آج تک جس کسی نے اپنے آپ کو جانا اور پہچانا ہے اس کی بساط عبادت نے اس میں پیدا کی ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چلتا ہوا آدمی ساری دنیا میں گھوم گھام کر پھر اپنے آپ تک آ پہنچتا ہے۔ وہ خفیہ اور تنگ راستہ جو انسان کی اپنی ذات پر آ کر ختم ہو جاتا ہے اور پھر اندر اتر جاتا ہے اور جب آدمی ڈرتا ہوا، جھجھکتا ہوا اپنی ذات میں داخل ہوتا ہے تو راستہ روشن اور کشادہ ہوتا جاتا ہے اور اس مقدس روشنی تک پہنچنے کا جذبہ، جو راستے کے اختتام پر نظر آتی ہے، اس کو پا لینے کی دیوانی خواہش انسان کو آگے چلاتی جاتی ہے اور اسے ایک مقصد عطا کرتی ہے اور جب وہ مقصد شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو انسان اپنی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ پہلے شعور کے پردے اٹھتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ لاشعور کے در وا ہوتے ہیں اور جب وہ آفاقی سطح پر پہنچ جاتا ہے تو ماوراء میں دیکھنے اور اسے جاننے لگتا ہے...'' 8

مزید کہتا ہے؛

''تخیل کو تم بغیر کسی وجہ کے عمل میں نہیں لا سکتے۔ ذہن کو اور خیالات کو مرنے سے بچانے کے لیے تمھارے پاس کوئی وجہ، کوئی دلیل ہونی چاہیے اور تبھی اس کے جواز کے طور پر تم سوچ سکتے ہو اور اپنے دماغ کو تباہی سے بچا سکتے ہو۔ خیالات کی بنیاد تم Nothingness پر نہیں رکھ سکتے۔ ایسا اگر کبھی کرو گے تو کسی خاص سمت میں بڑھنے کے بجائے تمھارے خیالات تیزی سے ادھر ادھر بکھر جائیں گے اور دماغ کو پاش پاش کر دیں گے۔ سمت جو خیالات کو ملتی ہے اسی تلاش سے آتی ہے۔ جو آدمی اپنے وجود کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے جاری کرتا ہے۔ اس کے بغیر تخیل بیکار ہے'' 9

وجودی مفکرین میں Karl Jaspers اور Gabriel Marcel اپنے وجود کی انفرادی شناخت میں مذہب کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اور تجربات کی روشنی میں اپنی روحانی (داخلی) ذات سے آشنا ہو کر منزل و مقصود کے حصول کو انسانی فکر کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ خالدہ حسین کا ناول ''کاغذی گھاٹ'' ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے وجود کی معنویت تلاش کرنے کے لیے ہمہ وقت ذہنی کشمکش کا شکار نظر آتی ہے۔ اپنے اردگرد موجود ٹھوس نظریہ

کے متحمل لوگوں کی زندگیوں کا تجزیہ اس کو کرب میں مبتلا کردیتا ہے۔ عائشہ اور افروز اس کی بہترین مثالیں ہیں جو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی خواہش میں ان راستوں کا انتخاب کرتی ہیں جن پر چل کر وہ اپنی شناخت اور مقصد سے محروم ہوجاتی ہیں۔ مونا اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے واقعات، صورت حال اور اپنے گھر کی روایت واقدار کے پاس ولحاظ میں جکڑی ہوئی اپنے وجود کے اثبات کی کوئی راہ نہیں پاتی ہے۔ اوران تمام صورت حال کو تقدیر کا لکھا ہوا قرار دینے لگتی ہے۔ اچانک اپنے وجود سے ادراک کی کیفیت اس کو سوچنے پر مجبور کردیتی ہے وہ ایک اچھی تخلیق کار ہے۔ لکھنا اس کا پسندیدہ عمل ہے۔ اور وہ اپنے وجود کی سچائی اوراس کے برحق ہونے کے جواز کا مطالبہ چاہتی ہے جو اس کے ''لکھنے'' میں مضمر ہے۔ اوراس کو اس بات کا احساس ہوجاتا ہے کہ زمین پر اس کے وجود کا جواز محض لکھنا ہی ہے۔ یہاں مونا کا کردار سارتر کی سوچ سے مماثل نظر آتا ہے۔ سارتر کا بھی یہی ماننا تھا کہ وہ صرف لکھنے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے۔ زندگی میں رونما ہونے والے تضادات کے پیش نظر مونا کو سارتر کے نظریہ انتخاب سے اکثر الجھن محسوس ہوتی۔ وہ حسن سے اس کے متعلق بحث بھی کرتی ہے:

''اس کو سارتر کے انتخاب کا تصور بے حد الجھاتا۔ وہ اکثر چلتے چلتے رک جاتی۔ انسان ہر قدم پر انتخاب کرتا ہے۔ مگر وہ انتخاب ہی دراصل پہلے سے طے شدہ ہے۔ اس نے حسن کو بتایا۔ ''نہیں وہ طے شدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ مستقبل ایک خلا ہے۔ جس میں واقعات اور عمل تخلیق کیے جاتے ہیں۔ یہی اس کا نیا پن ہے۔ وہ اور یجنل ہے۔''

''مستقبل ہرگز اور یجنل نہیں۔ اس لیے کہ سب کچھ پہلے سے ہو چکا ہے۔ یہ سب ایکشن ری پلے ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ بازیافت۔ کائنات کی Retrospection ہے۔ ہمیں یہ سب کچھ معلوم نہ ہوتا تو اور بات ہے۔ ہمارے لیے سب کچھ پہلی بار ہو رہا ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں۔''

''تو پھر انسان کی سعی؟''

''یہ اس کی مجبوری ہے''

''مگر یہ انتخاب کا مسئلہ واقعی بہت الجھا ہوا تھا۔ جبر وقدر کی مقدار اور کیفیت۔ کبھی کسی سے حل ہوئی ہوگی۔''

حسن، مونا کو اس کی تخلیقی صلاحیت کی اہمیت و افادیت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ لکھنے میں ہی اس کے وجود کے اثبات کا راز پوشیدہ ہے۔ بڑے بھائی اس کے لکھنے کو پسند نہیں کرتے لیکن ابا اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حسن کے بار بار زور دینے پر مونا اپنی تخلیقی صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہاں سارتر کے فلسفہ آزادی انتخاب کے سبب مونا وجودی فکر کے حوالے سے اپنا جوہر خود تخلیق کرتی ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی وجود ہر چیز کی تخلیق کا اصل سبب ہے۔ ساتھ ہی کبھی کبھی مونا کے ذہن میں تقدیر کا جبر اور مسلسل وپیہم اس کا سنگین وار سوچ کے رخ کو دوسرے موڑ پر لے جاتا۔ وہ افروز اور عائشہ کے ساتھ پیش آنے والے حالات کے متعلق اکثر سوچا کرتی۔ لیکن پھر اپنی تخلیق کی جانب یکسوئی سے توجہ دے کر اپنے وجود کو معنی فراہم کرتی ہے۔ اپنی تحریر کے بارے میں کہتی ہے:

''میرے لیے تو لکھنا ایک غیر شعوری اور اضطراری عمل ہے''۔

''واہ'' اب وہ بھی اس قابل ہوگئی تھی کہ لوگ اس سے پوچھتے تم کیوں لکھتی ہو، کس کے لیے لکھتی ہو۔ اور وہ ہرگز نہ جانتی تھی کہ وہ کیوں لکھتی ہے۔ یہ تو ایک خود غرض غیر شعوری عمل تھا۔ شاید وہ اپنی ذات کی بے پناہ کمزوریوں کی تلافی میں لکھتی تھی۔ وہ اس لیے لکھتی تھی کہ وہ وہ نہیں، جو اسے ہونا چاہیے تھا اور اس کے باہر بھی دنیا وہ نہیں جیسا اسے ہونا چاہیے تھا۔ شاید وہ اس لیے لکھتی تھی کہ وہ ایک معمولی ناقابل توجہ وجود تھی اور قابل بننا چاہتی تھی۔ شاید وہ اس لیے لکھتی تھی کہ وہ ایک غریب پسماندہ قوم اور ملک کی فرد تھی جو شاندار تاریخ کا دعوی دار تھا۔ تاریخ جو محض ایک طلسم تھی۔ اور اس کا وافر حصہ ایسا تھا جس کو یہ ملک اپنانے یا رد کرنے کے مخمصے میں تھا۔ شاید وہ اس لیے لکھتی تھی کہ وہ ایک شکست خوردہ ملک کی باسی تھی جو بلند بانگ دعوؤں کے باوجود سر اٹھا کے زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ جس کا وجود اور مستقبل دونوں مشکوک تھے اور شاید بڑی طاقتوں کے یہاں گروی بھی کیونکہ اس کے دانشور اس کے بارے میں دو غلے تھے۔ اور عوام، بھیڑ، وہ جم غفیر جس سے یہ دھرتی معمور تھی، صبح شام زندگی اور موت کی کشاکش میں گرفتار۔ ذلت کا منشور ان کے لیے قسام ازل نے تیار کر رکھا تھا جس سے سرمو ادھر ادھر ہونا ممکن نہ تھا شاید وہ اس لیے لکھتی تھی... 11

درج بالا اقتباس میں صورت حال اور اس سے پیدا شدہ نتائج کے حوالے سے مونا کے لکھنے کے پیچھے اسباب کو بیان کیا گیا ہے۔ جو رسم ورواج کی قید وبند اور پابندی سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ بعض اوقات اپنے ذہن کی افترا پردازی میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ اور عائشہ اور افروز کی زندگی سے خود کا موازنہ کرنے لگتی ہے تو اس کے ابا اسے سمجھاتے ہیں:

''دیکھو بیٹا بات سیدھی سی ہے۔'' بالآخر ابا نے کہا۔ ''کسی تخلیقی عمل کو اگر دلیل کی دار پر چڑھاؤ گی تو وہ ختم ہوجائے گا۔ یہ سارا عمل وہبی ہے۔ اس میں کیوں اور کیسے نہیں آتا۔ جو تم پر اترتا ہے لکھتی جاؤ۔ منطق اور تجزیوں کے بکھیڑوں میں کیوں پڑتی ہو۔''12

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کاغذی گھاٹ میں وجودی طرز فکر کو مدنظر رکھتے ہوئے کرداروں کی تشکیل میں مدد لی گئی ہے۔ بیسویں صدی سے ہی فلسفہ وجودیت ایک مکتب فکر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس میں انتخاب کی آزادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا درد وکرب، نا امیدی، مایوسی کے سبب ہمت نہ ہارنا اور اپنے وجود کو معنویت دینے اور سمت متعین کرنے کی غرض سے تجربات کی روشنی میں مسلسل جد وجہد کرتے رہنے کو وجودیت کی اساس قرار دیا گیا ہے اور وجود کو ہر شے پر مقدم تسلیم کیا گیا ہے۔ فلسفہ وجودیت کے تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے ان ناولوں کے علاوہ کئی دیگر ناولوں میں بھی وجودی فکر کے عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ تاکہ ناول تنقید کے مزید امکانات پیدا ہوسکیں۔

حواشی:

(1) Existentialism, A very short introduction, Thomas R.Flynn, oxford university press, Newyork, 2006 p.8

(2) فلولا جیکل کوارٹرلی، اکتوبر 1954، ص 409، 410، بحوالہ اردو افسانے پر مغربی اثرات، خورشید احمد، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2002، ص 105,106

(3) اردو افسانے پر مغربی اثرات، خورشید احمد، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 2002، ص 113

(4) رضیہ گدھ، بانو قدسیہ، شان ہند پبلی کیشنز، دہلی، 1988، ص 252

(5) ایضاً، ص 330

(6) ایضاً، ص 493، 494

(7) ایضاً، ص 407

(8) اداس نسلیں، عبد اللہ حسین، ہمہ کتاب گھر دہلی، 2012، ص 403، 404

(9) ایضاً، ص 404

(10) کاغذی گھاٹ، خالدہ حسین، ص 79، 80

http://allurdupdfnovels.blogspot.in/

(11) ایضاً، ص 199

(12) ایضاً، ص 120

■

Safeena Begum
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)

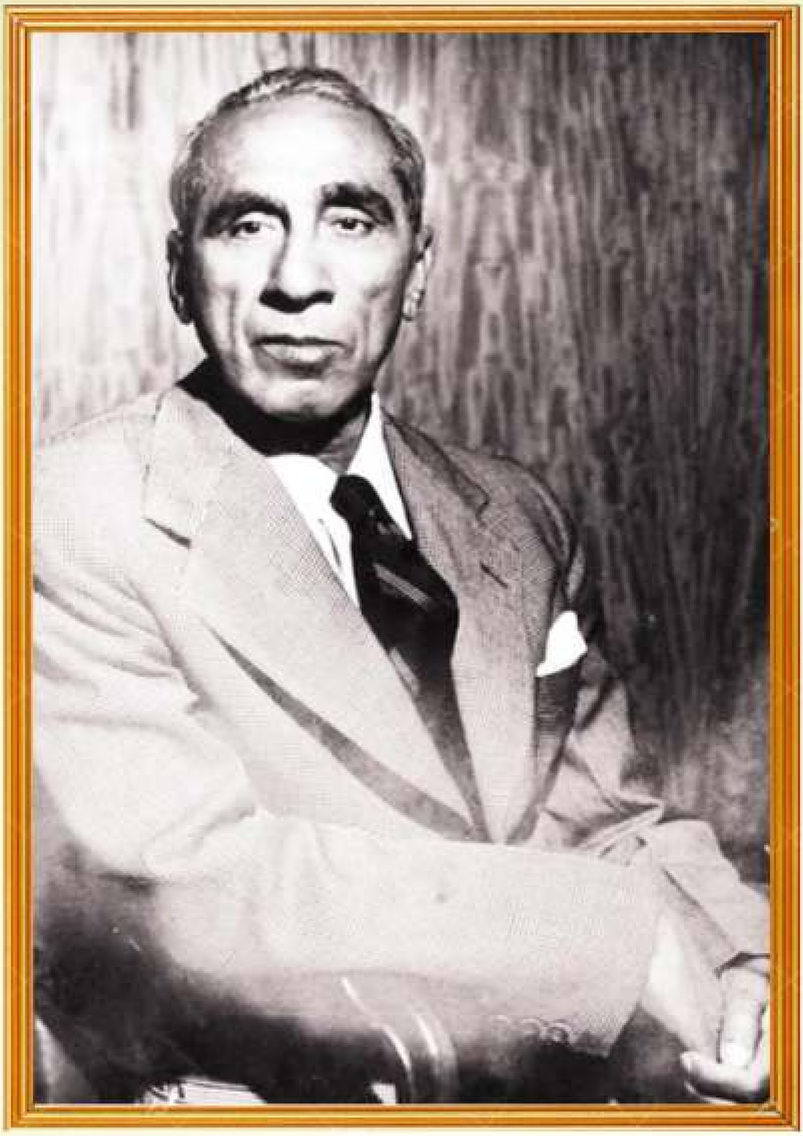

ظفر گلزار

پطرس بخاری کی طنز و مزاح نگاری

مزاح نگار کی نظر سماج اور آس پاس کے ماحول پر ہوتی ہے اس لیے اردو نثر میں طنز و مزاح کافی اہمیت کا حامل ہے۔اس کا مقصد اپنے معاشرے کی ناہمواریوں اور تضادات کو اس انداز میں بیان کرنا ہوتا ہے کہ قاری ان سے محظوظ بھی ہو اور حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی حاصل کر سکے۔طنز و مزاح میں تعمیری پہلو بھی غالب ہوتا ہے۔اس کے برخلاف طنز زندگی اور ماحول سے برہمی اور عدم تشفی کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔طنز نگار جس واقعہ پر ہنستا ہے اس کو پسند نہیں کرتا ہے اور اس کو بدل دینے کا آرزومند ہوتا ہے۔طنز و مزاح نگاروں نے ابتدا سے ہی تضادات،معاشرتی اور سیاسی برائیوں،مذہبی بنیاد پرستی،توہم پرستی اور فرسودہ روایات کو نشانہ بنایا ہے۔جعفر زٹلی سے لے کر دور حاضر تک یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔اس ضمن میں رتن ناتھ سرشار،اکبرالہ آبادی،منشی سجاد حسین،خواجہ حسن نظامی،مرزا فرحت اللہ بیگ،رشید احمد صدیقی،پطرس بخاری،کرشن چندر،شوکت تھانوی،فرقت کاکوروی،کنہیا لال کپور،مشتاق احمد یوسفی،شفیقہ فرحت اور مجتبیٰ حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس تعلق سے وزیر آغا کا ماننا ہے کہ زندگی کی ناہمواریوں کے ہمدردانہ شعور اور ان کے فنکارانہ اظہار کا نام مزاح ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''مزاح نگار اپنی نگاہ دوربین سے زندگی کی ان ناہمواریوں اور مضحک کیفیتوں کو دیکھ لیتا ہے جو ایک عام انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔دوسرے ان ناہمواریوں کی طرف مزاح نگار کے ردعمل میں کوئی استہزائی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔بلکہ وہ ان سے محظوظ ہوتا اور اس ماحول کو پسند بھی کرتا ہے جس نے ان ناہمواریوں کو جنم دیا ہے۔چنانچہ ان ناہمواریوں کی طرف اس کا زاویہ نگاہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔

(اردو ادب میں طنز و مزاح۔وزیر آغا،ص:47)

پطرس بخاری کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔وہ دوسرے پر طنز کے تیر چلانے کی بجائے خود کو ہی تختۂ مشق بناتے ہیں اور قاری کو ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔وہ اپنے مضامین کی شگفتگی،برجستگی،روانی اور توانائی کی وجہ سے اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں نہایت بلند مقام کے حامل ہیں۔وہ مشرقی ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادب اور طرز فکر سے بھی بخوبی واقف تھے جس کی جھلک ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔پطرس کی تحریروں میں یوں تو مزاح کا رنگ گہرا ہے لیکن ان کے بعض مضامین میں اعلیٰ معیار کا طنز ملتا ہے۔جہاں کہیں انھوں نے طنز کا سہارا لیا ہے وہاں اس کی کاٹ بھی زبردست ہے۔وہ طنز کو مزاح کی شیرینی میں اس خوبی سے پیش کرتے ہیں کہ طنز کی تلخی زیر لب تبسم میں بدل جاتی ہے۔'کتے' اور 'لاہور کا جغرافیہ' ان کے لطیف طنز کی عمدہ مثالیں ہیں۔

پطرس اردو طنز و مزاح میں ایک نئے اسلوب کے خالق ہیں۔ان کا اسلوب شوخی،شائستگی اور ظرافت کا حسین مرقع ہے۔ان کے مزاحیہ مضامین میں انسانی نفسیات کی گرہیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ان کے کردار اپنی حرکت و عمل سے ہمیں مسکرانے اور بعض اوقات قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔مضامین پطرس کے مطالعے سے ان کی ذہنی طباعی،انسانی نفسیات پر ان کی بھرپور گرفت،زبردست قوت مشاہدہ اور تخیل کی بلند پروازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کی تحریروں میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں ملتا بلکہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ فطری بات ہے۔وہ واقعات اور کرداروں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ خود بخود مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔ان کی ظرافت میں تجربہ اور مشاہدہ شامل ہوتے ہیں۔وہ انسانی کردار کا نہایت گہرائی سے نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی جزئیات پر بھی ان کی نظر رہتی ہے۔ان کے کردار بتدریج

ارتقا کے مراحل طے کرتے ہیں۔ان کی کردار نگاری بہت معیاری ہے اور فن مزاح کی صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ پطرس کے مزاح میں تمسخر اور مضحکہ کا دخل نہیں ہے۔ انھوں نے بڑی ہمدردی کے ساتھ زندگی کے مزاح انگیز پہلوؤں کی عکاسی کی ہے اور قارئین کے لیے شائستہ مزاح کا سامان فراہم کیا ہے۔

پطرس کے زیادہ تر مضامین کا مرکزی کردار واحد متکلم ہے۔اس سے انھوں نے بڑا کام لیا ہے اور اپنے مضامین کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ان مضامین میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں خود مصنف کے شامل رہنے سے ان کے حقیقی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اپنی کمزوریوں اور تضادات کو خوش دلی کے ساتھ قبول کر لینا، ان پر خود بھی ہنسنا اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کر دینے کا حوصلہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ان واقعات میں اتنا فطری پن ہے کہ جیسے یہ سب کچھ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔واحد متکلم کے حرکت و عمل کی مدد سے انھوں نے زندگی کی ناہمواری، عدم توازن اور تضادات کو اجاگر کرکے مزاحیہ صورت حال پیدا کی ہے۔یہ پطرس کی مزاح نگاری کی انفرادیت ہے جس میں کوئی ان کا شریک نہیں۔وہ مزاح کو ایک شائستہ فن تصور کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی مزاحیہ تحریروں میں شائستگی اور وقار کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ان کے مضامین کا فطری اتار چڑھاؤ، مکالمے اور روانی سب مل کر ایک معمولی سے خیال کو بھی بہت خاص بنا دیتے ہیں۔ان کا پلاٹ فطری انداز میں اپنے گرد و پیش کے مناظر سے ہم آہنگ ہو کر ارتقا کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے۔کبھی وہ جملوں کی ترتیب اور الفاظ کی تراکیب سے مزاح پیدا کرتے ہیں اور کبھی برجستگی اور ندرت سے ہمیں مسکرانے کا موقع عطا کرتے ہیں۔

ان کے مضمون 'ہاسٹل میں پڑھنا' میں ایک ایسے طالب علم کی تصویر پیش کی گئی ہے جس کو پڑھنے لکھنے سے زیادہ ہاسٹل میں رہنے کا شوق ہے تاکہ وہاں کی آزاد فضا میں اپنی مرضی کی زندگی گزار سکے۔اس مضمون میں ایک ایسے خوش حال اور صاحب استطاعت خاندان کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جو بے حد قدامت پسند ہے اور تعلیم کی اہمیت اور تعلیمی اداروں کے حالات سے بالکل واقف نہیں ہے۔اس خاندان میں جدید دور کی ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔لڑکے نے انٹرنس کا امتحان تیسرے درجے میں پاس کیا ہے۔خوشیاں منائی جا رہی ہیں اور مٹھائیاں بانٹی جا رہی ہیں۔مگر لڑکے کو آگے کی تعلیم کے لیے ولایت اس لیے نہیں بھیجا جاتا کہ آس پاس کے علاقے سے کسی کے ولایت جانے کی کوئی روایت نہیں ہے۔گھر والے مشکل سے اس بات پر رضامند ہوتے ہیں کہ لڑکے کو پڑھنے کے لیے لاہور بھیجا جائے۔لیکن وہاں اسے ہاسٹل میں داخل کرنے کی بجائے ایک ایسے رشتے دار کے یہاں رکھنے کا فیصلہ کیا جاتا ہے جس سے رشتے داری کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے خاندانی شجرہ دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔اس کے باوجود گھر کو ہاسٹل پر اس لیے فوقیت دی جاتی ہے کہ ''گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ کا ایک دوزخ ہے۔'' لڑکا انھیں سمجھاتا ہے، ہاسٹل میں رہنے کے فوائد گنواتا ہے اور اپنے مستقبل کی بہتری کے لیے اسے لازمی قرار دیتا ہے لیکن خاندان کے لوگ اس کی دلیلوں سے قائل نہیں ہوتے۔آخر کار دور کے رشتے کے ایک ماموں جن کے یہاں اس کے قیام کا بندوبست کیا جاتا ہے جو کہ والدین سے بھی زیادہ محتاط اور سخت گیر ثابت ہوتے ہیں۔طالب علم پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔اس کا نتیجہ امتحانات میں مسلسل ناکامی، بے راہ روی اور سگریٹ نوشی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے۔آخر طالب علم کی پے در پے ناکامیوں کے بعد والدین کو جھکنا ہی پڑتا ہے اور وہ اسے ہاسٹل میں رہنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔لیکن اس کی امیدوں پر اس وقت پانی پھر جاتا ہے جب بی اے کا رزلٹ آتا ہے اور وہ پاس ہو جاتا ہے۔

'سویرے جو کل آنکھ میری کھلی' کا مرکزی کردار بھی واحد متکلم کی شکل میں وہی طالب علم ہے جسے ہاسٹل میں رہنے کا بڑا ارمان تھا اور جسے پڑھنے لکھنے کے علاوہ ہر کام سے دلچسپی ہے۔امتحان کا زمانہ آتا ہے تو تیاری کے لیے صبح اٹھ کر پڑھنے کا فیصلہ کرتا ہے۔اپنے پڑوسی لالہ کرپا شنکر جی سے صبح جگانے کی درخواست کرتا ہے۔لالہ جی بھی اتنے مستعد اور صبح خیز ہیں کہ رات کے تین بجے ہی جگا دیتے ہیں۔لڑکا اتنی جلدی جگا دینے کے لیے انھیں برا بھلا کہتا ہے اور پھر جو سوتا ہے تو صبح دس بجے آنکھ کھلتی ہے۔چونکہ امتحان قریب تھے اور تیاری ضروری تھی، اس لیے لالہ جی سے پھر سے جگانے کی گذارش کی۔لالہ جی ناراض تو تھے لیکن شریف آدمی تھے اس لیے مان گئے اور صبح چھ بجے جگانے پر رضامند ہو گئے۔انھوں نے مقررہ وقت پر جگایا تو لڑکے نے ان سے کہا کہ ہاں وہ جاگ گیا ہے لیکن جب بیدار ہوا تو دس بجے تھے۔اس نے لالہ جی کا شکریہ ادا کیا تو پوچھنے لگے کہ میں نے آپ کو آواز دی تھی لیکن آپ کچھ بولے نہیں اور کوئی بہانہ نہ سوجھا تو کہہ دیا کہ نماز پڑھ رہا تھا۔اس طرح راوی کا جاگنا نمبر ایک چھ بجے اور جاگنا نمبر دو دس بجے قرار پایا اور لالہ جی پوچھیں تو نماز کا بہانہ بنا دیا۔

'میں ایک میاں ہوں' میں شوہر اور بیوی کے تعلقات، شوہر کے دوستوں پر اعتراضات کی حقیقی تصویر پیش کی گئی ہے۔بیوی کے میکے جانے پر شوہر خوش ہوتا ہے کہ کچھ دن کے لیے آزادی ملی۔لیکن چند دنوں میں ہی بیوی کی یاد میں اس کی آنکھوں سے آنسو بھی نکلنے لگتے ہیں۔اسے ٹیلی گرام کرتا ہے کہ تم جلدی آ جاؤ تمھارے بغیر میں بہت اداس ہوں۔اس کے بعد اس کے سبھی دوست ایک ایک کرکے اسی کے گھر آ دھمکتے ہیں اور خوب شور مچاتے ہیں۔وہ خود بھی اس میں پیش پیش ہے۔اسی درمیان بیوی آ جاتی ہے۔اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ میاں کو اس حالت میں دیکھ کر بیچاری بیوی کیا سمجھی ہوگی اور شوہر پر کیا گزری ہوگی۔

'مرید پور کا پیر' میں سیاست دانوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔لیڈر کیسے بنتے اور بنائے جاتے ہیں اس کی تفصیل اس میں اس قدر خوبصورتی سے پیش کی گئی ہے کہ بیساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔

مصنف نے 'سنیما کا عشق' میں ایک ایسے دوست کا خاکہ کھینچا ہے جو ہمیشہ دیر سے سنیما ہال پہنچتا ہے۔یہ خاموش فلموں کے زمانے کی بات ہے جب فلم کا کچھ حصہ چھوٹ جاتا تھا تو کہانی سمجھنا محال ہو جاتا تھا۔راوی وقت کا پابند ہے لیکن اس کی وجہ سے وہ بھی ہمیشہ تاخیر سے پہنچتا ہے۔وہ اپنے دوست مرزا کی اس عادت سے پریشان ہے لیکن اپنی عادت سے مجبور بھی ہے کہ وہ اکیلے فلم دیکھنے جا نہیں سکتا۔اسی لیے جب کوئی نئی فلم آتی ہے تو وہ مرزا سے پوچھتا ہے ''کیوں بھئی مرزا، اگلی جمعرات سنیما چلو گے نا؟'' وہ اشارے کنائے میں اور کبھی کبھی براہ راست مرزا سے وقت پر پہنچنے کی تنبیہ بھی کرتا ہے لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور وہ بدستور تاخیر سے ہی سنیما ہال پہنچتے ہیں۔

'میبل اور میں' میں کیمبرج کے ایک طالب علم اور ایک طالبہ کو کردار بنا کر انسانی نفسیات کی گرہ کھولی گئی ہے۔میبل اکثر کہانی کے راوی کو کچھ نئی کتابیں دے جاتی ہے اور پھر بعد میں ان کتابوں پر دونوں آپس میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔راوی کے لیے ہفتے میں دس بارہ کتابیں پڑھنا ایک مشکل کام ہے لیکن وہ ایک لڑکی کے سامنے یہ اعتراف کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے کہ وہ یہ کتابیں نہیں پڑھ سکا۔چنانچہ وہ بغیر پڑھے ان پر عمومی قسم کا تبصرہ کرتا ہے۔ایک بار وہ بیمار ہوتا ہے اور میبل اس کی تیمارداری کو آتی ہے تو اسے بے حد ندامت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اتنی اچھی لڑکی کو دھوکہ دیتا رہا۔وہ

میبل سے اپنے اس عمل کے لیے معذرت کا اظہار کرتا ہے۔ میبل اسے معاف کر دیتی ہے۔ جاتے وقت وہ پچھلی بار دی گئی کتابیں مانگتی ہے۔ راوی چاہتا ہے کہ اب ایمانداری سے کتابیں پڑھ کر ان کے بارے میں میبل سے بحث کرے گا۔ اس لیے اس سے پوچھتا ہے کہ 'تم یہ کتابیں پڑھ چکی ہو' تو وہ جواب دیتی ہے:

''ہاں میں تو پڑھ چکی ہوں۔''

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پہلی دفعہ کھولا۔ تینوں میں سے کسی ایک کے بھی ورق تک نہ کٹے تھے۔ میبل نے بھی انھیں ابھی تک نہ پڑھا تھا۔

مجھے مرد اور عورت دونوں کی برابری میں کوئی شک باقی نہ رہا۔'' (پطرس کے مضامین، صفحہ 127)

'مرحوم کی یاد میں' کا شمار اردو مزاحیہ ادب کی بہترین تحریروں میں ہوتا ہے۔ راوی ایک موٹر کار لینا چاہتا ہے۔ وہ جب اپنے دوست مرزا سے اس خیال کا اظہار کرتا ہے تو وہ اسے موٹر کی بجائے سائیکل لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ بڑھا چڑھا کر سائیکل کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور راوی کو اپنے جال میں پھانس لیتا ہے۔ وہ اپنی ایک نہایت پرانی کھٹارا سائیکل اس کے گلے منڈھ دیتا ہے۔ راوی جو اپنی طبعی شرافت سے مجبور ہے، مرزا کی چال کو سمجھ نہیں پاتا اور چالیس روپے اس کی جیب میں رکھ دیتا ہے۔ سائیکل کا سودا کر کے اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہے۔ دل میں ارادہ کرتا ہے کہ اب شہر کے تمام تاریخی مقامات کی سیر کروں گا۔ صبح ہوا خوری کے لیے نہر تک جاؤں گا۔ شام کو 'میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤں گا۔'' لیکن جب سائیکل اس کے گھر آتی ہے تو اسے دیکھ کر راوی کے سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ وہ سائیکل اتنی پرانی ہے کہ عجائب گھر میں رکھنے کے قابل ہے۔ وہ رہٹ اور چرخہ سے بھی پہلے کی ایجاد معلوم ہوتی تھی۔ سائیکل کی سواری راوی کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔ وہ اس کی مرمت کرانے مستری کے پاس جاتا ہے تو وہ اس کی ہیئت دیکھ کر ہنستا ہے۔ اس کو ٹھیک کرنے کے لیے وہ چالیس روپے اور دس پندرہ دن کا وقت مانگتا ہے۔ تنگ آ کر اسے بیچنے کا ارادہ کرتا ہے تو تین روپے کی پیش کش کی جاتی ہے۔ راوی غصے میں وہاں سے چل پڑتا ہے۔ تھوڑی ہی دور جاتا ہے کہ سائیکل کا اگلا پہیہ نکل جاتا ہے اور وہ دھڑام سے زمین پر گر جاتا ہے۔ آس پاس بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ لوگ مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ راوی خاموشی سے سائیکل کے دونوں حصے اٹھاتا ہے اور چلتے چلتے دریا کے پل پر پہنچ جاتا ہے۔

''پل کے اوپر کھڑے ہو کر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کر کے اس بے پروائی کے ساتھ پھینک دیا جیسے کوئی لیٹر بکس میں خط ڈالتا ہے اور شہر روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔

مرزا بولے۔ ''اندر آ جاؤ۔''

میں نے کہا'' آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر میں وضو کیے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں۔''

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کر دیا جو انھوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا۔ اور کہا،

''مرزا صاحب! آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجیے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔''

(ایضاً، ص: 150)

اس مضمون میں راوی کا کردار جہاں ایک نہایت سادہ لوح اور معصوم انسان کا ہے وہیں مرزا ایسے عیار دوستوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنے دوستوں کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنے میں لگا رہتا ہے۔

'لاہور کا جغرافیہ' میں درسی کتابوں کی پیروڈی کی گئی ہے جو سالہا سال سے ایک ہی ڈھرے پر لکھی اور پڑھائی جا رہی ہے۔ اس میں لاہور کی بہت سی چیزوں پر بہت خوبصورت طنز بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً لاہور کی فضائی آلودگی، ٹوٹی سڑکیں، ہر عمارت پر مختلف قسم کے اشتہارات، رسالہ بازی اور انجمن سازی وغیرہ۔ لاہور کی پیداوار کے بارے میں پطرس نے لکھا ہے:

''لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبہ ہیں جو کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔''

(ایضاً، ص: 158)

انشائیہ 'کتے' نہ صرف پطرس بخاری کا بلکہ اردو میں طنز و مزاح کا ادبی شاہکار ہے۔ اس لیے یہ مکمل توجہ کا متقاضی ہے۔ اس میں شوخی، شگفتگی اور طنز و مزاح کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ پورے مضمون میں دلچسپی کا عنصر موجود ہے۔ اس میں نہ کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہے اور نہ کوئی ڈرامائی منظر پیش کیا گیا ہے اس کے باوجود پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری کی توجہ اور کشش میں کہیں کوئی کمی نہیں آتی۔ اس انشائیے کا آغاز جتنا پر کشش ہے اختتام بھی اتنا ہی دلچسپ ہے۔ چنانچہ آغاز میں وہ لکھتے ہیں:

''علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجیے دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجیے، دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے، کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا، ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھیے، کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔'' (ایضاً، ص: 67)

اس انشائیے کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پطرس نے کتوں کی حرکات و سکنات کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ کتے ہر اجنبی کو اور کوٹ پتلون پہنے ہوئے کو دیکھ کر بھونکنے لگ جاتے ہیں۔ بیچ سڑک پر لیٹ جانا' ہارن بجانے پر بھی نہ اٹھنا۔ دیسی اور امپورٹڈ کتوں کا فرق' بھونکنے میں دن اور رات میں کوئی تمیز نہ کرنا' بڑے کتوں اور چھوٹے کتوں کے بھونکنے میں فرق کو پطرس نے اس قدر دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ ان کی قوت مشاہدہ اور جزئیات نگاری کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔

'کتے' میں طنز کا نہایت بلیغ استعمال ہوا ہے۔ اس میں مشاعروں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جہاں شعرا سامعین کی داد' بیداد اور ہوٹنگ سے بے پروا کلام پر کلام سنائے جاتے ہیں۔ ایک بار مائک پر آ گئے تو پھر مائک چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ایک غزل' دوسری غزل' تیسری غزل' مختلف تمہیدوں کے ساتھ سناتے ہیں۔ اکثر کا کلام یوں ہی واجبی سا ہوتا ہے۔ سامعین خود پر جبر کرتے ہوئے ان کا کلام سننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کتوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بھی موقع و محل سے بے نیاز بھونکتے جاتے ہیں۔ اس موقعے پر کوئی ان کو ڈانٹے تو یہ چپ ہونے کا نام نہیں لیتے۔ وہ آگے لکھتے ہیں:

''ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ 'آرڈر آرڈر' پکارا لیکن کبھی ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی بھی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمھیں کوئی ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو

ستانا کون سی شرافت ہے۔'' (ایضاً،ص:68)

'آرڈر آرڈر' سے قاری کا ذہن فوراً عدالت کے کمرے کی طرف جاتا ہے جہاں خود وکیلوں کی نوک جھونک زیادہ بڑھ جاتی ہے تو جج کو آرڈر آرڈر کی آواز لگانی پڑتی ہے۔ عدالت میں توہینِ عدالت کی دفعہ لگ جانے کے خوف سے وکلا اور دیگر افراد خاموش ہو جاتے ہیں لیکن گلی محلے کے کتوں کو کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ بے تکان اور بلاخوف وخطر بھونکتے چلے جاتے ہیں۔

پطرس نے اس مضمون میں گلی کے آوارہ یعنی دیسی کتوں اور صاحب لوگوں کے بنگلوں پر رہنے والے ولایتی کتوں کا نہایت ہی دلچسپ موازنہ کیا ہے۔ دیسی کتوں کی بدتمیزی اور بداخلاقی اور ولایتی کتوں کی شائستگی کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی ہے کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جوں ہی ہم بنگلے کے اندر داخل ہوئے کتے نے برآمدے میں کھڑے کھڑے ہی ایک ہلکی سی 'بخ' کر دی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر 'بخ' کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ نہ راگ نہ سُر۔ نہ سر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں، بیتالے کہیں کے نہ موقع دیکھتے ہیں، نہ وقت پہچانتے ہیں، گل بازی کیے جاتے ہیں۔'' (ایضاً،ص:68)

پطرس نے 'کتے' میں ان نام نہاد قوم پرست لیڈروں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے جو محض انگریزی لباس دیکھ کر بھڑک اٹھتے ہیں اور لعن طعن کا شکار بناتے ہیں۔ پطرس کی مزاح نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ واحد متکلم کے صیغے میں بات کرتے ہیں اور اکثر خود کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ 'کتے' میں بھی وہ اپنی بزدلی کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ ''صاف چھپتے بھی نہیں' سامنے آتے بھی نہیں'' والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جتا رہے ہیں کہ وہ ڈرپوک نہیں ہیں لیکن انداز ایسا ہے کہ قاری کے لبوں پر تبسم کی کیفیت فطری طور پر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہیے کہ دافع بلیات ہے لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے کہ آپ اگر ہمیں اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک

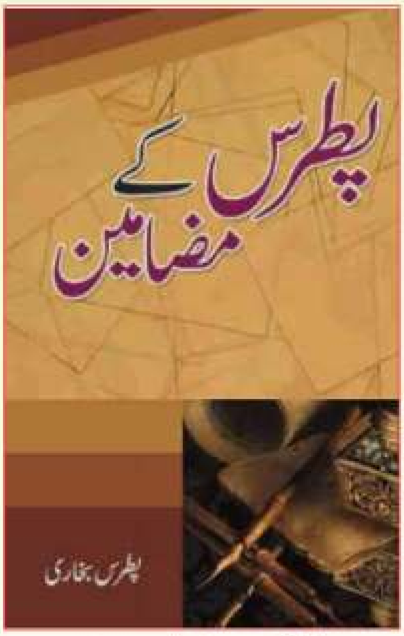

ہے ایسے موقع پر کبھی گانے کی کوشش کروں تو کھرج کے سُروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔ اگر آپ نے بھی ہم جیسی طبیعت پائی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ایسے موقع پر آیت الکرسی آپ کے ذہن سے اُتر جائے گی اس کی جگہ آپ شاید دعائے قنوت پڑھنے لگ جائیں۔'' (ایضاً،ص:69)

کتے کے یک بیک سامنے آجانے یا بھونکنے پر انسان کی جو ذہنی ونفسیاتی حالت ہوتی ہے اس کی حقیقی عکاسی پطرس کتے میں کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مشاہدہ کتنا گہرا ہے اور وہ مختلف چیزوں کو کتنا غور سے دیکھتے ہیں۔ یہی باریک بینی اور قوت مشاہدہ ہے کہ ان کی تحریریں پڑھ کر ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے ہی تجربات ومشاہدات کو پطرس نے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔

پطرس کتوں کے بھونکنے کی عادت کو متعدی مرض قرار دیتے ہیں انھیں اس بات پر شدید اعتراض ہے کہ بڑے کتے تو خیر چلیے ہو سکتا ہے کہ اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے بھونکتے ہوں لیکن یہ دو دو تین تین دن کے پلے بھی پوری قوت سے بھونکتے ہیں۔ ذرا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اگر کوئی بھاری بھرکم اسفندیار کتا کبھی کبھی اپنے رعب اور دبدبے کو قائم رکھنے کے لیے بھونک لے تو ہم بھی چار و ناچار کہہ دیں کہ بھئی بھونک۔ (اگرچہ ایسے وقت میں اس کو زنجیر سے بندھا ہونا چاہیے۔) لیکن یہ کم بخت دو روزہ، سہ روزہ، دو دو تین تین تولے کے پلے بھی تو بھونکنے سے باز نہیں آتے۔ باریک آواز ذرا سا پھیپھڑا اس پر بھی اتنا زور لگا کر بھونکتے ہیں کہ آواز کی لرزش دم تک پہنچتی ہے اور پھر بھونکتے ہیں چلتی موٹر کے سامنے آ آ کر گویا اسے روک ہی تو لیں گے۔'' (ایضاً،ص:70)

پطرس جہاں کتوں کی مختلف عادتوں سے ہمیں کہیں طنزیہ اور کہیں مزاحیہ انداز میں واقف کروا رہے ہیں وہیں مختلف قسم کے کتوں کے بارے میں بتا بھی رہے ہیں۔ انھیں میں سے کتے کی ایک قسم وہ ہے جو بیچ سڑک پر آنکھیں بند کیے لیٹے رہتے ہیں۔ وہ ہارن بجانے پر بھی نہیں ہٹتے اور کسی نے ایک آدھ چھڑی رسید کر دی تو بھی آہستہ سے اٹھ کر تھوڑی سی دوری پر جا کر لیٹ جاتے ہیں۔ پطرس ایسے کتوں کی تصویرکشی یوں کرتے ہیں:

''آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا، اس کے جسم میں تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں، جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور وفکر کے لیے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیو جانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا، گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا، لوگوں سے کہلوایا، خود دس بارہ دفعہ آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ صورت حال کو ایک نظر دیکھا، اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی، تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لیے وہ راستہ چھوڑ دینا فقیری کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔'' (ایضاً،ص:72-71)

مضمون نگار کتوں کی حرکتوں سے اس قدر نالاں اور بیزار ہے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ وہ کہتا ہے کہ:

''اگر خدا مجھے کچھ عرصے کے لیے اعلیٰ قسم کے بھونکنے اور کاٹنے کی طاقت عطا فرمائے، تو جنون انتقام میرے پاس کافی مقدار میں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کتے علاج کے لیے کسولی پہنچ جائیں۔'' (ایضاً،ص:73)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پطرس بخاری کے تمام مضامین کی زبان میں روانی' برجستگی' بے تکلفی' محاوروں میں تعریف' زبان کے چٹخارے' طنز کی نشتریت اور مزاح کی گدگدی کی بنا پر طنز و مزاح میں وہ ایک نمایاں اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

■

Dr. Zafar Gulzar
Directorate of Translation & Publications
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad -500032 (Telangana)

مزمل سرکھوت

ادبی تراجم کی روایت

(اردو سے مراٹھی اور مراٹھی سے اردو ترجموں کے حوالے سے)

دو مختلف قومیں دو مختلف تہذیبیں رکھتی ہیں۔ اسی طرح دو مختلف زبانیں بھی مختلف تہذیبی پہلوؤں سے مملو ہوتی ہیں۔ ہندوستان اپنے آپ میں ایک جہاں آباد کیے ہوئے ہے۔ یہاں متعدد قومیں اور زبانیں موجود ہیں۔ علاقوں میں بٹے ہوئے، خطوں میں بٹے ہوئے، ریاستوں میں بٹے ہوئے لوگوں نے اپنی زندگی کو آزادانہ طور پر جینا سیکھا ہے۔ یہ آزادانہ روش نہ صرف یہ کہ خود کی تفہیم میں مدد کرتی ہے بلکہ دوسروں کو سمجھنے کی وسعت بھی عطا کرتی ہے۔

اردو کا لسانی ڈھانچہ مختلف زبانوں کے اجزا سے مرکب ہے۔ زبان کی لسانی ساخت صرف ونحو اور لفظی و معنوی پہلوؤں سے مزین ہوتی ہے۔ اردو نے نہ صرف ان پہلوؤں کو سمیٹ لیا بلکہ اس نے ترجموں کی بھی ایک توانا روایت برقرار رکھی ہے۔ ہندوستان میں مختلف ادارے مختلف قوموں کو قریب کرنے اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی تحریکوں میں ترجموں کی اہمیت کو سمجھتے رہے ہیں اور اس میدان میں اپنی بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکیڈمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسے حکومتی ادارے اس کام میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ کوئی زبان صرف زبان نہیں ہوتی کہ اسے اس حد تک سمجھنا کافی ہو کہ یہ اس علاقے کی زبان ہے، وہ اُس علاقے کی زبان ہے۔ زبان جس علاقے کی ہوتی ہے وہ اس علاقے کی نمائندہ ہوتی ہے۔ ثقافتی وتہذیبی، ادبی و معاشرتی نیز کہیں کہیں تاریخی وجغرافیائی اثرات کی تشہیر میں زبان کو اہم جزو کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ مہاراشٹر میں علاقائی زبان مراٹھی کے بعد اردو سب سے زیادہ بولنے والی، سمجھنے والی اور تخلیقی سطح پر متحرک زبان ہے۔ یہاں اردو زبان کو مراٹھی زبان کے شانہ بہ شانہ ترقی کے مواقع میسر آئے ہیں۔

ترجمہ صرف ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام نہیں ہے یہ ایک مشکل کام ہے اور یہ گہرائی اور گیرائی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس میں کئی پہلوؤں پر نظر رکھنی لازمی ہوتی ہے۔ اصل زبان کا اسلوب، اس کا حسن، اس کے روز مرہ، اس کے محاورے، اس کی اصطلاحات، اس کی لفظی اور معنوی پرتیں، اس کی ہیئت، اس کی تہذیب ہر زاویہ سامنے ہونا ضروری ہے۔ ترجمہ ایک مشکل فن ہے۔ ترجمے کا میدان خود آگاہی کا میدان ہے۔ یہاں آکر ہمیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ آیا ہم اس قابل ہیں کہ شہسواری کر سکیں یا کسی اور میدان کا انتخاب بہتر ہوگا؟ اس قسم کی پیش بینی سے کام لیا جانا انتہائی ضروری ہے اگر اس میں کوتاہی ہوگئی تو پھر سوائے رسوائی کے اور کوئی انجام سامنے نہیں آئے گا۔

ترجمہ نگاری کے تعلق سے ماہرین میں اس بات پر اختلاف رہا ہے کہ کیا اصل زبان سے واقفیت مترجم کے لیے ضروری ہے؟ یا کسی تیسری زبان سے ترجمے کی سہولت دی جاسکتی ہے؟ یعنی اگر کوئی اردو داں جو مراٹھی زبان نہیں جانتا کیا وہ مراٹھی کی کسی تخلیق کا اردو میں ترجمہ کر سکتا ہے؟ یا وہ مراٹھی تخلیق کے ہندی یا انگریزی ترجمے کی مدد سے اردو ترجمہ کر سکتا ہے؟ ماہرین کا ایک طبقہ اس سہولت کے حق میں ہے اور دوسرا طبقہ اس کے خلاف نظریہ رکھتا ہے۔ اتفاق رکھنے والا طبقہ سخت گیری کا قائل نہیں ہے اور ترجمے میں حالات کے تحت سہل پسندی کی اجازت دیتا ہے۔ یعنی مترجم کسی اور مترجم کی تحریر کا ترجمہ کر سکتا ہے۔ مگر ماہرین کا دوسرا طبقہ اس قسم کی سہل پسندی کو پسند نہیں کرتا۔ مترجم کے لیے اصل اور جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے دونوں زبانوں پر عبور ہونا ضروری سمجھتا ہے۔ مترجم دونوں زبانوں میں مہارت رکھتا ہوتا کہ ترجمہ اصل کا عکس معلوم ہو، اصل کی اصطلاحات، اس کی تشبیہات، اس کے استعارات صحیح متبادلات کے ساتھ اور اصل مصنف کی منشا کے مطابق پیش کرے۔ ترجمے میں اصل زبان کا تاثر، اس کی نزاکتیں، اس کا حسن اور اس کی تہذیب قائم رہ سکے۔ ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ترجمہ میں کم از کم اصل متن کا مفہوم مکمل طور پر ادا ہو جائے۔

اردو زبان نے مہاراشٹر کی سرکاری زبان مراٹھی کے ادب سے کما حقہ استفادہ کیا ہے۔ مراٹھی کی تقریباً تمام اصناف ادب کے اردو میں تراجم ہوئے ہیں۔ مراٹھی ادب کی جس قدر تخلیقات اردو میں ترجمہ ہوئیں ہیں ان میں دلت ادب سر فہرست ہے۔ اس کی کہانیاں، اس کی نظمیں، اس کی غزلیں، اس کے ناول، اس کی خود نوشتیں، اس کے ڈرامے کافی تعداد میں اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں۔ ان کے مطالعے سے اس معاشرے کی تہذیبی وثقافتی صورت حال نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

دستیاب حقائق کی روشنی میں کسی مراٹھی تخلیق کا پہلا

اردو ترجمہ 'من سمجھاون' ہے، جو سرتھ رام داس کی طویل نظم 'مناچے شلوک' کا اردو روپ ہے۔ اردو کے ادیبوں نے اپنے تہذیبی ورثے کو ہمیشہ محفوظ رکھا بلکہ اس میں اضافہ ہی کرتے رہے ہیں۔ 'من سمجھاون' قریب 1750 کی تخلیق ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اردو اور مراٹھی کے درمیان مناسبت پیدا کرنے کے مواقعوں کا فائدہ اٹھایا ہے۔ صوفی شاعر شاہ تراب چشتی نے ہندو سنت رام داس کے اشلوکوں کو اردو میں ترجمہ کرکے اردو داں طبقہ کو ادبی اور ثقافتی رشتوں کی اہمیت سے واقف کرایا تھا۔ مگر شاہ تراب کا یہ کارنامہ کئی برسوں تک اردو کی بستی سے غائب تھا، اس کی بازیافت کا سہرا حیدرآباد کی محققہ سیدہ جعفر اور ممبئی میں پروفیسر عبدالستار دلوی کے سر بندھتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے 1960 کی دہائی میں 'من سمجھاون' کو جامع مقدموں کے ساتھ علاحدہ علاحدہ چھاپ دیا۔ یہ ایک بڑی خدمت تھی۔ شاہ تراب چشتی کے بعد مراٹھی تراجم کے حوالے سے اردو میں عرصے تک سناٹے کا ماحول رہا۔ طویل خاموشی کے بعد 19ویں صدی کے آخر میں مراٹھی کی معروف ادیبہ آنندی بائی جوشی کی خودنوشت سوانح حیات کا ترجمہ احمد علی خان شوق نے کیا۔ لکشمی بائی تلک کی تخلیق 'سرتی چتریں' کا ترجمہ ممبئی سے نکلنے والے رسالے 'دور حیات' میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ اس رسالے کے مدیر مظہر قیصر حسین تھے اور مراٹھی سے اردو میں ترجمہ مولانا مہر خاں شہاب مالیر کوٹلوی نے کیا تھا۔ ان کے سامنے اس کتاب کا مراٹھی اور انگریزی متن ہوتا تھا جس کی مدد سے وہ ترجمے کے مراحل طے کرتے جاتے تھے۔[1] ڈراما نگار، مکالمہ نگار اور غالب اکادمی ایوارڈ یافتہ جاوید صدیقی 'دور حیات' میں کام کرچکے ہیں۔ میں نے ان سے اس ترجمہ کی بابت پوچھا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی کہ "یہ ترجمہ تسلسل کے ساتھ رسالے میں شائع ہوتا رہا ہے اور میرے پاس کچھ پرانی فائلیں محفوظ ہیں۔ چیک کرکے بتاتا ہوں۔" کچھ دنوں بعد انھوں نے بتایا کہ "محفوظ فائلوں میں وہ ترجمہ نہیں ہے۔"

آزادی کے بعد مہاراشٹر میں اردو اور مراٹھی کے آدان پردان میں کافی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ کوکن کے کئی شعرا و ادبا نے اس جانب پہل کی ہے۔ یہاں کے نمایاں ناموں میں جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے پروفیسر عبدالستار دلوی کا۔ انھوں نے 60ء کے دہے میں 'من سمجھاون' کو از سر نو ترتیب دیا، یہ نادر و نایاب نسخہ انھیں جامع مسجد ممبئی کے قدیم مخطوطات میں ملا تھا۔ دلوی صاحب اس کے بعد بھی مراٹھی سے اردو میں تراجم کرتے رہے ہیں۔ مراٹھی کے ادیبوں اور ان کی تخلیقات سے اردو داں طبقے کو واقف کراتے رہے ہیں۔ انھوں نے مراٹھی کے مستند مصنف پرشوتم شیو رام رینگے کے دو ناولٹ 'اولوکتا' اور 'ساوتری' کے اردو میں ترجمے کیے ہیں۔ مزید یہ کہ وشرام بیڈیکر کے ایک یادگار ناول 'رن آنگن' کا بھی اردو ترجمہ کیا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے مراٹھی کی دوسری اصناف (ڈراما اور شاعری) کے شاہ کاروں کو بھی اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ مراٹھی ادب کی نمایاں شخصیات میں شامل رام گنیش گڈکری، پنڈت ستیہ مادھوراو پگڑی، وسنت سکھارام کھانڈیکر، وشنو وامن شرواڈکر عرف کسماگرج اور دیگر کی ادبی خدمات کا دلوی صاحب نے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے جیونت دلوی کے مایہ ناز ڈرامے 'بیرسٹر' کا بھی ترجمہ کیا، ساتھ ہی انھوں نے وجے تینڈولکر کے ایک مشہور ڈرامے 'خاموش! عدالت جاری ہے' کا ترجمہ بھی کیا ہے (یہ ابھی غیر مطبوعہ ہے)۔ مراٹھی اردو ادبی خدمات کے لیے عبدالستار دلوی کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے اعلیٰ اعزاز سے سرفراز کیا ہے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی کے علاوہ کوکن کے بدیع الزماں خاور، پروفیسر یونس اگاسکر، یعقوب راہی، نور پرکار، محمد حسین پرکار، انجم عباسی، وقار قادری، خالد اگاسکر وغیرہ قلم کاروں نے مترجم کا کردار بخوبی ادا کیا ہے۔ بدیع الزماں خاور نے نہ صرف مراٹھی شاعری کے اردو میں ترجمے کیے بلکہ انھوں نے خود بھی مراٹھی میں شاعری کرکے اس میں اپنی شناخت قائم کی ہے۔ وہ ذولسانی شاعر تھے۔ انھوں نے اردو میں بھی طبع زاد شاعری کی ہے۔ اردو شاعری کے ان کے نو مجموعے شائع ہوچکے ہیں (حروف، میرا وطن ہندوستان، بیاض، امرائی، لفظوں کا پیرہن، سات سمندر، ننھی کتاب، موتی پھول ستارے، سبزہ و تازہ نہالوں کے انبوہ میں)، مراٹھی کے تین شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں (غزلات رنگ مازھا، ماجھیا غزلا مراٹھی، چار ماجھی اکشرے) اور مراٹھی شاعری کے اردو ترجموں کے پانچ مجموعے شائع ہوچکے ہیں (خوشبو، سنگل، دینار، مراٹھی رنگ، نیلے پہاڑ کی نظمیں)۔ اردو اور مراٹھی کے درمیان تعلقات کی ادبی رو کو خاور نے تیز تر کردیا تھا۔ ان کی ایک نثری تصنیف بھی اس سلسلے میں یادگار کی حیثیت رکھتی ہے جو مراٹھی ادب کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ان کی یہ کتاب 'مہاراشٹر کی تہذیبی اور ادبی قدریں' ہے۔ خاور کے مراٹھی شاعری کے اردو تراجم پر یعقوب راہی کی یہ رائے درست لگتی ہے کہ

"جہاں تک بدیع الزماں خاور کے مراٹھی شاعری کے اردو تراجم کا معاملہ ہے اس حقیقت کا اظہار بغیر کسی تردد کے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف سب سے زیادہ مربوط و مبسوط اور معتبر و مستند کام کیا ہے بلکہ مراٹھی شاعری کے قریب قریب تمام ادوار (قدیم و جدید سنت کاویہ سے آدھونک کاویہ تک) اور اس کے متنوع رجحانات و میلانات کی ترجمانی کرنے والی منتخب شعری تخلیقات کے حسب تقاضا و ضرورت مردّف مقفّی، آزاد اور معریٰ نیز نثری اردو تراجم اس خوبی کے ساتھ کیے ہیں کہ وہ محض ان تراجم کے لیے بھی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔"[2]

پروفیسر یونس اگاسکر تراجم کی تمدنی زنجیر سے جڑے ہوئے ہیں جس نے اردو اور مراٹھی کو آپس میں ملا دیا ہے۔ ان کا رسالہ 'ترسیل' مراٹھی تخلیقات کے اردو تراجم کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتا رہا ہے۔ وہ خود بھی مراٹھی کی مختلف اصناف کے ترجمے کرچکے ہیں۔ انھوں نے مراٹھی افسانے، ڈرامے، نظموں سے کیے ہیں۔ ان کی تصنیف 'مراٹھی ادب کا مطالعہ' اردو داں قارئین کے لیے مراٹھی زبان و ادب سے واقفیت کا پہلا زینہ ثابت ہوئی ہے۔ یونس اگاسکر نے اپنے ترجمہ کیے ہوئے مراٹھی افسانوں کا ایک انتخاب 'بے چہرہ شام' کے نام سے شائع کیا ہے۔ انھوں نے کئی مراٹھی شعرا کی تخلیقات کو اردو میں ڈھالا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے مراٹھی ڈراموں کے کامیاب ترجمے کیے ہیں۔ وی واشرواڈکر کے مقبول عام ڈرامے 'نٹ سمراٹ' کے ترجمے نے انھیں کافی مشہور کردیا تھا۔ یہ شاہکار ڈراما نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کیا۔

یعقوب راہی اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ انھوں نے مراٹھی کی شعری اصناف ہی کے تراجم پر اپنی توجہ مبذول رکھی۔ 'دلت آواز' مراٹھی کی منتخب دلت نظموں کے تراجم کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں 32 دلت شاعروں کی تخلیقات کو یعقوب راہی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ نور پرکار کے بڑے بھائی محمد حسین پرکار بھی اردو کے ساتھ ساتھ مراٹھی ادب سے شغف رکھتے ہیں۔ وہ ترجمے کی تہذیبی اہمیت سے واقف ہیں۔ انھوں نے مراٹھی اور اردو کی ادبی اور تہذیبی ڈور کو مضبوطی عطا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے مراٹھی شاعری کے ترجمے کیے، خاکوں کے ترجمے کیے، ڈراموں کے ترجمے کیے ہیں۔ آزادی کی علامت سمجھی جانے والی جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی زندگی پر لکھا گیا وی واشرواڈکر کا ڈراما 'ویر مھنالی دھرتی لا' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ انجم عباسی اردو ادب میں شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ تاہم انھوں نے مراٹھی افسانے،

خودنوشت اور شاعری کے اردو میں تراجم کیے ہیں۔ وقار قادری اس سلسلے میں ہرفن مولا کا کردار ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے مراٹھی شاعری، مراٹھی افسانے، مراٹھی ڈرامے، مراٹھی خودنوشتیں اور مراٹھی تھیٹر سے وابستہ کئی تحریریں اردو ادب میں اضافہ کی ہیں۔ مراٹھی زبان کی جس قدر تحریریں اردو میں ترجمہ ہوئیں ہیں وقار قادری نے ان میں اپنا نمایاں مقام بنایا ہے۔ ان کا شمار صف اول کے ترجمہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا قلم ہمیشہ جاری وساری ہے۔ انھوں نے مراٹھی میں بچوں کے ادب سے بھی اردو میں کچھ تحریریں ترجمہ کیں ہیں۔ خالد اگاسکر مراٹھی کے افسانوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کا ایک افسانوی مجموعہ مراٹھی کے افسانوں کے ترجموں پر مشتمل ہے اور 'کتھا' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس پر مہاراشٹر اسٹیٹ ساہتیہ اکادمی نے ترجمہ ایوارڈ سے انھیں نوازا۔ ساتھ ہی انھوں نے مراٹھی شاعری کو بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

نور پرکار اردو میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ تاہم ان کی دلچسپی مراٹھی کی مختلف اصناف میں رہی ہے۔ انھوں نے مراٹھی ڈراموں اور افسانوں کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے لکھنو سے نکلنے والے رسالے 'کتاب' کا ایک خاص شمارہ 'مراٹھی کہانی نمبر' مرتب کیا۔ یہ شمارہ جون 1968 میں منظر عام پر آیا تھا۔ آزادی کے بعد یہ پہلا ایسا منظم کام تھا جو مراٹھی کی کسی خاص صنف کو لے کر اردو میں کیا گیا تھا۔ اس خصوصی شمارے میں عبدالستار دلوی صاحب نے مراٹھی ادب کا مطالعہ، پروفیسر کیشو میشرام نے مراٹھی کے بدلتے ادبی رجحانات، پردیپ نیرور کرنے مراٹھی افسانہ اور کماری وجیا سالوی نے مراٹھی ڈرامے کا روپ عنوانات سے فکر انگیز مقالات لکھے جو شمارے میں شامل ہیں۔ 'کتاب' کے اس خاص نمبر میں مراٹھی کی 20 کہانیاں شامل ہیں اور تمام کہانیوں کے ترجمے نور پرکار نے کیے ہیں اور یہ کافی کامیاب ترجمے ہیں۔ اردوداں حلقے میں مراٹھی ادب کی تفہیم کی یہ پہلی کوشش تھی جس میں مراٹھی زبان وادب، افسانہ اور ڈرامے کا بھرپور تعارف پیش کیا گیا ہے۔ نور پرکار کی کتاب 'صبا آوارہ' میں 6 یک بابی ڈراموں کے ترجمے شامل ہیں۔ نور پرکار کی علاقائی زبان کوکنی ہے جس میں اردو اور مراٹھی الفاظ کا استعمال ہوتا ہے، یعنی نور صاحب کو دونوں زبانوں کی قربت حاصل ہے۔ یہ ان کی دلچسپی ہی کا مظہر ہے کہ انھوں نے افسانہ نویسی اور اس کے ترجموں کی جانب توجہ مبذول کی، اسی طرح یہ بھی ان کی دلچسپی ہی کا ثبوت ہے کہ انھوں نے مراٹھی کی معروف صنف ڈراما کی جانب التفات کیا اور اس کی چیدہ تخلیقات کو اخذ، اضافہ، تلخیص و ترجمے کے ذریعے اردو میں ڈھالا۔ 'صبا آوارہ' نور پرکار کی اردو ادب کو پہلی ایسی دین ہے جو مراٹھی ڈراموں کے تراجم سے مالامال ہے۔ دسمبر 1978 میں نیو پبلک پریس دہلی سے مطبوعہ اس کتاب میں اننت کانیکر، گنگا دھر گاڈگل، وجے تینڈولکر، رتنا کر متکری، وسودھا پاٹل اور پ گ سروے جیسے مراٹھی ڈراموں کے نامور قلم کاروں کے ڈراموں کی کامیاب تفہیم کی گئی ہے۔

مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے اپنی ابتدا سے اب تک مراٹھی کی کئی تخلیقات کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کی کئی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری اردو اور مراٹھی کو ادبی اور تہذیبی سطح پر ایک دوسرے کے قریب لانا ہے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی خاطر اکادمی نے کئی عملی اقدام بھی کیے ہیں۔ اوپر جو نام گزرے ہیں ان کی کئی تخلیقات کو شائع کرنے کا اہم کام اکادمی نے انجام دیا ہے۔ اکادمی کا سہ ماہی رسالہ 'امکان' اس سلسلے میں نہایت مددگار واقع ہوا ہے۔ 'عصری مراٹھی ادب کا انتخاب' کے متعدد اشاعتی سلسلوں میں نظموں، غزلوں اور افسانوں کے اردو تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ 'دلت آپ بیتیاں' خصوصی اشاعت بھی سہ ماہی 'امکان' نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ 'امکان' نے ڈراموں کی جانب بھی التفات کیا ہے۔ دو خصوصی مراٹھی ڈراما نمبروں کی اشاعت اس کا اہم کارنامہ ہے۔ درج بالا ترجمہ نگاروں کے علاوہ مزید کئی نام اس رسالے کے توسط سے اس تہذیبی زنجیر کا حصہ بنے ہیں۔ جن میں عصمت جاوید، سلام بن رزاق، ارتکاز افضل، قاضی سلیم، نورالعین علی، ڈاکٹر رام پنڈت، امان اختر، جینت پرمار، ارتضی نشاط، ڈاکٹر محمد صادق، معراج الدین قاضی، سید یحیی نشیط، قاسم ندیم، خالد آرائی، معین الدین عثمانی، م ناگ، شاہد ندیم، محمد اسداللہ، اسلم پرویز، شیخ عثمان ملکا پوری، قاسم امام، میمونہ دلوی، مسرت بانو ابراہیم شیخ وغیرہ کئی نام ہیں جنھوں نے تراجم کی دنیا میں شہرت حاصل کی۔ رسالہ 'امکان' ایک پلیٹ فارم کی طرح استعمال ہوتا رہا ہے جس نے تراجم کی صورت مراٹھی کی شہرت یافتہ تخلیقات کو اردوداں طبقے میں روشناس کرایا۔ رسالہ 'امکان' کے علاوہ 'شاعر' (ممبئی)، 'ترسیل' (ممبئی)، 'نیا ورق' (ممبئی)، 'تکمیل' (بھیونڈی)، 'اسباق' (پونے) جیسے رسالوں نے اردوداں حلقے کو مراٹھی کے ادب سے روشناس کرنے کی اہم ذمہ داری ادا کی ہے۔

سلام بن رزاق بنیادی طور پر اردو کے ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے یوں تو مراٹھی کی کئی اصناف کی تخلیقات کا اردو ترجمہ کیا ہے، جن میں شاعری اور ڈراما کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، مگر جسے ان کا کارنامہ کہا جا سکتا ہے وہ ان کے جی اے کلکرنی کے مشکل ترین افسانوں کا کامیاب اردو ترجمہ ہے۔ 'جی اے کلکرنی کی کہانیاں' نام سے منظر عام پر آنے والے ان کے اہم کام نے اردو ادب کو انتظار حسین کے موضوع اور طرز تحریر کی مشابہت سے روبرو کرایا۔ جی اے کلکرنی مراٹھی ادب میں وقت پسند ادیب سمجھے جاتے ہیں اور ان کی تحریریں ماضی کے دھندلکوں اور اسطوری اصطلاحات سے سفر کرتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچتی ہیں، اردو میں یہی اسلوب مستند ناول اور افسانہ نگار انتظار حسین کا ہے۔ سلام بن رزاق نے رسالہ 'امکان' کے لیے مراٹھی کی کئی نظموں کے ترجمے کیے ہیں اسی طرح انھوں نے اس رسالے کے لیے مراٹھی کے ڈرامے اور افسانے بھی اردو میں ترجمہ کیے ہیں۔ ان کے نام مراٹھی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھنے والے مدھو منگیش کرنک کے ناول 'ماہم کی کھاڑی' کا اردو ترجمہ بھی ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید زبان کی باریکیوں پر نگاہ رکھنے والے ادیب تھے۔ انھیں لسانیات میں خاصا درک حاصل تھا۔ انھوں نے بھی معروف مراٹھی ادب میں غزل کو متعارف کرنے والے شاعر سریش بھٹ کی ایک مشہور مراٹھی نعت کا ترجمہ کیا ہے، جس کی کافی پذیرائی ہوئی تھی۔ مراٹھی کے سلسلے میں ان کی ایک درسی قسم کی کتاب 'مراٹھی آموز' بھی بہت پسند کی گئی ہے۔

ہندوستانی موسیقی کا شمار دنیا کے افق پر ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ دنیا نے یہاں سے سرود، سارنگی، طبلہ اور دیگر فنون موسیقی سیکھے۔ ازمنہ قدیم سے یہاں موسیقی کا رواج رہا ہے۔ حسین اتفاق یہ ہے کہ یہاں کے حکمرانوں نے بھی ہر دور میں موسیقی اور موسیقاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ موسیقی ہندوستان کی تہذیبی زندگی کا نشان ہے۔ اردو کے ادیبوں نے بھی اس تہذیبی علامت سے جڑنے کی کوششیں کیں ہیں۔ ایسی ہی ایک کوشش کی ہے دستگیر شہاب نے۔ فن موسیقی اور موسیقاروں کے ضمن میں بی آر دیودھر کی مراٹھی کتاب 'تھور سنگیت کار' کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے 1981 میں شائع کیا۔ اس کتاب میں کل 21 مغنیوں اور موسیقاروں کے قلمی خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں پنڈت بال کرشن بوا، پنڈت بھاسکر، پنڈت وشنو دگمبر ہیں تو خان صاحب اللہ دیا خان، خانصاحب بندو خاں اور خانصاحب بڑے غلام علی وغیرہ کے بھی خاکے دلچسپ اور سادہ زبان میں ترجمہ کیے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر رام پنڈت اردو اور مراٹھی ادب اور ادبا کے درمیان ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے متعدد مراٹھی تخلیقات کو اردو میں ترجمہ کیا اسی طرح کئی اردو شہ پاروں کا مراٹھی ترجمہ بھی کیا۔ وہ آج بھی مترجم کا کردار بخوبی نبھا رہے ہیں اور نئے لکھنے والوں کی مسلسل حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ قاسم ندیم درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ انھیں بھی مراٹھی اصناف ادب سے یک گونہ لگاؤ ہے اور وہ ان کے ترجمے کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر مراٹھی کے افسانوں پر اپنی توجہ مبذول کی ہے اور انھیں ترجمے کی صورت میں اردو میں ڈھال رہے ہیں۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور دو زبانوں کے رشتوں میں مضبوطی اور پختگی پیدا کرنے کی ایک دانستہ کوشش ہے، جسے سراہنا چاہیے۔ ان کا یہ کام ذاتی دلچسپی اور ذاتی پسند کی وجہ سے زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ ان کا شوق انھیں مراٹھی کی کہانیوں کے ترجمے کرنے پر اکساتا ہے۔ معین الدین عثمانی نے بھی 'صورت حال' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ مراٹھی کی چنندہ کہانیوں پر مبنی ہے۔ انھوں نے رسالہ 'امکان' کے لیے بھی مراٹھی کی کچھ تخلیقات کو اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

بابا صاحب امبیڈکر کی صد سالہ تقریب کے موقع پر رسالہ 'امکان' نے 'دلت آپ بیتیوں کی خصوصی اشاعت' کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں خود ڈاکٹر امبیڈکر کے علاوہ مراٹھی کے کئی مشہور دلت ادیبوں کی خود نوشتوں کے اردو ترجمے شائع کیے تھے۔ ان خود نوشتوں کی اشاعت نے دلت معاشرے میں فرد کی جدوجہد کو واضح کر دیا ہے۔ وقار قادری، انجم عباسی اور دوسرے کئی مترجمین نے اس اشاعت میں اپنا تعاون پیش کیا۔ وقار قادری نے مراٹھی کے دلت شاعر نام دیو ڈھسال کی زوجہ ملکہ امر شیخ کی خود نوشت 'مجھے منظور ہے اپنی تباہی' کے کچھ حصے ترجمہ کیے اور وہ سہ ماہی 'ترسیل' (ممبئی) میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہزاروں اپاہجوں کے لیے مسیحا کے روپ میں ابھرنے والی مگر خود بھی اسی اذیت میں گرفتار، ہمت وحوصلے کی علامت، جہدِ مسلسل اور پیہم عمل کی محرک محترمہ نسیمہ ہرزک نے اپنی داستان حیات مراٹھی زبان میں روزنامہ 'نواکال' کے لیے سلسلہ وار لکھی۔ یہ داستان کتابی شکل میں جب منظر عام پر آئی تو اس کا نام 'چاکا چی کھرچی' تھا۔ نسیمہ ہرزک کولہاپور سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھیں متعدد ملکی اور غیر ملکی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ ان کی سوانح حیات یقیناً ہر نفس کے لیے قابل تقلید اور قابل تحریک ہے۔ وہ خود اپاہج ہیں، برسوں سے وہیل چیئر کی محتاج ہیں مگر ان کی ہمت اور ان کے ولولے اور کچھ کر گزرنے کے جنون نے ان میں صحت مندوں سے زیادہ طاقت بھر دی ہے۔ کولہاپور میں انھوں نے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جس میں اپاہجوں کے لیے دنیا کی ساری رونقیں جمع کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ ان کے لیے تعلیم کا انتظام، ملازمت کا انتظام اور سب سے اہم ان میں اس احساس کی بیداری کہ وہ صحت مندوں سے کسی طور کم نہیں ہیں۔ نہایت ہی قابل ستائش ہے۔ سچ ہے انھوں نے وہ کام کر دکھایا جو صحت مند آدمی بھی معاشرے کے لیے شاید کر سکے۔ ان کی سوانح حیات دنیا کی ہر زبان میں ترجمہ ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر انیس رشید خان صاحب نے اردو قارئین کے لیے یہ سہولت پیدا کر دی۔ اس کتاب کو جو بازار میں 'ستاروں سے آگے' کے نام سے دستیاب ہے، دہلی کے فیروس میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ نے 2011 میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر انیس رشید خان کے ترجمے کی زبان آسان اور سادہ ہے۔ ناسک کے نند کشور فاؤنڈیشن نے عالمی شہرت یافتہ مراٹھی ڈراما نگار اور شاعر وی وا شرواڈکر کی زندگی اور ادبی کارناموں پر مبنی ایک کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے، 'کتنا حسین سفر تھا' کو سید جاوید علی آغاز نے اردو لباس عطا کیا ہے۔ سماجی کارکن اور مراٹھی زبان کی مستند ادیبہ محترمہ سنیتا ارلیکر کی جد جہد سے بھرپور زندگی کی کہانی خود ان کے قلم سے مراٹھی میں شائع ہوئی ہے، ملک اکبر صاحب نے اس خود نوشت سوانح حیات کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس اردو کتاب کا نام 'داستان ہرنی کی' ہے۔ مشہور ماہرِ معاشیات، ریزرو بینک آف انڈیا کے پرنسپل ایڈوائزر اور چیف اکنامسٹ، معروف دلت قلم کار ڈاکٹر نریندر جادھو کی انگریزی اور مراٹھی میں شہرت کی بلندیاں چھونے والی خود نوشت سوانح حیات کا اردو ترجمہ ممتاز اردو شاعرہ اور 'شگفتہ سحر' اور 'شہیرہ' جیسے شعری مجموعوں کی خالق ممتاز نکہت نے 'سونو' کے نام سے کیا ہے۔ اسے ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، ممبئی نے 2005 میں شائع کیا۔

وودربھ کے مشہور انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے 'جمال ہم نشیں' اور 'دانت ہمارے ہونٹ تمہارے' کتابیں تصنیف کیں ہیں جن میں مراٹھی کے کئی مزاح نگاروں کی تخلیقات کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ محمد اسد اللہ اردو اور مراٹھی زبان کے تہذیبی اور ادبی روابط کو مضبوطی عطا کرنے میں اپنا کردار بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ وہ مستقل کام کرتے رہے ہیں۔ وودربھ ہی کے ایک مدرس جو ممبئی میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے اور ابھی سبکدوش ہو چکے ہیں عثمان ملکاپوری ہیں۔ انھوں نے بھی مراٹھی کے ایوارڈ یافتہ ڈراموں کے ترجمے کیے اور انھیں 'ٹیکس فری' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کتاب پر انھیں مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے انعام سے نوازا۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے میں تدریسی شعبے سے وابستہ اور اردو ادب میں شاعری کی حیثیت سے مقبول ڈاکٹر قاسم امام نے 'مراٹھی کے عصری ڈرامے' تصنیف کی جس میں انھوں نے مراٹھی کے چنندہ ڈراموں کے تراجم پیش کیے ہیں۔ اس طرح وہ بھی اس ادبی اور تہذیبی زنجیر میں جڑ گئے ہیں جس نے اردو مراٹھی کو آپس میں ملا دیا ہے۔ میمونہ دلوی، نورالعین علی، مسرت بانو ابراہیم شیخ، شیریں دلوی جیسی اردو کی خواتین قلمکاروں نے بھی مراٹھی کی چیدہ تخلیقات کو اردو میں ترجمہ کرنے کا فریضہ ادا کیا ہے۔ اسلم پرویز ڈراما اور تھیٹر سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف مراٹھی کے شہ کاروں کو اردو ترجمے کی صورت اردو ادب میں شامل کیا بلکہ بذات خود مراٹھی کے اسٹیج سے اپنے آپ کو منسلک کر لیا ہے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ وجے تینڈولکر کے ڈرامے 'کملا' کا اردو ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق دلی کے ہیں مگر انھیں مراٹھی کی مختلف اصناف کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہے اور وہ ڈرامے اور نظمیں شوق سے ترجمہ کرتے ہیں۔ انھوں نے 1980 میں 'نئی مراٹھی شاعری' کے نام سے مراٹھی شاعری کے اردو تراجم کا ایک مجموعہ شائع کیا۔ جسے نئی دہلی کے معیار پبلی کیشنز نے طبع کیا۔ اس مجموعے میں مراٹھی کے بارہ نامور شاعروں کی نظموں کے ترجمے شامل ہیں۔ ڈاکٹر صادق نے وجے تینڈولکر کا ایک شاہکار سرسوتی انعام یافتہ ڈراما 'کنیا دان' کا ترجمہ بھی کیا ہے جسے انھوں نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اورنگ آباد کے خلیل مظفر نے رام گنیش گڈکری کے مشہور عالم ڈرامے 'ایکچ پیالا' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مراٹھی سے اردو ترجمے کے تعلق سے مزید ناموں میں اقبال نیازی، آفتاب حسنین، مجیب خان، خالد آرائی، شاہد ندیم وغیرہ شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ممبئی سے تقریباً نصف صدی سے نکلنے والے رسالے ''نقشِ کوکن'' کی جلد 28، شمارہ 5 مئی 1990 کے ماہنامہ خصوصی 'مہاراشٹر نمبر' تھا جس میں بدیع الزماں خاور، دیوندر ستیارتھی، معین الدین جینابڑے، وقار قادری نے مراٹھی ادب کے کسی نہ کسی گوشے سے اردو قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ لب لباب یہ کہ اردو بستی کے باسیوں کو مراٹھی کے ادب اور اس کی ثقافت سے یک گونہ دلچسپی رہی ہے اور وہ اسے جاننے اور اس سے اردو قارئین کو متعارف کرانا اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

جس طرح اردو زبان میں مراٹھی ادب کی تخلیقات

ترجمہ ہوتی رہی ہیں، اسی طرح مراٹھی میں اردو ادب کے تراجم کا سلسلہ بھی خاصا روشن ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں غیر ملکی زبانوں کی تخلیقات کو ملکی جامہ زیب تن کیا جا رہا تھا۔ یہاں اردو اور ہندی میں کئی داستانیں ترجمہ ہوئیں ہیں۔ حیدر بخش حیدری اس کالج سے وابستہ مترجمین میں شامل تھے۔ انھوں نے ایک قدیم داستان کو 'آرائشِ محفل' کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کا مراٹھی ترجمہ ستارا کے راجا شری پرتاپ سنگھ نے ادبی دلچسپی کی خاطر اپنے عہد کے ادیب شری مادھو راو منشی سے اختصار کے ساتھ 'سبھا رنجنی' کے نام سے کرایا۔ [3] عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے اسکالر، نامور ادیب اور مورخ سیتو مادھوراو پگڑی مراٹھی اور اردو ادب پر یکساں عبور رکھتے تھے، وہ سنسکرت اور فارسی کے بھی جید عالم تھے۔ انھوں نے اردو اور مراٹھی زبانوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں ہمیشہ پہل کی ہے۔ مراٹھی ادب میں انھیں ایک نقاد اور محقق کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ کافی عرصہ ممبئی میں گزار چکے ہیں۔ مرزا غالب کو مراٹھی داں حلقے میں متعارف کروانے والے پگڑی صاحب تھے۔ انھوں نے مرزا غالب کے کلام کی مراٹھی زبان میں آسان تشریح کی ہے۔ انھوں نے 'دیوانِ غالب' کا مراٹھی ترجمہ 1958 میں کیا، جس میں 44 صفحات کا ایک تفصیلی مقدمہ بھی شامل تھا۔ علامہ اقبال کے تعارف کی ذمہ داری بھی انھوں نے ادا کی ہے۔ انھوں نے 'بانگِ درا' کا مراٹھی میں ترجمہ کیا۔ مراٹھی روزنامہ 'لوک ستا' کا شروع سے ہی رویہ رہا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اردو کی تخلیقات کو یا ادیبوں اور شاعروں کے حالاتِ زندگی کو مراٹھی قارئین کے لیے پیش کرتا رہا ہے۔ پگڑی صاحب نے بھی یہ ذمہ داری سرانجام دی ہے کہ 'لوک ستا' میں اردو کے ادیبوں اور شاعروں پر سلسلہ وار مضامین لکھے ہیں۔ 'لوک ستا' اخبار کی روایت کو دوسرے کثیرالاشاعت مراٹھی روزنامے 'لوک مت' نے بھی زندہ رکھا ہے۔ اس اخبار کے ہفتہ واری کالم 'ہنتک' میں پردیپ نفاڈ کرنے قدیم و جدید اردو شعرا کی حیات اور ان کے فن کو اختصار کے ساتھ نذرِ قارئین کیا ہے۔ پردیپ نے میر، ظفر، غالب سے لے کر کیفی تک کے شعرا کی حیات کے ساتھ ساتھ ان کے چنندہ اشعار کی تفہیم بھی کی ہے جو مطالعے سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے مراٹھی قارئین کے لیے ان شعرا کو پڑھنا آسان بنا دیا ہے۔ پگڑی صاحب نے 'مہاراشٹر ٹائمس' جیسے مراٹھی کے بڑے اخبار میں بھی اردو ادب کی جھلکیاں پیش کرتے رہے ہیں۔ سیتو مادھوراو پگڑی کی مراٹھی کی تمام ادبی تحریروں کو حیدرآباد کی تنظیم 'مراٹھی ساہتیہ پریشد' نے پانچ ضخیم جلدوں میں حکومت مہاراشٹر کے مالی تعاون سے 2010 میں شائع کیا ہے۔ تقریباً دو ہزار صفحات پر مبنی پانچویں جلد کو الف اور ب کر کے دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان دو ہزار صفحات میں پگڑی صاحب کے اردو کے متعلق کام کو شامل کیا گیا ہے۔ جس کی ترتیب شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی کے پہلے صدر اور پروفیسر عبدالستار دلوی نے کی ہے۔ اس کام کی تحریک 'مراٹھی ساہتیہ پریشد' کے اراکین کو دلوی صاحب کی کوششوں سے حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں منعقد ایک سمینار سے ملی۔ یہ سمینار دو روزہ تھا جس کا اہتمام یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے کیا تھا۔ اس کا عنوان سیتو مادھوراو پگڑی اور ان کے ادبی کارنامے تھا۔ عبدالستار دلوی صاحب سیتو مادھوراو پگڑی صاحب کے قریب رہے ہیں اور ان کی علم دوستی کے آج بھی معترف ہیں۔ سیتو مادھوراو پگڑی کے بعد مراٹھی ادیب ودیا دھر گوکھلے نے 'مہاکوی غالب' لکھی جس میں غالب کی حیات، شخصیت، فلسفہ و فکر اور فن کا بھرپور احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اندو متی شیورے نے غالب پر ایک سوانحی ناول تصنیف کیا ہے، اس کا نام 'کتھا ایک شاعراچی' ہے۔ ناسک کے وسنت پوتدار نے غالب کی دو سو سالہ سالگرہ کے موقع پر یعنی 1997 میں 'عجب آزاد مرد: مرزا غالب' کتاب لکھی۔ غالب پر مراٹھی میں کافی لکھا گیا ہے۔ ان کی شخصیت، ان کی شاعری، ان کا فلسفہ، ان کا فن، ان کے خطوط پر بھی مضامین لکھے گئے ہیں۔ حیدرآباد سے نکلنے والا مراٹھی رسالہ 'پنچ دھارا' کا غالب کے خطوط نمبر کا خاص شمارہ پی جوشی کا اہم کارنامہ ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے لیے شری پاد جوشی نے قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کا ترجمہ کیا، 'کتھا بھارتی' کے نام سے اردو کے مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کے مراٹھی تراجم کیے۔ منٹو کی کہانیوں کے تراجم پر مشتمل ان کا ایک مجموعہ 'منٹو چا کتھا' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پروفیسر رابھ جوشی کی دلچسپی کا محور اردو ناول اور افسانے رہے ہیں۔ انھوں نے 'میلاد شریف' میں مرد افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو مراٹھی میں منتقل کیا اور انولکھی واٹا (ان دیکھی راہیں) کے نام سے جوشی صاحب نے اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں کو مراٹھی میں ترجمہ کیا۔ کرشن چندر کے مشہور ناول 'شکست' کا ترجمہ بھی جوشی صاحب نے کیا ہے۔ ان کے اس سارے مجموعی کام کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادیمی نے ڈاکٹر رام پنڈت کی سربراہی میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر رام پنڈت نے اردو نظم و نثر کی بے شمار تخلیقات کو مراٹھی میں منتقل کیا ہے۔ اردو افسانوں کے ترجموں کے تین مجموعے مراٹھی ادب میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔ اختر الایمان، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، باقر مہدی، قاضی سلیم، ندا فاضلی وغیرہ کی نظموں کو رام پنڈت نے مراٹھی روپ میں ڈھالا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں شعبہ مراٹھی کے پروفیسر ڈاکٹر رنگ ناتھ کلکرنی نے اردو تنقید کی نقش اول 'مقدمہ شعر و شاعری' از الطاف حسین حالی کا مراٹھی میں ترجمہ کیا۔ ان کی کتاب کا نام 'کاویہ آنی کویتا' تھا۔ عبدالحلیم شرر کی ایک تاریخی تصنیف 'گذشتہ لکھنؤ' کا بھی مراٹھی ترجمہ ہوا ہے، اسے وا۔ را۔ کانت نے سرانجام دیا ہے۔ [4] رمیش دیش پانڈے، پردیپ دیش پانڈے، نارائن سروے، پروفیسر کیشو میشرام، آر پی جوشی، کاشی ناتھ راو، مکند نکسالے، سنجیونی کھیر، ڈاکٹر رام پنڈت کا ذکر آ چکا ہے، منیشا پوروھن وغیرہ مراٹھی کے بے شمار ادبا و شعرا ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کی شیرینی کے ذائقے سے مراٹھی قارئین کو لطف اندوز کیا ہے۔

زبانیں فاصلہ مٹانے کا کام کرتی ہیں۔ مکالمے اور تحریریں دونوں ایسے ذرائع ابلاغ و ترسیل ہیں جن کی مدد سے ایک دوسرے کے مافی الضمیر سے بخوبی واقفیت ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں غلط فہمیوں کے راہ پا جانے کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ایک زبان کے ادب کو دوسری زبان میں منتقل کرتے رہنے سے ایک دوسرے کے خیالات جاننے کے مواقع دستیاب ہوتے ہیں جنھیں بالکل بھی کھونا نہیں چاہیے۔ کیوں کہ اس سے دونوں زبانوں کے رشتوں میں مضبوطی پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اردو سے مراٹھی میں ترجمے ہونے ضروری ہیں اسی طرح مراٹھی سے اردو میں تراجم کے سلسلے کو بھی جاری رکھنا لازمی ہے۔ یہی راستہ ہے جو دو مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کو آپس میں جوڑے رکھے گا۔

حوالہ جات:

1. اس معلومات کے لیے میں معروف محقق پروفیسر عبدالستار دلوی کا شکر گزار ہوں۔
2. شعرائے کوکن: ایک جائزہ از یعقوب راہی، تخیل پبلی کیشنز بھیونڈی 2007، ص 277
3. ناولٹ 'اولو کتا' کا پیش لفظ از پروفیسر عبدالستار دلوی، مطبوعہ شعبہ اردو ممبئی یونیورسٹی، 1988، ص 11
4. مضمون 'مراٹھی میں اردو کے ادبی اور علمی تراجم: ایک تعارف' از پروفیسر عبدالستار دلوی مشمولہ ماہنامہ سب رس حیدرآباد، جلد 60 شمارہ 10 اکتوبر 1998 ص 57 مدیر مغنی تبسم

■

Dr. Muzammil Sirkhot
Asst. Prof. Dept of Urdu
University of Mumbai, Kalina Campus
Santacruz East, Mumbai - 400098 (MS)

ریڈیو ترسیل
فکر و فن کی بازیافت

محمد شاہد حسین

ہمارے شعرا و ادبا زمانہ قدیم سے ہی بادِ صبا اور نسیم سحر کے ذریعے اپنے محبوب کو سلام و پیام بھیجتے رہتے تھے مگر 1910 سے پہلے تک کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ تصور حقیقت میں تبدیل ہو جائے گا۔ بہرحال وائرلیس کی ایجاد ایک ایسی اہم اور بنیادی ایجاد تھی جس کی وجہ سے نہ صرف ترسیل زمین کی پستیوں سے اٹھ کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی بلکہ اس کی وجہ سے ریڈیو، ٹرانسمیٹر، ٹیلی ویژن اور سیٹیلائٹ ترسیل ممکن ہو سکی۔ اس کی وجہ سے فاصلے سمٹ گئے، وقت پر قابو پا لیا گیا۔ لیکن اس میں بھی پیغامات کوڈ (Code) کے ذریعے ہی بھیجے جاتے تھے۔ چنانچہ بہت سے سائنسداں کوشاں ہوئے کہ وائرلیس کے ذریعے بھی ہو بہو آواز کی ترسیل کی جائے۔ مگر قرعہ فال گوگلیموں مارکونی کے نام نکلا اور ترقی کرتے ہوئے یہی نظام ہمارے سامنے ریڈیو کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے اس میں مارکونی کے علاوہ دوسرے سائنسدانوں کا بھی اہم رول رہا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس کی افادیت کے تحت پوری دنیا میں اس کی دن دونی رات چوگونی ترقی ہوتی رہی اور اس کی مقبولیت میں ہر روز اضافہ ہوتا گیا۔

ریڈیو کا پہلا پروگرام کہاں پیش کیا گیا، اس میں اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں کیے گئے تمام تجربات کو سامنے رکھا جائے تو مجموعی طور پر برتری امریکہ کو حاصل ہے۔ 1906 میں فسینڈن (Fessenden) نے 'برنٹ راک ماس' کے اپنے نجی تجرباتی اسٹیشن سے کرسمس کی شام کو ایک پروگرام نشر کیا، جسے بعض لوگ ریڈیو کا پہلا پروگرام کہتے ہیں۔

لی۔ ڈی۔ فارسٹ نے 1910 میں ایفل ٹاور کے اوپر آلات نصب کر کے اور نیویارک کے میٹروپولیٹن اوپیرا ہاؤس میں پانچ سو واٹ کا ٹرانسمیٹر لگا کر پروگرام پیش کیا۔ اسی طرح امریکہ کی ایک کمپنی نے ارلنگ ٹن (امریکہ میں نیوی کا ایک اسٹیشن) سے ایفل ٹاور پیرس تک پروگرام نشر کیا جس کا فاصلہ چار ہزار میل ہے۔ مگر یہ صرف نجی تجربات تھے ابھی تک مسلسل ریڈیو نشریات کا نظام قائم نہیں ہوا تھا۔ 02/نومبر 1920 کو امریکہ سے باقاعدہ کسی لائسنس یافتہ ریڈیو اسٹیشن کے ذریعے مسلسل ریڈیو نشریات کی ابتدا ہوئی۔

(Saundra Hybels, Danaulloth, Broadcasting an Introduction to Radio and Television. Newyork, 1978.p.53)

ہندستان میں ریڈیو پروگرام کی ابتدا 1921 میں اس وقت ہوئی جب ٹائمس آف انڈیا کے ادارے نے اپنے بمبئی آفس سے پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے اشتراک سے موسیقی کا ایک پروگرام نشر کیا۔ یہ ہندستان میں ریڈیو نشریات کا پہلا تجرباتی مظاہرہ تھا۔

(K.M.Shrivastava, Radio And TV Journalism. 1989. N. Delhi. P.14)

'دی انڈین اسٹیٹ اینڈ ایسٹرن ایجنسی لمیٹیڈ' نے ریڈیو کلب آف بنگال کے ساتھ مل کر کلکتہ میں ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کیا، جس کا پہلا پروگرام نومبر 1923 کو نشر ہوا۔ ایسا ہی ایک ادارہ 1924 میں بمبئی ریڈیو کلب کے نام سے بمبئی میں شروع ہوا۔ 16/مئی 1924 کو مدراس پریزیڈنسی ریڈیو کلب کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن دو تین سال کے اندر اندر مالی خسارے کی وجہ سے یہ ریڈیو کلب بند ہو گئے۔

پھر ایک پرائیویٹ تجارتی ادارے 'انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی' کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے ایک ایک ریڈیو اسٹیشن کلکتہ اور بمبئی میں کھولا لیکن 1930 آتے آتے یہ کمپنی بھی دیوالیہ ہو کر بند ہو گئی۔ اب ان لوگوں کی طرف سے جنھوں نے ریڈیو سیٹ خریدے تھے اور اس تجارت میں پیسہ لگا رکھا تھا، احتجاج شروع ہوا تو گورنمنٹ نے ریڈیو نشریات کا انتظام اپنے ذمے لے کر اسے 'انڈین براڈ کاسٹنگ سروس' نام دے کر 31/اپریل کو محکمہ صنعت و حرفت کے حوالے کر دیا۔ مگر اس کا کام کاج بہت اچھی طرح نہیں چل رہا تھا اور نہ ہی اس میں کوئی خاص ترقی ہو رہی تھی۔

ہندستان میں ریڈیو کا باقاعدہ فروغ اس وقت سے شروع ہوا جب 1934 کے آغاز میں دہلی ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی منظوری ملی اور نشریات کا ایک الگ محکمہ قائم ہوا۔ 20KW کا ایک ٹرانسمیٹر نصب ہوا اور 1/جنوری 1936 کو اس سے پہلا پروگرام نشر ہوا۔ اسی سال انڈین براڈ کاسٹنگ سروس کا نام بدل کر 'آل انڈیا ریڈیو' رکھا گیا۔

ریڈیو انجینئرنگ کے میدان میں ماہرین یا تربیت یافتہ لوگوں کی کمی اور فیس کم ہونے کی وجہ سے ادیبوں و فن کاروں کی عدم دلچسپی کے سبب اس کا فروغ توقع کے مطابق نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں تکنیکی معیار اور باعتبار تعداد ریڈیو نے کافی ترقی کی۔

دوسری جنگ عظیم میں (جس کی ابتدا 1939 میں ہوئی تھی) ریڈیو کی اہمیت بڑھ جانے کی دو خاص وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ریڈیو کا استعمال جنگی پروپیگنڈے کے لیے مؤثر طور پر کیا جا رہا تھا، دوسرے یہ کہ ملکی و غیر ملکی خبریں سننے میں عوام کی دلچسپی کافی بڑھ گئی تھی۔ اسی زمانے میں ایک نیا ٹرانسمیٹر نصب ہوا، اور بیرونی ریڈیو سروس شروع ہوئی۔ نہ صرف نئے نئے خبرنامے شروع ہوئے بلکہ ان کا وقت بھی بڑھا دیا گیا۔ عوام کی دلچسپی کے مدنظر دوسرے بہت سے پروگرام شروع کیے گئے جیسے ٹاک، فیچر، ڈرامے، ڈاکومنٹری اور موسیقی۔ چنانچہ بڑے علاقے میں ریڈیو عوام کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔

1941 میں محکمہ 'انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ' قائم ہوا اور 1943 میں آل انڈیا ریڈیو، براڈ کاسٹنگ ہاؤس نئی دہلی میں منتقل ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ملک میں زبردست سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انگریزوں کی غلامی سے ہمارا ملک آزاد ہوا۔ مگر آزادی کے ساتھ ساتھ تقسیم کا سانحہ بھی وقوع پذیر ہوا۔ یہاں تک کہ آل انڈیا ریڈیو بھی تقسیم ہوگیا۔ اس وقت پورے ملک میں نو ریڈیو اسٹیشن تھے جس میں سے تین پاکستان میں چلے گئے۔

بہرحال اس وقت تک عوامی ترسیل کا اہم ذریعہ مطبوعہ حروف تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ ہماری صرف تیس فیصدی آبادی پڑھی لکھی تھی۔ اس میں سے بھی بہت سے لوگ دور دراز علاقوں میں رہتے تھے۔ جہاں اخبار و رسائل کا بروقت پہنچنا مشکل تھا۔ چنانچہ ملک کی منصوبہ بندی کرنے والوں نے اپنے منصوبوں میں نشریاتی ادارے کو ترجیح دی اور یہ تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ آزادی کے بعد نشریات کی ترقی کے لیے دو باتوں کو بطور خاص پیش نظر رکھا گیا۔ ایک تو یہ کہ ریڈیو نشریات کو اتنی وسعت دے دی جائے کہ وہ بہ آسانی ہندستان کے ہر فرد تک پہنچ سکے۔ دوسرے یہ کہ اس کے پروگراموں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وہ ایک نئے آزادی حاصل کیے ہوئے سماج کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اور اس طرح ریڈیو ترسیل پوری طرح ملک کی تعمیر میں مددگار ہو جائے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہو کہ وہ لوگوں کو راغب کرے، مطلع کرے اور ان میں ایسا جوش پیدا کرے کہ ان کے ذہنوں میں چیزوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور لوگ سماجی و مادی تبدیلیوں کو جو ترقیاتی منصوبوں کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھیں، آسانی سے قبول کر کے اپنی قوت فیصلہ بڑھائیں۔ ان ہی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ریڈیو میں بہت سے پروگرام شروع کیے گئے جن میں خبرنامے اور ادبی پروگرام بہت اہم ہیں۔ یہاں ریڈیو کے خبرنامے اور ادبی اصناف پر بات کر لینا بے محل نہ ہوگا۔

خبر مطبوعہ الفاظ کے ذریعے پیش کی جائے، ریڈیو سے نشر ہو یا ٹیلی ویژن اسکرین پر دکھائی جائے وہ خبر ہی رہتی ہے اس کی اصلیت و ماہیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ البتہ ذریعۂ ترسیل کے بدل جانے سے خبر کے مرتب کرنے اور اس کی پیش کش کے طریقے میں تبدیلی آجاتی ہے۔

خبرنامہ ریڈیو کی ایک بہت اہم اور بنیادی ہیئت ہے۔ اخبار کی خبر آنکھوں سے دیکھ کر پڑھی جاتی ہے، ریڈیو کی خبر کانوں سے سن کر سمجھی جاتی ہے یہ وہی فرق ہے جو کسی چیز کو دیکھنے اور کسی چیز کے سننے میں ہوتا ہے۔

چونکہ ریڈیو میں وقت کا حساب منٹوں میں نہیں بلکہ سیکنڈوں میں کیا جاتا ہے، اس لیے اس کی خبروں کو مختصر، جامع اور غیر پیچیدہ ہونا چاہیے۔ ریڈیو کے سامعین میں پڑھے لکھے، کم پڑھے لکھے اور بغیر پڑھے لکھے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اس کی زبان سادہ، آسان اور عام فہم ہو، جملے چھوٹے چھوٹے ہوں، بات کو براہ راست بیان کیا جائے تاکہ عام آدمی تک بہ آسانی ابلاغ ہو سکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسے بنیادی نکتوں پر مرکوز ہونا چاہیے۔ ریڈیو خبرنامے کو اس لیے بھی عام فہم زبان میں پیش کرنا چاہیے کہ ریڈیو اپنے الفاظ دہراتا نہیں۔ اخبار میں اگر کوئی چیز سمجھ میں نہ آئے تو غور و خوض کرنے کا موقع ہوتا ہے۔ لہٰذا ریڈیو میں مشکل الفاظ کے علاوہ ایسے الفاظ سے بھی پرہیز کرنا چاہیے جن کی آواز ملتی جلتی ہو۔

خبر کو اپنی طرف سے 'اچھی'، 'بری' یا 'دلچسپ' نہیں کہنا چاہیے۔ سامعین اپنی دلچسپی کے لحاظ سے خود فیصلہ کرتے ہیں۔ ریڈیائی خبرناموں کی ابتدا، اہم خبروں کے خلاصے سے ہوتی ہے۔ یہ خلاصے شہ سرخیوں کا بھی کام دیتے ہیں۔ آخر میں ان خلاصوں کو دہرایا بھی جاتا ہے۔

ریڈیو کے ادبی پروگراموں کے لیے کچھ نئی اصناف ترتیب دی گئیں اور کچھ پرانی اصناف میں رد و بدل کر کے انھیں ریڈیو کے مزاج کے موافق بنا لیا گیا۔ ریڈیو ٹاک نئی اصناف کے زمرے میں آتی ہے۔

ریڈیو ٹاک لکھنا اور پیش کرنا ایک فن ہے جو اس ذریعۂ ترسیل کی مخصوص ضرورتوں کو سمجھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس میں ایک شخص بیانیہ کے انداز میں کسی موضوع پر بولتا ہے پھر بھی ریڈیو ٹاک کوئی تقریر نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی ایسے دوست سے گفتگو ہوتی ہے جو سامنے نہیں ہوتا۔ مگر آپ سے قریب اور آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پر یہ تاثر پڑنا چاہیے کہ ریڈیو ٹاک پیش کرنے والا صرف اس سے مخاطب ہے۔ غرض یہ کہ اس میں تخاطب کا بے تکلفانہ، غیر رسمی انداز ہو۔ اس کے الفاظ سادہ اور مانوس ہوں۔ لیکن اس کے اندر معنی کو ادا کرنے کی قوت اور زور ہو۔ جملے چھوٹے، الجھاؤ اور پیچیدگی سے پاک ہوں۔ زبان و اسلوب میں ابتدا تا انتہا توازن برقرار رہے۔ کتابی زبان کے بجائے گفتگو کی زبان ہو اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایسے الفاظ کا استعمال کیا جائے جس سے تخاطب کا انداز قائم رہے۔

ڈراما پرانی اصناف میں شمار ہوتا ہے، جس میں تبدیلی کر کے ریڈیو کے لیے اپنا لیا گیا ہے۔ ڈراما کسی قصے، واقعے یا بنیادی خیال کو عملاً پیش کرنے یعنی کر کے دکھانے کا نام ہے۔ اسٹیج ڈرامے میں اسے اجسام کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ سنیما اور ٹیلی ویژن میں متحرک تصویروں کے ذریعے۔ اور ریڈیو میں اسے صرف آواز کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے

ریڈیو ڈراما ایک ایسی صنف ہے جس میں ہر چیز کی تصویر سامع کے دماغ میں تخلیق کی جاتی ہے۔ کسی کردار کی شبیہ ہو، کوئی صورت حال ہو یا منظر و پس منظر سب کی تصویر مکالمے اور صوتی اثرات کے ذریعے سامعین کے ذہن پر مرتب کی جاتی ہے۔ اسی لیے اسے Theatre of the Imagination بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں سامعین کے تخیل کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے الفاظ کا استعمال فنکارانہ طریقے سے کیا جاتا ہے جو سامع کے ذہن و تخیل کو متحرک کر دیں۔ پھر وہ اپنی چشم تصور سے واقعات اور منظر و پس منظر کو بالکل اسی طرح دیکھتے چلے جائیں گویا اسٹیج یا پردے پر دیکھ رہے ہیں۔

اسٹیج، فلم اور ٹیلی ویژن میں چونکہ چیزیں دکھائی دیتی ہیں اس لیے ان میں تخیل سے زیادہ کام نہیں لینا پڑتا۔ ریڈیو میں چونکہ چیزیں دکھائی نہیں دیتی ہیں اس لیے اس میں تخیل سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے اور ہر چیز بیان کرنی ہوتی ہے۔ کرداروں کی گفتگو کے علاوہ ان کا عمل، ان کی حرکات و سکنات، جذبات کے اظہار سے پیدا شدہ صورت حال و کیفیات اور ان کا ردعمل سب بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن بیانیے کے ذریعے نہیں بلکہ مکالمے کے ذریعے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیو ڈرامے میں مکالموں کی اولین اہمیت ہوتی ہے اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ریڈیو میں مکالمے کرداروں کی شخصیت کو مستحکم کرتے ہیں، پلاٹ کو آگے بڑھاتے ہیں، صورت حال کو مکمل کرتے ہیں، یہاں تک کہ سیٹنگ اور حرکت و عمل کے بارے میں بھی بتاتے ہیں۔ وہ صرف کرداروں کا تعارف ہی نہیں کراتے بلکہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کی سرشت کیا ہے، وہ کس حالت میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

ریڈیو ڈرامے میں جو چیز مکالموں کے ذریعے پیش نہیں کی جا سکتی اسے خصوصی صوتی اثرات کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے، ایسا عموماً منظر و پس منظر کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ اس میں آواز کے ذریعے بہت سی ایسی چیزیں پیش کر دی جاتی ہیں جن کو اسٹیج پر پیش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً صبح کا سماں، رات کا سناٹا، دریا کی طغیانی، ہوائی جہاز کا اڑنا یا ریل کا اسٹیشن سے روانہ ہونا۔

ریڈیو ڈرامے میں کردار جتنے کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے، عموماً تین سے پانچ کرداروں کی سفارش کی جاتی ہے۔

اسٹیج کے برعکس ریڈیو ڈرامے میں منظر کی تبدیلی جلد جلد ممکن ہے۔ کیونکہ اس میں سین واقعی تخلیق نہیں کیے

جاتے بلکہ انھیں کرداروں کی گفتگو اور صوتی اثرات کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔

ڈاکومنٹری کا شمار بھی پرانی اصناف میں ہوتا ہے۔ ریڈیو ڈاکومنٹری اور فلم و ٹیلی ویژن ڈاکومنٹری میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا، اگر فرق ہے تو صرف پیشکش کا۔ ریڈیو ڈاکومنٹری صرف آواز کے ذریعے پیش کی جاتی ہے جبکہ فلم اور ٹیلی ویژن ڈاکومنٹری کی پیشکش میں آواز اور تصویر دونوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔

ڈاکومنٹری میں خیالی قصے کہانیاں نہیں ہوتیں۔ اس میں حقائق کو پیش کیا جاتا ہے۔ وہ حقائق خواہ کسی تحریر پر منحصر ہوں، کسی کے ذریعے بیان کیے گئے ہوں یا کسی معاصر انٹرویو پر ان کا انحصار ہو۔

فیچر بھی ریڈیو کی کافی مقبول صنف ہے۔ فیچر میں ریڈیو ڈرامے اور ریڈیو ٹاک کا امتزاج ہوتا ہے۔ اس میں ٹاک کی طرح بیانیہ بھی ہوتا ہے اور ڈرامائی صورت حال بھی۔ لیکن ڈرامے میں افسانہ ہوتا ہے اور فیچر میں حقیقت۔ بعض ناقدین فیچرز اور ڈاکومنٹری میں کوئی فرق نہیں مانتے۔ مگر رابرٹ میکلش کا خیال ہے کہ ڈاکومنٹری مکمل طور پر حقائق پر منحصر ہوتی ہے جبکہ فیچر میں اس کے موضوع کی بہتر وضاحت و پیش کش کے لیے حقائق کے ساتھ ساتھ لوک گیت، شاعری اور افسانے کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

فیچر کے موضوع کی وسعت اور تنوع کے تحت دنیا میں موجود چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر چیز کو فیچر کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ فیچر ایک ایسی آزاد ہیئت ہے جس میں کسی موضوع کا مکمل احاطہ کیا جاسکتا ہے بجائے اس کے کہ اس کی چند خصوصیات بیان کردی جائیں۔ البتہ اس میں تازگی کا عنصر لازمی ہے، یعنی کسی قدیم موضوع کو نیا زاویہ دے کر نئی زندگی دی جاسکتی ہے۔ فیچر کی زبان بھی سادہ، رواں اور آسان ہونی چاہیے جو زیادہ سے زیادہ سامعین کی سمجھ میں آجائے۔ اس کے اعداد و شمار میں غلطی نہیں ہونی چاہیے، جملوں میں ابہام یا الجھاؤ نہ ہو، اسلوب میں خوش بیانی ہو، تکنیکی اصطلاحات سے پرہیز کیا جائے۔ دلچسپی کے لیے فیچر میں چھوٹے چھوٹے قصے یا لطیفے بیان ہوسکتے ہیں۔ اس میں ڈرامائی کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس کے اختتام کو بھی دلچسپ ہونا چاہیے۔ مختصر یہ کہ فیچر ابتدا سے انتہا تک لطیف، دلچسپ، خوشگوار اور رواں ہو تو سامعین کی پوری توجہ حاصل کرتا ہے۔

ریڈیو پروگرام کو پیش کرنے سے پہلے اس کا مسودہ تحریری شکل میں تیار کیا جاتا ہے جسے اسکرپٹ کہتے ہیں۔ یہ تحریر ادائے مطلب کے لحاظ سے نامکمل یا خام ہوتی ہے، کیوں کہ خط کشید کرنے اور رموز و اوقاف کی تمام علامات کو بروئے کار لانے کے باوجود تحریر ان مطالب کو ادا نہیں کرسکتی جو صرف کسی لفظ پر زور دے کر یا لہجے کی تبدیلی سے ادا کیے جاتے ہیں۔ تحریر یہ بھی نہیں بتاتی کہ آواز کہاں نرم ہو اور کہاں سخت اور بولنے کی رفتار کیا ہو۔ ادائے مطالب میں لہجے کی تبدیلی بہت معاون ہوتی ہے۔ چنانچہ ریڈیائی تحریر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مبہم رہتی ہے جب تک مائیکروفون پر پیش نہ کردی جائے۔

پروگرام کی اسکرپٹ تیار کرتے وقت اکثر یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کیا لکھیں اور کیسے لکھیں۔ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا ترسیل کرنا ہے۔ وہ بنیادی نکتہ کیا ہے جسے ترسیل کرنا ہے اور اس کے ذریعے کیا تاثر قائم کرنا ہے۔ لہٰذا جب بھی کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھائیں تو سب سے پہلے اپنے آپ سے سوال کریں کہ ہمیں کیا کہنا ہے۔ پھر جو کچھ کہنا ہے اس کے اہم نکتوں کی ایک فہرست بنائیں۔ پھر ان نکتوں پر منحصر خیالات کو ایک منطقی ربط و تسلسل اور مناسب ترتیب کے ساتھ لکھتے چلے جائیں۔ ریڈیائی پروگراموں کی پیشکش میں منطقی اور فطری ترتیب بہت ضروری ہوتی ہے۔ تحریری ترسیل میں کچھ گھما پھرا کر بھی لکھا جاسکتا ہے۔ وہاں پورا مواد نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لیے دوبارہ دیکھا اور غور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ریڈیائی تحریر میں کسی بات کو فوراً سمجھیں یا پھر کبھی نہ سمجھیں۔

ریڈیائی تحریر میں ان ہی الفاظ کو استعمال کرنا چاہیے جو روزمرہ کی فطری گفتگو کا جز ہیں نہ کہ کتابی زبان میں استعمال ہونے والے الفاظ کا۔ اگر یہ بات ذہن میں واضح ہو کہ ریڈیائی ترسیل میں سامعین کو متاثر کرنا اہم نہیں ہوتا بلکہ اطلاعات، معلومات اور تجربات کا ابلاغ اہم ہوتا ہے تو مقصد آسانی سے حاصل ہوجاتا ہے۔

جب ہم سامعین کو نظر میں رکھنے کی بات کرتے ہیں تو اس نکتے کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ ریڈیو کے ذریعے ایک شخص کو ترسیل کیا جاتا ہے۔ گو کہ ریڈیو عوامی ترسیل کا حصہ ہے اس کی نشریات لاکھوں کروڑوں لوگوں تک بیک وقت پہنچتی ہیں۔ پھر بھی اس کا پیغام اپنی منزل تک فرداً فرداً ہی پہنچتا ہے۔ ریڈیو نشریات اس طرح کا اجتماعی تجربہ نہیں ہے جس طرح کسی ہال میں اکٹھا لوگوں کا ہوتا ہے۔ یا جس طرح کسی بڑے مجمعے کا ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں ایسی تراکیب کا بھی استعمال نہیں کرنا چاہیے جس میں اجتماعی خطاب ہو۔ مثلاً ''سامعین آپ یہ سننا پسند کریں گے''۔ یا ''آپ میں سے کچھ لوگوں نے دیکھا ہوگا۔'' اس کے بجائے انفرادی خطاب کی تراکیب استعمال کرنا چاہیے۔ جیسے ''آپ سننا پسند کریں گے۔ یا ''آپ نے دیکھا ہوگا۔''

ریڈیو میں مرسل اور فرد واحد کے درمیان ترسیلی عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ہر سامع اپنے طور پر اپنے خیالات و فکر کے ساتھ تنہا ریڈیو سنتا ہے۔ یہاں اجتماعی نفسیات کے بجائے انفرادی نفسیات کارفرما رہتی ہے۔ لہٰذا ریڈیو میں اشخاص کے بجائے شخص سے خطاب کرنا چاہیے۔ جب سامع یہ محسوس کرے گا کہ صرف اس سے خطاب کیا جارہا ہے تو پیغام کی اثر پذیری میں اضافہ ہوجائے گا۔

ریڈیو سامع کے اتنے قریب ہوتا ہے کہ ہاتھ کی ایک ہلکی سی جنبش سے اس کا سوئچ بہ آسانی بند کیا جاسکتا ہے۔ ریڈیو کا سامع کتنی آسانی سے مرسل کی گرفت سے نکل جاتا ہے اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا آپ کا پہلا جملہ اتنا دلچسپ ہونا چاہیے کہ سامع پر گرفت مضبوط ہو۔ اصل موضوع تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگے۔ اصل موضوع کی ابتدا راغب کرنے والی، برمحل یا غیر معمولی ہو۔ جو کچھ کہا جائے پورے اعتماد اور وثوق سے کہا جائے سامع کو کہیں سے مشتبہ نہ ہونے دیا جائے۔

ریڈیو کا ایک سنہرا اصول یہ ہے کہ اس کی تحریر کا پہلا جملہ دلچسپ ہو، دوسرا جملہ مطلع کرے۔ پھر اپنے نکتوں کو موضوع کے دھاگے میں تسبیح کے دانوں کی طرح پروتے چلے جائیں۔ اوپر کہا گیا کہ ریڈیو کی تحریر کا مجموعی انداز بات چیت یا گفتگو کا ہونا چاہیے۔ لیکن یہ گفتگو بے ڈھنگی، بے ربط، بے محل اور بازارو نہ ہو۔ اسے سنجیدہ، برمحل اور باوقار ہونا چاہیے۔

ریڈیائی تحریر کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اسے لکھنے کے بعد با آواز بلند پڑھ کر دیکھ لینا چاہیے۔ اس سے دو باتوں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ جو الفاظ لکھے گئے ہیں ان کی ادائیگی یا تلفظ مشکل تو نہیں ہے۔ دوسرے ان کی آوازوں میں روانی اور نغمگی کتنی ہے۔

برقی عوامی ذرائع ترسیل جس سرعت سے مائل بہ ارتقا ہیں اور جس تیزی سے اس میں ردوبدل اور نئی نئی ایجادات ہورہی ہیں۔ ان کے دوش بدوش چلنا یقیناً مشکل ہے۔ پھر بھی یہ تحریر ریڈیو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس لیے مفید ہوگی کہ ریڈیو کا احیا ہوا ہے اور ٹیلی ویژن کی تمام تر مقبولیت کے باوجود ہندستان کے پس منظر میں، اس کی اہمیت و افادیت میں کوئی زیادہ فرق نہیں آیا ہے۔

■

Prof. Mohd Shahid Husain
603/7, Shahjahanbad Apts.
Sector-11, Plot.1,Dwarka,New Delhi-110075

سلیم محی الدین

عالم کاری، زبان و ادب اور سوشل میڈیا

ہم ایک عالم کار معاشرے میں جی رہے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں جغرافیائی سرحدیں مٹتی جارہی ہیں۔ جہاں دنیا سمٹ کر ایک عالمی گاؤں[1] میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ایک ایسا عالمی گاؤں جہاں ہمارے فکر و اظہار اور عمل و ردعمل میں انقلابی تبدیلیاں نمایاں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ انقلابی تبدیلی ذرائع حمل و نقل یا سرحدوں کے پار سفر کی آسانیوں اور ارزانیوں کی بنا پر عمل میں آئی ہے۔ غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ایسا بھی نہیں ہے۔ لیکن کوئی تو ہے کچھ تو ہے جو انسانوں، زبانوں اور تہذیبوں کے درمیان کے فاصلوں کو مٹا رہا ہے۔ پتہ چلا کہ یہ میڈیا بلکہ سوشل میڈیا ہے جو نہ صرف انسانی ذہن و فکر اور زبان و تہذیب کو متاثر کر رہا ہے بلکہ جس نے ان کی چولیں تک ہلادی ہیں۔

احساس تنہائی کی موت:

تنہائی کا وہ احساس جو انسانی دل و دماغ کو متاثر کرتا تھا آج زائل ہوچکا ہے اور یہ کارنامہ ہے سوشل میڈیا کا۔ ایک عدد اسمارٹ فون اور انگلیوں کا جادوئی لمس دنیا کے کسی گوشے میں آپ کو تنہا نہیں ہونے دے گا۔ انٹرنیٹ کی جادوئی مکڑی کا جال پورے گلوب کو جکڑ چکا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں بھی بہت کم قطعہ زمین انٹرنیٹ کی نادیدہ لہروں کی دسترس سے باہر ہے۔ ایک نقطے سے نکل کر دائروی شکل میں اوپر کی جانب بڑھتی لکیریں صرف نیٹ ورک کی نشانی نہیں ہیں۔ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ آپ نہ صرف آن لائن ہیں بلکہ آن لائف ہیں۔ اور آن لائن ہونے کے بعد آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ:

زندہ ہوں اس طرح کہ غم زندگی نہیں
جلتا ہوا دیا ہوں مگر روشنی نہیں

کیونکہ آپ کی یاد یا طلب کے لمحۂ مخصوص میں اگر آپ کا اسٹیٹس آن لائن ہو اور آپ اپنے موجود ہونے کا ثبوت نہ دیں تو پھر آپ نہ اپنے باس کو مطمئن کرسکتے ہیں اور نہ ہی اپنی نوکری کو بچانے کی کامیاب کوشش ہی کرسکتے ہیں، نہ اپنے دوستوں کا اعتماد جیت سکتے ہیں اور نہ ہی کفارے کی ادائیگی سے چھٹکارا پاسکتے ہیں، نہ اپنی بیوی یا محبوبہ کو یقین دلاسکتے ہیں اور نہ ہی ہزیمت سے بچ سکتے ہیں۔ اس مقام پر غالب کی دوررس اور دوربین نگاہی کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے

یہ ہے غالب کی عصری معنویت۔ یعنی یہ کہ جو زندہ ہو تو پھر زندہ نظر آنا ضروری ہے۔ مختصراً یہ کہ انٹرنیٹ بہ وساطت اسمارٹ فون نہ آپ کو کبھی احساس تنہائی کا شکار ہونے دے گا اور نہ ہی invisible ہونے دے گا۔

شناخت کا مسئلہ:

دنیا کے سمٹنے کا راز عالم کاری میں پوشیدہ ہے اور عالم کاری کے متعلق یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق معیشت یا معاشی امور سے ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے پس پردہ ایک مطلوبہ و مقررہ سماجی و تہذیبی تبدیلی کا حصول اصل ہدف ہے۔ صورت حال کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس پردے کے پیچھے کوئی ہے جو چاہتا ہے کہ دنیا یک رنگ ہوجائے۔ اس طرح یک رنگ کہ سارے رنگ اس ایک رنگ میں مدغم ہوجائیں۔ دورنگی خوب نہیں یک رنگ ہوجا۔

درحقیقت عالم کاری ہر چھوٹے وجود کی مخالف ہے۔ جس میں اس بسیط دنیا کا کوئی چھوٹا سا ملک، ایک وسیع ملک کی کوئی چھوٹی سی اقلیت اور تہذیب کے سمندر کی رنگ برنگی خوبصورت چھوٹی مچھلیوں سے لے کر زبانوں کے خاندانوں کی چھوٹی چھوٹی زبانیں بھی کچھ شامل ہیں۔ اس عالم کار نظریے کے باعث ان میں سے ہر ایک کی زندگی اور شناخت دونوں ہی داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔ ہر ایک کے سر پر اپنی شناخت کھودینے اور کسی اور بڑی شناخت میں مدغم ہوجانے کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔

عالم کاری کی سُنامی پہلے ہی کئی چھوٹی چھوٹی زبانوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاچکی ہے جن میں سے بیشتر کا اب نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ بقول لی ڈینس مر:

''ہر دو ہفتوں میں ایک زبان موت کا شکار ہوجاتی ہے۔ کرۂ ارض پر تقریباً 6800 زبانیں موجود ہیں بعض ماہرین کے مطابق سنہ 2100 کے آتے آتے ان میں سے زائد از نصف معدوم ہوچکی ہوں گی۔ کئی زبانیں ایسی بھی ہیں جن کی کوئی دستاویزی حیثیت نہیں ہے اور جو نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہیں۔ ایسی زبانوں کی زندگی نئی نسلوں کی دلچسپی پر منحصر ہے۔ ایک زبان کا خاتمہ درحقیقت ایک تہذیب کا خاتمہ ہے۔ ایک زبان کے خاتمے سے ہم اس تہذیب کی تاریخ، تجربات اور رویوں سے محروم ہوجاتے ہیں۔''[2]

تہذیب اور میڈیا:

ہر زبان کی ایک تہذیب ہوتی ہے اور ہر تہذیب کی ایک زبان۔ ہر تہذیب ایک زبان کی پرورش کرتی ہے جبکہ ہر زبان ایک تہذیب کو پروان چڑھاتی ہے۔ میرے نزدیک ہر زبان اپنی تہذیب کی بادِ پیا اور تپش پیما ہوتی ہے۔ تہذیب کی سطح پر رونما ہونے والا ہر معمولی تغیر، ہر خفیف لرزش حتیٰ کہ ہر زیریں لہر کا عکس زبان اور اس کے ادب میں ظاہر ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان و ادب اور تہذیب ہمارے سماجی شعور کے عکاس ہوتے ہیں۔

سوشل میڈیا کتنا سوشل، کتنا ان سوشل:

سوشل میڈیا دراصل بڑی ذہانت کے ساتھ تراشی گئی اصطلاح ہے۔ اس کے پس پردہ اصل مقصد تو تجارت، معیشت اور تجارتی سرگرمیوں کا فروغ ہی ہے۔ تو پھر آخر اس میں 'سوشل' کیا ہے؟۔ سوشل میڈیا انسان کو

سوشل سے زیادہ 'ان سوشل' بناتا ہے۔ اس کے کثرت استعمال کے باعث ہم اپنی ان سماجی اقدار و روایات سے دور ہوتے جا رہے ہیں جنھیں ہم تک پہنچانے اور پروان چڑھانے کے لیے ہمارے بزرگوں نے اپنی زندگیاں وقف کیں۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہمیں ہم سے ہزاروں میل دور بیٹھے کسی نادیدہ دوست کے اسٹیٹس کی پل پل کی خبر تو ہوتی ہے لیکن ہمارے پڑوسی کی حالت کا پتہ نہیں ہوتا۔ کسی کتاب کو ہاتھ لگائے عرصہ گزر جاتا ہے لیکن کتاب چہرے (فیس بک) سے نظر ہٹنا محال ہے۔ ٹویٹر تو گویا ایک چوپال ہے آوازوں کا ایک جنگل۔ کمال یہ ہے کہ آپ اسی کو سن سکتے ہیں جسے آپ سننا چاہتے ہیں اور آپ کی آواز بھی بآسانی اس تک پہنچ جاتی ہے جو آپ پر کان دھرنا پسند کرتا ہے۔ واٹس اپ ایک مقبول ترین ذریعہ ہے جہاں دلچسپیوں کا ایک جہاں آباد ہے۔ یہ استعمال میں آسان اور ارزاں ہونے کے باعث سوشل میڈیا کا مقبول ترین ذریعہ ہے۔ ذاتی اور اجتماعی (گروپ) شکل میں لوگوں تک اپنے فکر و خیال کو پہنچا کر آپ اپنی وقعت میں اضافہ کر سکتے ہیں یا اپنی کم علمی کا ڈھنڈورہ بھی پیٹ سکتے ہیں کیونکہ آپ آزاد ہیں۔ یہ آزادی ہی سوشل میڈیا کی اصل روح ہے۔ سوشل میڈیا یہ دکھانے میں آپ کی مدد کرتا ہے کہ آپ کتنے سوشل ہیں؟ سوشل میڈیا کے حوالے سے سوشل رہنے کے چند اہم فوائد کچھ اس طرح ہیں (1) آپ کو اپنے ہر سوال کا فوری جواب مل سکتا ہے۔ آپ کے سوشل سرکل میں شامل احباب آپ کی روزمرہ زندگی سے متعلق کسی بھی مسئلے کا حل چٹکیوں میں سمجھا دیں گے۔ ساتھ ہی ان کی مہارت پر اعتماد یا عدم اعتماد کا آپ کو پورا پورا حق حاصل ہوگا۔ (2) سوشل میڈیا فوری شہرت کا آسان ترین طریقہ ہے۔ یہاں آپ اپنے آپ کو ہمیشہ مرکزِ نگاہ بنائے رکھ سکتے ہیں۔ اپنی کسی صلاحیت یا فن کی نہایت پروفیشنل انداز میں تشہیر بھی کر سکتے ہیں۔ (3) آپ یہاں رہتے ہوئے اپنے اثر و رسوخ میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ آپ کی زندگی کے چھوٹے بڑے فیصلوں کے لیے آپ کو اپنے خاندان یا سماج میں کسی بڑے بوڑھے کی عدم موجودگی سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ آپ کسی کو فالو کر کے اپنے علم میں اضافہ کر سکتے ہیں اور اپنے فالوورس کی مدد سے اپنی علمیت و اہمیت پر اترا بھی سکتے ہیں۔ آپ اپنے سوشل سرکل یا کمیونٹی کی مدد سے سرحدوں کے پار بلکہ دنیا بھر میں مشہور ہو سکتے ہیں اور دنیا بھر کی معلومات رکھ سکتے ہیں۔ چاہے آپ کو آپ کے شہر میں کوئی جانتا تک نہ ہو یا یہ کہ آپ کو اپنے اطراف یا اپنے پڑوس کے حالات سے واقفیت نہ ہو۔ لیکن صحیح مشورہ یہی ہوگا کہ آپ دن کے خاتمے پر یہ احتساب ضرور کریں کہ آج دن بھر میں اسکرین کے توسط سے آپ کتنے لوگوں سے ملے اور عملی زندگی میں کتنے افراد سے سلام علیک یا مصافحہ کیا۔ ان دونوں میں توازن اور عدم توازن کا احساس بھی ضروری ہے۔

زبان۔ ایک آسان ہدف:

سوشل میڈیا کے فروغ کے ہاتھوں زبانیں سب سے زیادہ متاثر ہو رہی ہیں۔ سوشل پلیٹ فارموں پر دیے جانے والے پیغامات زبان کی بنیادی خوشبو، مزاج اور نزاکت سے عاری ہوتے ہیں۔ نئی نئی تراکیب و اصطلاحات، جملوں کی بے جوڑ ساخت، راست بیانیہ کا بے دریغ استعمال اور فعل، فاعل اور مفعول کی حالتوں کے ادھورے احوال پر مبنی چھوٹے چھوٹے جملوں کا بے محابا استعمال سوشل پلیٹ فارم پر زبان کی درگت کی مثالیں ہیں۔ حالت یہ ہے کہ آج کا سوشل میڈیا ڈکشنری کے لیے نئے نئے الفاظ و تراکیب تخلیق کر رہا ہے۔ لندن اسکول آف پبلک ریلیشن کے ایک مطالعے کے مطابق۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ہر سال نئے مستعمل الفاظ کی شمولیت کی جاتی ہے۔ لفظوں کے مستعمل اور غیر مستعمل ہونے کا فیصلہ آخر کیسے کیا جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی زمانے میں جو لفظ محض روزمرہ کی بول چال کا حصہ تھا وہی وقت گزرنے کے ساتھ مستعمل قرار دیا جاتا ہے۔ مقامی روزمرہ الفاظ و محاورے مسلسل لغت کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ سنہ 2013 میں ٹویٹ (Tweet)، فالو (Follow) اور فالوور (Follower) کے اندراجات کی تصحیح کی گئی۔ اب یہ الفاظ بیک وقت بطور اسم اور فعل کے درج کیے گئے ہیں اور یہ سب سوشل میڈیا میں ان الفاظ کے اسم اور فعل دونوں طرح کے استعمال کی وجہ سے کیا گیا ہے۔''[3]

ابتدا میں ای میل (Email) صرف ایک اسم تھا۔ آج آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی شمولیت اسم کے ساتھ ساتھ فعل کے طور پر بھی ہے اور اب یہ (Emailed) اور Emailing کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ انگریزی کے حوالے سے اب OmG اور LoL کے معنی سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی l8r (لیٹر) اور gr8 (گریٹ) جیسی اصطلاحات ناقابلِ فہم ہیں۔

انگریزی اور دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو بھی سوشل میڈیا کی دست درازیوں اور اوٹ پٹانگ تجربوں کا شکار ہوئی ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ اردو فارسی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور اس میں ایک ہی آواز کے لیے کئی کئی الفاظ موجود ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے ان الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً تراب۔ یہاں ت کی جگہ ط کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے لیکن یہ غلط ہوگا۔ خوبصورت اسی طرح خوبصورت لگتا ہے۔ اس طرح 'خوبسورت' نہیں۔ اگرچہ اردو کے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ [4] اردو حروفِ تہجی کی دوبارہ تشکیل اور اس کو عام فہم بنانے کی وکالت کرتے ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ حروفِ تہجی کے یہ زائد الفاظ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے حسن میں اضافے کا باعث ہیں۔

اردو کی نئی شکل۔ اُردش

سوشل میڈیا کی متوالی ہماری نئی نسل زبان کے قواعد اور حروف و نحو کی قائل نہیں ہے وہ تو صرف کم سے کم الفاظ کے استعمال اور زیادہ تیز رفتاری سے ترسیل کی خواہاں ہے۔ وقت کے ساتھ بھی زبان میں تغیر اور تبدیلی ایک فطری امر ہے۔ لیکن یہ تغیر بھی فطری ہونا چاہیے۔ گزشتہ چند برسوں میں رونما ہوا یہ تغیر نہ صرف یہ کہ غیر فطری بلکہ ناپسندیدہ بھی ہے۔

سوشل میڈیا پر مستعمل اس نئی زبان کے نمونے ٹکسٹ میسج، ٹویٹس، فیس بک کامنٹس اور واٹس اپ کی ترسیلات میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اسی زبان کا عکس ہماری نئی نسل کی عام بول چال میں بھی نظر آنے لگا ہے۔ گزشتہ دنوں ممبئی کے ایک مشہور اور قدیم کالج کی کینٹین میں کچھ وقت گزارنے کا اتفاق ہوا۔ کچھ ہی دیر میں اندازہ ہوا کہ آس پاس ایک عجیب سی زبان کا شور تھا جو مانوس ہوتے ہوئے بھی نامانوس تھی اور نامانوس ہوتے ہوئے بھی شناسا لگتی تھی۔ یہ زبان نہ پوری طرح انگریزی تھی، نہ اردو اور نہ ہی مراٹھی۔ یہ ان تمام کا ملغوبہ تھی جس میں اپنے طور پر تراشے گئے چند الفاظ، تراکیب، مخففات، اصطلاحات بلکہ محاورے بھی شامل تھے۔ پتہ چلا کہ یہ 'اُردش' تھی یعنی اردو اور انگلش کا انوکھا امتزاج۔

اردش کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ بہت کم اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے یہاں السلام علیکم کا مخفف اساک (Asak) یا اسلم (Aslam) ہے۔ جبکہ وساک (Wsak) یا وسلم (Wslm) کے معنی وعلیکم السلام کے ہوں گے۔ آج پرنٹ میڈیا سے لے کر ریڈیو اور ٹی وی تک اور سوشل میڈیا تک اشتہارات میں بھی مختلف زبانوں کے الفاظ بلکہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو ملا کر تراشی گئی تراکیب کا استعمال عام ہے۔ جبکہ ماضی قریب میں اس طرح کی زبان کا استعمال تو دور تلفظ کی غلط ادائیگی بھی قابلِ گرفت

ہوا کرتی تھی۔ آج کی نسل تو جمع الجمع بھی دھڑلے سے کرتی ہے۔ مثلاً حالات کی جمع حالاتوں اور جذبات کی جمع جذباتوں ہوتی ہے۔ وہ دن گئے جب شکریہ ادا کیا جاتا تھا اور مبارکباد پیش کی جاتی تھی۔ آج تو شکریہ کیا جاتا ہے (شکریہ کرتا ہوں) اور مبارکباد دی جاتی ہے (مبارک دیتا ہوں)۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ برائیاں اب موبائل، ٹیبلیٹ، لیپ ٹاپ اور ڈیسک ٹاپ کے اسکرین سے نکل کر غیر محسوس طور پر ہماری بول چال کا حصہ ہوتی جارہی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ واٹس اپ اور فیس بک پر علامہ اقبال اور غالب جیسے نابغۂ روزگار شعرا کے نام سے ایسے اشعار پوسٹ کیے جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر آپ کا دل اور مرحومین کی روح کا تڑپنا لازم ہے۔ ان میں سے اکثر اشعار بے بحر اور بے وزن بھی پائے جاتے ہیں۔

انٹرنیٹ اور اردو:

اردو کی سائبر اسپیس میں اپنی جگہ بنانے کی تاریخ دو دہائیوں سے بھی کم عرصے پر محیط ہے لیکن اس قلیل عرصے میں بھی اردو نے قابل لحاظ ترقی کی ہے۔ اردو یونی کوڈ کے علاوہ مختلف اردو سافٹ ویئرس کی مدد سے آج اردو میں ٹائپنگ بلکہ ڈیسک ٹاپ پرنٹنگ (DTP) بھی کی جاتی ہے۔ تزئین کاری سے متعلق مختلف سافٹ ویئرس کی مدد سے آج اردو ڈی ٹی پی دن بہ دن حسن کاری کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار چھورہی ہے۔ آج ای میل سے لے کر بلاگ، ٹویٹر، فیس بک، واٹس اپ اور یوٹیوب پر اردو رسم الخط عام اور مقبول ہے۔ مشاعرہ اردو کی ایک مقبول ادبی روایت ہے۔ انٹرنیٹ کے حوالے سے آج فیس بک اور واٹس اپ پر آن لائن مشاعروں کی بھر مار ہے اور اب تو آن لائن مذاکرے بھی ہونے لگے ہیں۔ ان معنوی (ورچوئل) تقاریب پر حقیقت کا گمان اس وقت ہونے لگتا ہے جب دنیا کے کسی کونے میں بیٹھا فنکار اسکرین کی مدد سے اپنا کلام آڈیو یا ویڈیو کی شکل میں اپ لوڈ کرتا ہے اور اسی وقت دنیا بھر کے سامعین بیک وقت اسے سنتے یا دیکھتے ہیں اور فوری طور پر داد و تحسین سے بھی نوازتے ہیں۔ فیس بک کے علاوہ، مختلف بلاگس اور واٹس اپ گروپوں میں ادبی مسائل پر گرما گرم مباحثے بھی عام ہیں اور ان کی انفرادیت وافادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پلیٹ فارم آج ادب اور سماج میں ہونے والی تیز رفتار تبدیلیوں کی ترسیل اسی سرعت کے ساتھ کررہے ہیں جس سرعت سے یہ واقع ہوتی ہیں۔

ادب اور سوشل میڈیا:

یہ حقیقت ہے کہ انٹرنیٹ اور اس کے حوالے سے سوشل میڈیا ادب عالیہ کی ترویج وترسیل کا ایک مقبول اور معتبر ذریعہ بن کر ابھرے ہیں۔ آن لائن ادبی رسائل و جرائد کی تعداد میں روز افزوں اضافہ اس کا بین ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ فیس بک اور واٹس اپ پر ہونے والے مشاعرے اور مذاکرے ہیں جن کی روداد یں پرنٹ میڈیا میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کررہی ہیں۔ حال ہی میں ایک واٹس اپ گروپ نے اپنے مشاعروں کی روداد یں یکجا کرکے انھیں شائع کیا ہے۔ اسی طرح ایک بلاگر نے اپنے بلاگ پر ہوئے ایک ادبی مباحثے کو کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ ایک اور بلاگر نے اپنے نام آئے ای۔ مراسلوں کو شائع کیا ہے جسے دیکھ کر اس پر اردو مکتوب نگاری کی عصری شکل کا گمان ہوتا ہے۔ میرے ایک دوست جو سفر کے شوقین ہیں اپنے ہر سفر کے ہر دن کی روداد روزانہ اپنے فیس بک اسٹیٹس کے طور پر اپلوڈ کرتے ہیں۔ گویا سفرنامہ وہ بھی قسطوں میں۔ ممبئی سے متعلق میرے ایک ادیب، شاعر اور صحافی دوست بھی ہر رات اپنی دن بھر کی مصروفیت بطور اسٹیٹس اَپلوڈ کرتے ہی۔ ان کا یہ روزنامچہ زبان و بیان کی چاشنی، قوت مشاہدہ، تجزیاتی وتنقیدی شعور اور انسانی زندگی کے تجربات کا عکس ہوتا ہے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ سوشل میڈیا میں ادب کو پروان چڑھانے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ بالخصوص شاعری اور نان فکشن کے لیے تو یہ ایک بہترین میڈیم ثابت ہوسکتا ہے۔ ضرورت صرف فکری سنجیدگی اور منظم کوششوں کی ہے۔

مائی فیس بک فیملی:

سوشل میڈیا کو صرف ذہنی تفریح کا ذریعہ نہ سمجھا جائے۔ مسئلہ یہی ہے کہ ہماری نئی نسل اسے محض تفریح طبع کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ اگر ادب ذات کے اظہار کا نام ہے تو سوشل میڈیا آپ کو اظہار ذات کے بے شمار وسیلے مہیا کرتا ہے۔ لیکن اگر آپ موصولہ ترسیلات کو دہرانے یا آگے بڑھانے ہی کو سوشل میڈیا کا بہترین استعمال سمجھتے ہیں تو آپ کچھ بھی حاصل نہیں کر پائیں گے۔ اگر آپ یہاں محض اپنی ذات کے اندر کا خلا پر کرنے کی خاطر آئے ہیں تو یہ کام تو فیس بک اکیلے ہی کرسکتا ہے۔ مائی فیس بک فیملی (My facebook family) اسی طرح کا ایک تصور ہے جس کی وضاحت کے لیے میں چند سال قبل لکھے گئے اپنے ہی ایک مضمون سے ایک اقتباس نقل کرنا چاہوں گا کہ:

"وہ دن ہوا ہوئے کہ جب محبوب سے آنکھیں چار کرنے کے لیے عاشق کو موسموں کی سختی، زمانے کی پابندی اور حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ آج کمپیوٹر کے جادوئی سکرین پر آنکھیں چار ہوسکتی ہیں اور کچھ دن بعد جشن مسرت کا اعلان بھی، شادی کی خوبصورت تصاویر اور دوست واحباب کی مبارکبادیاں بھی، کچھ دنوں بعد دنیا کی آبادی سے اضافے کا فریضہ ادا کرنے کی تصویری شہادت بھی فیس بک سے لے کر ہر سوشل نیٹ ورک کی رونق بڑھاسکتی ہے۔ اور خدانخواستہ کہانی میں کوئی ٹویسٹ آجائے تو چند سطری ٹویٹ یا فیس بک اسٹیٹس کے ذریعے دنیا کو یہ اطلاع بھی دی جاسکتی ہے کہ

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو

سانحہ گزرنے کی اطلاع پر بھی بطور پُرسہ آپ کو اتنے ہی کمنٹس اور اتنی ہی ہمدردیاں (لائکس) ملیں گی جتنا آپ کا حلقۂ احباب وسیع ہوگا ایسے برے وقت میں ہوسکتا ہے کہ آپ کے اطراف کوئی غم گسار اپنے طبعی وجود کے ساتھ موجود نہ ہو مگر ہزاروں میل دور بیٹھا ہوا ایک اجنبی دوست بھی آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوگا۔ میڈیا، زبان اور ادب کے حوالے سے یہ عالم کاری ہی کا ثمرہ ہے۔"

مختصر یہ کہ عالم کاری کے مضر اثرات سے بچنے کا شعور اگر پیدا ہوجائے تو ہم نہ صرف یہ کہ اپنی زبان و ثقافت کا تحفظ کرسکتے ہیں بلکہ اس سے مثبت انداز میں استفادہ کرتے ہوئے زبان وادب کی ترقی وترویج میں موثر کردار بھی ادا کرسکتے ہیں۔ ورنہ ہماری حالت بھی یہی ہوگی کہ

وہ ایک بوند جو پھیلاؤ میں سمندر تھی
الجھ کے رہ گئی مٹی کے چند ذروں سے

Reference:

(1) McLuhan, Marshall, Understandin Media. (Gingko Press,1964,2003)P.6.

(2) htttp//Moravia.com/blog/Email Article, posted by Lee Densmer on Mon, Jan 07,2013

(3) London School of Public Relations Blog, September 18,2013 by Nina Jasilek in Social Media.

(4) Baig MKA. "Standardization of Urdu Script". Indian Journal of Applied Linguistics. Vol.17th. No.2, July-Dec., This Special Issue on "Language Standardization"

(5) Mohiuddin, Saleem, Mazmoon e Taza, Educational Pulishing House, 2016. P-34

■

Dr. Saleem Mohiuddin
Associate Professor & Head
Dept. of Urdu
Shri Shivaji College
Parbhani - 431401 (MS)
Mob.:9923042739

محمد وصی اللہ حسینی

عصر حاضر میں تصویری صحافت کی معنویت

عصر حاضر میں تصویری صحافت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اچھے اور بڑے اخبار اس پر کافی توجہ دے رہے ہیں۔ ایسا بلا وجہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوٹو جرنلزم سے ذرائع ابلاغ کے اثر وافادیت میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ اظہار و ترسیل میں بصری ذریعہ سمعی ذریعے سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ الفاظ کے ذریعے اتنی آسانی سے اپنی بات نہیں کہی جاسکتی ہے جتنی آسانی سے تصویروں کی زبانی۔ اسی لیے ڈرامے کو ترسیل کا سب سے طاقتور ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ فارسی کا محاورہ ہے 'شنیدہ کے بود مانند دیدہ'۔

تصویری صحافت کا رواج انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اردو میں اس کا چلن بہت بعد میں ہوا۔ ایسا تکنیکی مجبوری کے سبب ہوا۔ اردو اخبارات چوں کہ لیتھو پر چھپتے تھے اس وجہ سے تصویری اشاعت بہت مشکل تھی۔ جبکہ انگریزی اور یورپی زبانوں کے اخبارات ورسائل ٹائپ میں شائع ہوتے تھے۔ فوٹو جرنلزم کی تاریخ میں قلمی تصویروں کا رواج 1607 سے ہو چکا تھا۔ لیکن 1839 میں فوٹو گرافی کی باقاعدہ ایجاد سے تصویری صحافت میں انقلاب آگیا۔ امریکہ کے مقبول عام رسالوں لائف، لُک اور پریڈ، انگلستان کے پنچ میگزین، السٹر یٹیڈ لندن نیوز، پیرس کے لا السٹریشن، جرمنی کے السٹرائٹ زیٹنگ اور ہندوستان کے السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا نے تصویری صحافت کے فروغ میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ اردو میں تصویری صحافت کے فروغ میں پیسہ لاہور، الہلال کلکتہ، ہفت روزہ ریاست، روزنامہ احسان لاہور، ہفت روزہ ہمارا پنجاب، ہفتہ وار باتصویر، شمع نئی دہلی اور بلٹز بمبئی کا اہم مقام ہے۔ اردو میں بلاک پرنٹنگ کے بعد تصویری صحافت کا آغاز ہوا لیکن آفسیٹ طباعت کے بعد اس میں انقلاب آگیا۔ آفسیٹ طریقہ طباعت کے بعد تصویری صحافت کے شعبے میں اردو کسی زبان سے پیچھے نہیں رہی۔ آج ڈیجیٹل فوٹوگرافی کا دور ہے۔ اس تکنیک کے آنے سے تصویروں کے معیار میں کافی بہتری آگئی ہے۔ اسی تکنیک کی وجہ سے شہری صحافت (Citizan Journalism) کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا۔ آج کوئی بھی شخص جسے تھوڑا بہت نیوز اور فوٹو سینس ہے وہ بڑی آسانی سے شہری صحافی بن سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک تصویر ایک ہزار الفاظ کا متبادل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے آج ہر اخبار کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر اہم خبر کے ساتھ تصویر ضرور ہو۔ اس کے بغیر خبر ادھوری سی لگتی ہے۔ دراصل تصویر دیکھ کر آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ واردات، واقعہ یا حادثہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کچھ حادثات یا واقعات ایسے ہوتے ہیں جنہیں تصاویر کے بغیر واضح نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی معاملے میں کچھ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور قاری کو باخبر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ایسے وقت تصویریں بہت کام آتی ہیں کیونکہ وہ بغیر کہے سب کچھ بتا دیتی ہیں بلکہ اور موثر طریقے سے واقعے کو بیان کر دیتی ہیں۔ قلم اور کیمرے کا رشتہ بے حد حساس ہوتا ہے۔ ان کا بڑی احتیاط اور تخلیقیت کے ساتھ استعمال ہوگا تبھی کام بنے گا۔ ذرا سی بے احتیاطی کسی بھی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے۔ خبر اور فوٹو میں ایک بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ خبر کو توڑا مروڑا جا سکتا ہے۔ مگر فوٹو میں ایسا ممکن نہیں۔ فوٹو بغیر کچھ کہے سب کچھ بیان کر دیتا ہے۔ کہاوت ہے 'کیمرے کی آنکھ کبھی جھوٹ نہیں بولتی'۔ ایک اور اہم بات

یہ ہے کہ اخبار پڑھنے کے لیے خواندہ ہونا ضروری ہے۔ جب کہ تصویر دیکھنے کے لیے خواندہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ ناخواندہ شخص صرف تصویر دیکھ کر بہت کچھ جان اور سمجھ سکتا ہے۔ سروے کے مطابق ہر دس قارئین میں سے نو تصاویر سے دلچسپی لیتے ہیں۔

جس طرح ایک صحافی کے لیے 'نیوز سینس' کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ایک فوٹو گرافر کے لیے 'فوٹو سینس' کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک فوٹو جرنلسٹ کے پاس صرف کیمرہ ہونا ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کے پاس وہ 'نظر' بھی ہونا چاہیے جو تصویروں کی پرکھ رکھتی ہو۔ اس کے علاوہ فوٹو گرافر کو روشنی کی سمجھ، حسب ضرورت لینس استعمال کرنے کی صلاحیت بھی لازمی ہے۔ جب فوٹو جرنلسٹ دل و دماغ دونوں سے کام کرے گا تبھی ایک اچھی تصویر وجود میں آسکتی ہے۔ اردو اخباروں میں عام طور سے تصویر کے معیار پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی۔ اسی طرح اس کی ہیئت بھی عموماً غیر موزوں ہوتی ہے۔ آدمی اظہار تعزیت کر رہا ہے تو ہنستی ہوئی تصویر لگی ہے۔ غصے میں زہر اگل رہا ہے تو مسکراتی ہوئی یا جامد و ساکت تصویر لگی ہے۔ جبکہ تصویر کا انتخاب خبر کی نوعیت، ماہیت، کیفیت اور موقع و محل کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔

پہلے اخبارات میں صرف مخصوص تصویریں ہی شائع کی جاتی تھیں لیکن اب ہر طرح کی تصویریں شائع ہونے لگی ہیں۔ مثلاً سیاسی و سماجی اور ثقافتی و مذہبی جلسوں، روزمرہ کی زندگی سے متعلق دھرنا، احتجاج، موسم، حادثات، کھیل، جرائم اور تفریح وغیرہ کی تصاویر۔ عام تصاویر کے علاوہ متحرک تصاویر۔ کارٹون، کامکس، نقشے، خاکے، گراف اور قلمی تصاویر جدید صحافت کا اہم حصہ ہیں۔ تصویر جتنی بڑی ہوتی ہے اتنی ہی دلکش ہوتی ہے۔

اخبار میں شائع ہونے والی تصویر کی پہلی خصوصیت یہ ہونا چاہیے کہ وہ Action Photo یعنی بولتی تصویر ہو۔ ساکن تصاویر بھی شائع کی جاتی ہیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ اس زاویے سے لی جائیں کہ زبان حال سے کچھ کہہ رہی ہوں۔ کسی بھی اخباری تصویر کا ایک موضوع ہونا ضروری ہے۔ اخبار میں شائع ہونے والی تصویر اصل ہونا چاہیے۔ اصل تصویر میں ترمیم و تنسیخ مناسب نہیں۔ تصویر کشی کے وقت اگر کوئی چیز غیر ضروری محسوس ہو تو تصویر کھینچنے سے پہلے درخواست کر کے اسے ہٹوا دینا چاہیے۔ بعد میں تبدیلی غیر اخلاقی بات ہے۔ ایسا کرنے سے فوٹو گرافر اور اخبار دونوں کا وقار مجروح ہوگا۔ کبھی کبھی خاص مواقع پر کئی تصویروں کو یکجا کر کے شائع کیا جاتا ہے تاکہ خاص موقع کی اہمیت میں اضافہ ہو۔ صحافتی اصطلاح میں اسے فوٹو مونٹیج (Photo Montage) کہتے ہیں۔ مثلاً یوم جمہوریہ، یوم آزادی، عیدین، ہولی و دیوالی، کرسمس اور دیگر تیوہار۔ کسی سرکردہ شخصیت کے انتقال پر بھی کئی تصاویر یکجا شائع کی جاتی ہیں۔

جس طرح خبر کی اشاعت سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا ہے اسی طرح تصویر کی اشاعت سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ تصویر کے انتخاب کے لیے عام طور پر دو باتوں پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ایک فوٹو میں خبر کی اہمیت اور دوسرے نیوز پرنٹ پر شائع ہونے کی صلاحیت۔ تصویر میں خبر کی کیا اہمیت ہے، یہ عموماً تین باتوں پر منحصر ہے۔ (الف) شخصیت (ب) خبر یا اطلاع کی اہمیت (ج) ہدف جامد ہے یا حرکت میں۔ تصویر میں خبر کی اہمیت فی الواقع چار انسانی حوالوں پر منحصر ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کا وجود، محبت و نفرت کا جذبہ، کچھ کر گذرنے کی خواہش، زندگی سے فرار کی کوشش۔

تصویری صحافت میں متحرک تصویر کو ساکت تصویر کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بولتی تصویروں سے خبر میں جان پڑ جاتی ہے۔ ایکشن فوٹو گرافی کے دائرے میں عموماً کھیل، اہم شخصیات، چرند و پرند، معصوم بچے اور مجرمانہ واقعات آتے ہیں۔ ایکشن فوٹو گرافی سے قبل احتیاط کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ تصویر کشی دراصل وقت کو قید کرنے کا فن ہے۔ تصویر خبر یا واقعے کو صرف معتبر یا موثر ہی نہیں بناتی بلکہ اس میں ایک کشش بھی پیدا کرتی ہے۔ خوبصورت، زندہ، حقیقی اور معتبر تصاویر کے لیے فوٹو گرافر کو کیمرہ اور اس کے تمام ساز و سامان کی معلومات ہونا چاہیے۔ کیمرے کی کوالٹی، فلم اور روشنی کے علاوہ کئی تکنیکی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ فوٹو گرافر کو پہلے ہی کیمرے اور اس کے متعلقات کی بخوبی جانچ کر کے ایک مقام متعین کر لینا چاہیے تاکہ بھیڑ میں کسی مخصوص شخص پر فوکس کر کے تصویر لی جاسکے۔ ایسی صورت میں تصویر کشی بھی ہو جائے گی اور متعلقہ شخص کو خبر بھی نہ ہوگی۔ ایکشن فوٹو گرافی میں چوں کہ وقت بہت کم ہوتا ہے اس وجہ سے چوکسی اور مستعدی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے ہی موضوع سامنے سے گزرے گا اسے فوراً ہی فوکس کر کے بٹن دبانا ہوگا۔ ایکشن فوٹو گرافی میں خود اعتمادی، دوراندیشی، سوجھ بوجھ اور تیز رفتاری سے کام کرنا ہوگا ورنہ پلک جھپکتے ہی موضوع ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔ موضوع کے درمیان میں آنے والی رکاوٹوں کو پہلے ہی دور کرنا ہوگا کیوں کہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اکثر فسادات اور مظاہروں میں تصادم کے دوران فائرنگ، خشت باری، آنسو گیس، چاقو زنی اور املاک کے نقصان کی تصویر کشی کے وقت کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بارہا ناخوشگوار حالات کے دوران خفیہ تصویر کھینچنے کے لیے جان تک خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ایسے حالات میں بڑی دانشمندی سے محفوظ مقام کا انتخاب کرنا چاہیے۔ بہت دور تک مار کرنے والے ٹیلی لینس کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ویسے اچھے فوٹو گرافر کسی شخص کے چہرے کی کیفیت کو دیکھ کر اپنے کیمرے میں قید کر لیتے ہیں۔ انسان خواہ جامد و ساکت ہی کیوں نہ بیٹھا ہو اس کی جذباتیت اور چہرے کے نقوش میں ایک طرح کی حرکت ہوتی ہے جو تصویر کو پرکشش اور دلچسپ بناتی ہے۔ اس طرح کی تصویر کو کینڈڈ فوٹو گراف (Candid Photograph) کہتے ہیں۔

تصویر میں خبر کی اہمیت کے بعد یہ غور کیا جاتا ہے کہ فوٹو نیوز پرنٹ پر شائع ہو پائے گا یا نہیں۔ اس کے لیے فوٹو میں تین اہم خصوصیات ہونا ضروری ہے۔

(1) تصویری ہدف فوکس میں ہونا چاہیے۔ وہ پس منظر یا آس پاس کی اشیا میں گڈمڈ یا دھندلا نہ نظر آئے۔ تصویر کی آؤٹ لائن بھی واضح ہونا چاہیے۔

(2) اگر تصویری ہدف کے ساتھ آس پاس کی چیزوں کو بھی واضح دکھایا جانا ضروری ہو اور فوٹو گرافر ایسا دکھانے سے قاصر رہا ہو تو تصویر اشاعت کے قابل نہیں رہتی۔

(3) فوٹو کے رنگوں یا ٹونس میں کنٹراسٹ وافر ہونا چاہیے۔

کسی بھی اخبار میں صفحہ اول کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کسی میگزین کے کور پیج کو۔ اسے اتنا خوبصورت اور پرکشش ہونا چاہیے کہ قاری دیکھتے ہی خریدنے پر مجبور ہو جائے۔ لیڈ نیوز کے ساتھ اچھی تصویر تو ضروری ہے ہی لیکن صفحے پر دیگر خبروں کے ساتھ یا آزادانہ طور پر مزید تصویریں بھی موزوں مقامات پر ہونا چاہئیں۔ آج کل اس بات کا بھی بڑا رواج ہے کہ اندرونی صفحات پر شائع ہونے والی تصاویر صفحہ اول پر اخبار کے نام کی پٹی پر بھی رنگین چھوٹی سائز میں شائع کی جاتی ہیں۔ اس کا صفحہ نمبر بھی درج کیا جاتا ہے۔ اس سے قاری کو اندر کے صفحات پر شائع ہونے والی خبریں پڑھنے کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔ عموماً صفحہ اول پر ایک بڑی اور خوبصورت تصویر شائع کی جاتی ہے۔ صفحہ اول پر ایسی تصویر شائع کرنے سے گریز کیا جاتا ہے جسے دیکھتے ہی قاری کا دل مکدر یا مضطرب ہو جائے۔ فحش، خون اور مسخ شدہ لاش کی تصویر شائع کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

نیوز فیچر کے لیے بھی تصویر کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایسی تصویر کو اصل خبر شائع ہونے کے کچھ دن بعد بھی اخبار کے اندر کے صفحات پر شائع کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر ایسی صورت میں ایسے واقعات سے متعلق ایک اچھی تصویر منتخب کر لی جاتی ہے جسے پہلے دن خاص طور سے شائع کیا گیا تھا۔ اس تصویر کو آئندہ دنوں میں اسی واقعہ سے متعلق خبروں اور مضامین کے ساتھ بار بار شائع کیا جاتا ہے تاکہ تصویر کو دیکھتے ہی قارئین سمجھ جائیں کہ یہ خبر اس واقعہ سے متعلق ہے۔ مبنی بر خبر مضامین کے لیے نئی تصاویر اخبار کی فوٹو لائبریری سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ کبھی کبھی 'آف بیٹ' تصاویر بھی اس لیے شائع کی جاتی ہیں تاکہ اخبار میں کچھ نیا پن کا احساس ہو۔ کیوں کہ عموماً اخبار سیاسی یا جرائم کی خبروں اور تصاویر سے بھرے ہوتے ہیں۔ تازگی کا احساس دلانے کے لیے ایسی تصویریں شائع کی جاتی ہیں۔

تصویر کے ساتھ اس کا کیپشن بھی بیحد ضروری ہے۔ فوٹو کا کیپشن اور عنوان اسی فوٹو گرافر کے ذریعے لکھا جاتا ہے جس نے وہ فوٹو کھینچا ہے۔ لیکن فوٹو ایڈیٹر اسے مزید بہتر بنا سکتا ہے۔ کیپشن لکھتے وقت کم سے کم الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس میں یہ معلومات ضروری ہے کہ تصویر میں کیا دکھایا گیا ہے، اسے کہاں اور کیوں کھینچا گیا ہے۔ اکثر اخبارات تصویر کے اوپری حصے میں ایک سرخی دیتے ہیں جسے اوور لائن (Over Line) کہتے ہیں۔ تصویر کے نیچے جو وضاحت دی جاتی ہے اسے کٹ لائن (Cut Line) یا کیپشن (Caption) کہا جاتا ہے۔ تصویر کا کیپشن لکھنا خبر کی سرخی لکھنے کی طرح ایک تخلیقی فن ہے۔ تصویر کے نیچے دی جانے والی وضاحت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر عام قاری تصویر کی تفصیل سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ عام قاعدہ ہے کہ کیپشن دو سطروں سے زیادہ نہ ہو۔ اگر بہت ضروری ہو تو تین سطروں کی اجازت ہے۔ تصویر میں نظر آنے والے افراد کی شناخت کے لیے دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں لکھنا ضروری ہے۔ اگر گروپ فوٹو میں قطاریں ہوں تو پہلی قطار اور دوسری قطار ضرور درج کیا جائے۔

عام طور سے فوٹو کا انتخاب اخبار یا میگزین کی پالیسی یا خبر کی اہمیت کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر بڑے اخباروں میں تصاویر کے انتخاب اور ان کے صفحات کے تعین کے لیے تین رکنی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں نیوز ایڈیٹر، فوٹو ایڈیٹر یا چیف فوٹو گرافر اور نیوز کوآرڈینیٹر یا اسسٹنٹ ایڈیٹر رکن بنائے جاتے ہیں۔ لیکن بعض اخباروں میں یہ کام اکیلے فوٹو ایڈیٹر یا چیف فوٹو گرافر انجام دیتا ہے۔ اگر ایسی صورت حال ہو تو تصویر کے صحیح انتخاب اور موزوں مقام پر اس کی اشاعت کے لیے فوٹو ایڈیٹر یا چیف فوٹو گرافر کو شعبہ ادارت سے تعاون لینا چاہیے۔ کبھی کبھی فوٹو میں تصویری ہدف کے علاوہ غیر ضروری اشیا بھی آجاتی ہیں جن میں اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں فوٹو ایڈیٹر پرنٹ پر ان غیر ضروری حصوں پر نشان لگا کر اسے الگ کر دیتے ہیں۔

آج کل فوٹو ایڈیٹنگ کے لیے کمپیوٹر سافٹ ویئر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ نگیٹیو کو بھی نگیٹیو اسکینر سے اسکین کر کے کمپیوٹر پر فوٹو کی ایڈیٹنگ ممکن ہے۔ اس وقت ڈیجیٹل کیمرے کا زیادہ رواج ہے۔ ایسی صورت میں کیمرے کی فلاپی یا میموری اسٹک (Memory Stick) سے کمپیوٹر پر ایڈیٹنگ کی جاتی ہے۔ فوٹو ایڈیٹنگ کے وقت صحافتی اقدار کا خیال رکھا جانا بہت ضروری ہے تاکہ اخبار کی وقعت میں کوئی کمی نہ آئے۔ سافٹ ویئر کی مدد سے ایڈیٹنگ کرتے وقت تکنیکی طور پر فوٹو کو پرکشش بنایا جاسکتا ہے۔ یعنی اس کے کنٹراسٹ وغیرہ کو ٹھیک کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس میں دکھائے گئے صحافت کے حقیقی پہلو میں کوئی رد و بدل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ فوٹو ایڈیٹ کرتے وقت ایسا بھی کچھ نہیں کرنا چاہیے جس سے فوٹو کے بارے میں قاری کے دل میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔

اخبارات کے لیے تصویر کشی کوئی آسان کام نہیں۔ خبر کے مطابق تصویر کی فراہمی کے لیے فوٹو گرافر کو بڑی جد و جہد، تگ و دو اور جستجو کرنا پڑتی ہے۔ خوب سے خوب تر تصویریں کیمرے میں قید کرنے کے لیے موسم کی پروا کیے بغیر سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ بلکہ موسم جتنا خراب ہوگا تصویر کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہوگی اور فوٹو گرافر کی تگ و دو مزید بڑھ جائے گی۔ لکھنؤ کے سینئر فوٹو جرنلسٹ ترلوچن سنگھ اپنا ایک تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تپتی دوپہر میں سڑک پر چند گنتی کے راہ گیر نظر آرہے تھے جو سورج کی تپش اور لو کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے اپنے سروں اور چہروں کو کپڑے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ انھیں افراد کے بیچ سے اسکوٹر چلاتے ہوئے میں اس پر تپش موسم کی تصویر تلاش کرنے نکلا تھا۔ تصویر کی تلاش و جستجو میں گومتی کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں چائے کی گمٹی دیکھ کر چائے پینے کی طلب جاگ گئی۔ چائے دیتے دکان دار نے ریڈیو کی سوئچ گھما دی اور کانوں میں ایک پرانا فلمی نغمہ 'تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی' بج اٹھا تو بے ساختہ کہہ اٹھا یہی تو میں کہنا چاہ رہا تھا۔ چائے پی کر تازہ دم ہوا دفعتاً نظریں گومتی کے پانی میں ہوا بھرے ٹیوب پر کھڑے ہو کر ڈبکی لگانے جا رہے کچھ بچوں پر پڑی اور کیمرہ آنکھوں سے جا لگا اور پھر تو تصویریں فلم پر قید ہوتی چلی گئیں۔ 44 ڈگری درجہ حرارت کی خبر کے ساتھ تصویر اخبار کے پہلے صفحے پر جگہ پائی۔ تصویر کشی کے پیشے میں ہر سنجیدہ نیوز فوٹو گرافر کے ساتھ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ کبھی تصویریں مل جاتی ہیں تو کبھی اس کے لیے بھٹکنا پڑتا ہے''۔

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ یہ ویب جرنلزم کا بھی دور ہے۔ بلکہ یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ مستقبل ویب جرنلزم کا ہی زیادہ تابناک نظر آرہا ہے۔ نوجوان نسل کا رجحان ویب میڈیا کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور موبائل فون ہے۔ وہ جب اور جہاں چاہے خبروں اور دیگر مواد کو پڑھ اور دیکھ سکتا ہے۔ پرنٹ اور ویب میڈیا کی تصاویر میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا ہے۔ ویب جرنلزم میں بھی اسی طرح تصاویر حاصل کی جاتی ہیں جس طرح پرنٹ میڈیا میں۔ البتہ ویب سائٹ پر تصاویر کی پیشکش میں کچھ باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بی بی سی نیوز ویب سائٹ کے پکچر ایڈیٹر فل کومز کہتے ہیں:

''وہ واحد چیز جو آپ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ ایسی تصویر لیں جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لے اور وہ آپ کی کہانی پر توجہ مرکوز کر لیں۔ یہ تصویر ایسی ہو جو اپنی طرف مائل کر لے، معلومات فراہم

کرے اور بعض اوقات اس لمحے کے جذبات بھی اپنے اندر سمولے۔''

بی بی سی نیوز ویب سائٹ نے اپنی تصاویر کے لیے کچھ رہنما اصول مقرر کیے ہیں۔ ہم ذیل میں ان کا مختصراً ذکر کریں گے تاکہ اس سے معلوم ہو سکے کہ ویب کے لیے کس طرح کی تصاویر اچھی، مفید اور موثر ہوتی ہیں۔

بی بی سی کے ہدایت نامے کے مطابق منصوبہ بند کمپوزیشن، روشنی کا صحیح استعمال، شکل رنگ اور تناظر ایسی چیزیں ہیں جن سے اچھی تصویریں لینے میں مدد ملے گی۔ یہ بات یاد رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ویب پر زیادہ تر تصاویر لینڈ اسکیپ فارمیٹ میں رہتی ہیں۔ اس لیے اگر عمودی (پورٹریٹ فارمیٹ) میں تصویر لی گئی ہے تو اسے ویب پر دکھانے میں دشواری آسکتی ہے۔ اس بات کا بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ تصویر لیتے وقت کیمرہ نہ ہلے کیونکہ کہ ممکن ہے شٹر اسپیڈ سست ہو۔ اسمارٹ فون کیمرے اچھی روشنی میں تو بہتر کام کرتے ہیں لیکن کم روشنی میں ان کی کارکردگی متاثر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس بات کو بھی ذہن میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ تصویر کے اندر شکل کے عنصر کو کئی طریقوں سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ توازن، قطری خطوط (Diagonal) اور فریم ایسے ہی چند عناصر ہیں۔

سادہ الفاظ میں آپ کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ دیکھنے والی آنکھ مرکزی موضوع کی طرف کھنچے۔ آپ شوخ رنگوں کی مدد سے بھی دیکھنے والے کی توجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ سادہ شکلوں پر مبنی اور بھیڑ بھاڑ سے پاک تصویر عام طور سے اچھے نتائج دیتی ہے۔ پورٹریٹ لیتے وقت کوشش کیجیے کہ تصویر تھوڑا اوپر سے لی جائے تاکہ موضوع اوپر نظر آرہا ہو۔ اس طرح زیادہ بہتر تصویر آتی ہے۔ اس بات کا بھی خیال رکھیے کہ دہری ٹھوڑی نظر نہ آئے۔ ایک تہائی کا اصول اپنائے۔ ایک تہائی کا سادہ لیکن موثر اصول اچھی کمپوزیشن کے لیے کلید کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک تہائی کا اصول یہ ہے کہ تصویر پر دو لکیریں عمودی اور دو افقی سمت میں لگائیں۔ اس طرح آپ کا منظر نو حصوں میں بٹ جائے گا۔ اپنے مرکزی موضوع کو ان لکیروں کے کسی ایک سنگم پر رکھیں۔ موضوع تصویر کے بالکل بیچوں بیچ ہونے کی بجائے اگر ایک طرف کو ہو تو اس سے زیادہ متوازن اور بہتر تصویر بنتی ہے۔ اس بات کا خیال رکھیے کہ آپ کے موضوع کے دیکھنے کی جگہ بچے۔ مثال کے طور پر اگر ایک تیز رفتار کار دکھانا چاہتے ہیں تو کار کے پیچھے کے مقابلے سامنے زیادہ جگہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھیے کہ ضرورت کے تحت اس اصول کو توڑا جا سکتا ہے۔

اگر آپ تصویروں کی زبانی کہانی بیان کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو پہلے سے منصوبہ بندی کرنا ہوگی۔ ایک ہی منظر کی کئی تصویریں لیں۔ پہلی تصویر ممکنہ طور پر تفصیلی تصویر (وائیڈ شاٹ) ہو سکتی ہے جس میں منظر کا محل وقوع دکھائی دے۔ لیکن ہر چیز شامل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس کے علاوہ کہانی کے کرداروں کی دلچسپ اور مختلف تصاویر نیز متعلقہ چیزوں کی قریب سے تصاویر۔

ویب کے لیے تصاویر کی ایڈیٹنگ بھی ایک مشکل

تصویری صحافت ایک دلچسپ اور جرأت مندانہ پیشہ ہے۔ فوٹو جرنلسٹ بہت خطرات بھی اٹھاتے ہیں۔ اس میدان میں زیادہ تر وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے کام ایمان داری سے انجام دیتے ہیں اور اسے محض پیشہ نہ سمجھ کر ہر ایک تصویر کو باقاعدگی سے کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو فوٹو جرنلسٹ اس جذبے سے کام کرتے ہیں وہ بہت جلد کامیاب ہوجاتے ہیں۔

امر ہے۔ تصاویر کا انتخاب کسی امتحان سے کم نہیں۔ اس کے لیے گہری نظر، مہارت اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویب کے لیے تصاویر کی ایڈیٹنگ کے لیے سب سے اچھی تصویریں منتخب کریں، انھیں احتیاط سے کاٹیں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ وہ خبر کی سرخی سے ہم آہنگ ہوں۔ بی بی سی نیوز کے پکچر ایڈیٹر فل کومز تصاویر ایڈٹ کرنے کے لیے درج ذیل تجاویز پیش کرتے ہیں:

☆ آپ نے جو تصاویر لی ہیں یا اپنی اسٹوری کے لیے جمع کی ہیں ان کا غور سے جائزہ لیں۔ انھیں مختلف طریقوں سے کاٹ کر دیکھیں کہ آپ کی کہانی کے لیے ان میں کون سی موزوں ترین ہے۔

☆ تصویر کاٹتے وقت احتیاط سے کام لیں۔ اگر چھوٹی سی تصویر استعمال کرنا ہے تو بہت نزدیک سے کاٹیں۔ لیکن اس بات کو یقینی بنائیں کہ یہ آپ کی کہانی کی اچھے طریقے سے نمائندگی کرتی ہو تاکہ دیکھنے والے متوجہ ہو سکیں۔

☆ اندرونی صفحات پر تصاویر ایسی ہوں جو کہانی کو آگے بڑھائیں، نہ کہ اس میں اس قدر روڑے اٹکائیں کہ قاری دلچسپی کھو بیٹھے۔ ضرورت سے زیادہ تصاویر لگانا بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا کوئی تصویر نہ لگانا۔ ایک اچھی تصویر کئی عامیانہ تصاویر سے بہتر ہے۔

☆ اندرونی صفحے پر کہانی کی مناسبت سے آپ لینڈ اسکیپ، پورٹریٹ، چھوٹی یا بڑی تصویر لگا سکتے ہیں۔

☆ اگر آپ فوٹو شاپ استعمال کر رہے ہیں تو 'لیولز' کی مدد سے تصویر کو کم یا زیادہ روشن کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بات کا دھیان رکھیں کہ سفید حصے سفید دکھائی دیں نہ کہ ہلکے گرے رنگ کے، اور کالے حصے بالکل سیاہ ہوں، نہ کہ گہرے گرے۔

☆ تصاویر کو جے پیگ (Jpeg) فارمیٹ میں سیو کرنا چاہیے۔ اگر آپ فوٹو شاپ یا اس سے ملتا جلتا کوئی پروگرام استعمال کر رہے ہیں تو تصویر کو زیادہ کمپریس نہ کریں۔ بلکہ اسے 'ہائی' کی سیٹنگ پر سیو کریں۔

مختلف سائٹوں پر مختلف سائز کی تصاویر استعمال ہوتی ہیں لیکن بی بی سی 9:16 تناسب کی تصاویر استعمال کرتی ہے اس لیے اپنی تصاویر کو 1080 × 1920 پکسل پر سیو کریں۔ بی بی سی کی تصاویر میں فلٹر کا بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔

اگر آپ تھرڈ پارٹی کی تصاویر استعمال کر رہے ہیں تو اس بات کو یقینی بنائیں کہ آپ کے پاس اسے ہر طرح سے استعمال کرنے کے حقوق موجود ہیں۔ اگر ذرا بھی شک ہو تو انھیں استعمال نہ کریں۔ آج کل بغیر اجازت کے دوسروں کی تصویروں کے استعمال کا چلن عام ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اب ایسا سافٹ ویئر وجود میں آگیا ہے جو کاپی رائٹ والے مواد اور تصاویر کی چوری بتا دیتا ہے لہٰذا بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

کسی بھی شعبے کی طرح تصویری صحافت کے شعبے میں بھی مہارت پیدا کرنے کے لیے خود کو وقف کر دینے کا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔ تصویری صحافت ایک دلچسپ اور جرأت مندانہ پیشہ ہے۔ فوٹو جرنلسٹ بہت خطرات بھی اٹھاتے ہیں۔ اس میدان میں زیادہ تر وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے کام ایمان داری سے انجام دیتے ہیں اور اسے محض پیشہ نہ سمجھ کر ہر ایک تصویر کو باقاعدگی سے کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو فوٹو جرنلسٹ اس جذبے سے کام کرتے ہیں وہ بہت جلد کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آج کل خبر رساں ایجنسیاں بھی تصویریں فراہم کرتی ہیں لیکن بڑے میڈیا ہاؤسز اپنے فوٹو گرافر کی الگ الگ زاویوں سے کھینچی گئی تصاویر کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ ان کی انفرادیت برقرار رہے۔

■

Mohd.Wasiullah Husaini
53/4,Shutur Khana,
Udai Ganj,
Lucknow-226001
Cell:9307282929
Email.: wasihusaini@gmail.com

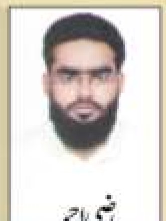

رضی احمد

نوآبادیاتی ہندوستان اور اودھ پنچ کا مزاحمتی کردار

ہندوستان اپنی صنعت وحرفت، زرعی پیداوار اور تجارت کے اعتبار سے شروع سے ہی اہمیت کا حامل رہا ہے، اسی وجہ سے دیگر ممالک کے بہت سے تاجروں اور کمپنیوں نے تجارتی مقاصد کے پیش نظر یہاں کا رخ کیا اور یہاں کے باشندوں اور حکمرانوں نے ان سب آنے والوں کا استقبال کیا اور انھیں ہر طرح کی اعانت اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔ ان ہی غیر ملکی کمپنیوں میں برطانیہ سے آنے والی 'ایسٹ انڈیا کمپنی' بھی ہے جسے مغل حکمراں جہانگیر کے عہد میں تجارت کی منظوری دی گئی، اس کمپنی کے مالک اور اس سے منسلک دیگر عہدیداران انگریز تھے، جن کا مقصد اصلی تجارت کے پس پردہ یہاں کی حکومت پر قابض ہونا تھا اور وہ اول دن سے اپنے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے خاکے اور منصوبے تیار کرنے لگے، اس خواب کی تعبیر جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد ملی شروع ہو گئی، کمپنی کے ذریعے بنگال پر تسلط اور حکمرانی قائم کرنے کے بعد ملک کے دیگر حصوں کا استحصال بھی شروع ہو گیا اور ہندوستان کی دولت انگلستان منتقل ہونے لگی، انگلستان سے تیار شدہ مال ہندوستانی بازاروں میں بڑی تعداد میں فروخت ہونے لگا اور ہندوستان کی صنعت وحرفت تباہ و برباد ہوتی چلی گئی اور نتیجتاً ہندوستان صرف ایک زرعی ملک بن کر رہ گیا۔ انقلاب 1857 کے بعد حکومت برطانیہ نے ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور ایسٹ انڈیا کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس طرح ہندوستان برطانوی نوآبادیات کا حصہ بن گیا اور یہاں سے ہندوستانی باشندوں اور یہاں کے مال ومتاع کے استحصال کا ایک روح فرسا دور شروع ہو گیا۔

نوآبادیات کا مطلب یہ ہے کہ ایک ملک جو اپنے آپ کو مختلف جہات مثلاً نسل، تہذیب، معیشت اور جدید ٹکنالوجی وغیرہ کے اعتبار سے برتر اور ترقی یافتہ سمجھتا ہے وہ ایک ایسے ملک پر قابض ہو کر اسے اپنی محکومی میں رکھتا ہے جسے وہ مذکورہ بالا امور میں کم تر اور پس ماندہ خیال کرتا ہے، اور یہ غیر ملکی اقلیت اس محکوم معاشرے اور قوم کو اس وقت تک اپنی محکومی میں رکھتی ہے جب تک کہ وہاں کی عوام اس نظام حکومت اور افراد حکومت کے خلاف قومی تحریک چھیڑ کر اور جان ومال کی قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو آزاد نہ کرالیں۔ اس نوآبادیاتی طرز حکومت میں محکوم ملک کے باشندوں کو غیر ملکی حکمراں طبقہ اقتدار میں شریک نہیں کرتا، اس طرح وہ محکوم طبقہ حکمران جماعت کا حصہ بننے کے بجائے مکمل طور پر اس کا محکوم ہوتا ہے اور حکمراں طبقہ پوری محکوم آبادی کا استحصال کرتا ہے، محکوم ملک کی معیشت اور وہاں کے مال و دولت کو اپنے ملک کی معیشت کے تابع بنا کر اپنے مقاصد اور مفاد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مظہر مہدی نے مختصر الفاظ میں نوآبادیات کی تعبیر وتشریح ان الفاظ میں کی ہے:

''نسل، تہذیب، معیشت اور ٹکنالوجی کے معاملات میں برتر اور ترقی یافتہ سمجھی جانے والی غیر ملکی اقلیت بالخصوص یوروپیوں کا ان ہی معاملات میں 'کم تر' اور پس ماندہ خیال کی جانے والی، مختلف نسل کی اجنبی اکثریت علی الخصوص افریقی اور ایشیائی معاشروں کو سیاسی، معاشی، تہذیبی اور دانشورانہ محکومی کی حالت میں اس وقت تک رکھنا جب تک کہ وہاں کے عوام اس حکومت کے خلاف قوم پرست تحریک چھیڑ کر اپنے ملک کو آزاد نہ کرالیں، نوآبادیات سے موسوم کیا جاتا ہے۔''

(مظہر مہدی، اردو دانشوروں کے سیاسی میلانات، نوآبادیاتی ہندوستان، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1999، ص 13)

انگریزوں نے ہندوستان کو اپنی نوآبادیات میں شامل کرنے اور ہندوستانی باشندوں پر اپنی سماجی، سیاسی اور تہذیبی برتری قائم کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کیے، انھوں نے یہاں کے مقامی لوگوں کے درمیان مذہب کے نام پر ہندو مسلم میں تفریق پیدا کی تو دوسری طرف ایک ہی مذہب کے لوگوں کو مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیا، کیونکہ ان کے متحد ہونے سے ان کی حکومت کو خطرہ پیدا ہو سکتا تھا، انھوں نے ہندوستانیوں کو کہیں ذات کے نام پر تو کہیں علاقے کے نام پر بھی لڑانے کی کامیاب کوشش کی، انگریز حکمرانوں نے یہاں کے باشندوں اور ان کے تہذیب وتمدن کو غیر مہذب اور بد اخلاق وغیر شائستہ کہہ کر انھیں حقارت کی نظروں سے دیکھا، مقامی باشندوں کے اوپر یورپ سے لائے گئے تہذیب وتمدن کو تھوپنے، اپنی نسلی، سماجی وسیاسی برتری کو

قائم رکھنے اور اپنی عنان حکومت کو بنائے رکھنے کو نوآبادیات کا نام دیا۔ نوآبادیات پر حکومت کے زعم میں طرح طرح کی بندشیں عائد کیں اور نئے نئے قوانین نافذ کیے جن کی مدد سے ان کا برابر استحصال کیا جاتا رہا اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا گیا۔ اسی رویے کی زد میں صحافت بھی آئی۔ صحافت پر بھی بندشیں لگائی گئیں۔ ان پر پابندیاں عائد کی گئیں اسی وجہ سے اس وقت کے جدید وقدیم اخبارات یا تو حکومت کے ہمنوا اور طرفدار تھے اور جو نہیں تھے انھوں نے خوف واحتیاط کی وجہ سے اپنے انداز تحریر اور لہجے کو پست اور نرم کر رکھا تھا اور بڑے محتاط انداز میں خبریں اور مضامین شائع کرتے تھے،

> **نو آبادیاتی ہندوستان میں اس اخبار نے اپنی صحافتی ذمے داریوں کو بخوبی نبھاتے ہوئے قابل تعریف کارنامہ انجام دیا. یہ اپنی نوعیت کا وہ نمائندہ بے باک صحیفہ تھا جس نے انگریزی حکومت کے دبدبے کا لحاظ کیے بغیر ہندوستان میں سب سے پہلے جرأتمندانہ سیاسی تحریک کی بنیاد ڈالی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائی. اودھ پنچ کے مدیر اور دیگر نامہ نگاروں کی بے باکی. اس زمانے کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ، بڑی ہمت کا کام تھا لیکن طنز و ظرافت کے پیرایۂ بیان نے اس مشکل اور نا خوشگوار کام کو آسان اور خوشگوار بنا دیا.**

دھیرے دھیرے فضا معتدل ہوئی اور خوف و دہشت کا ماحول کم ہوا، اب جا کر اردو اخبارات نے حکومت کی بد عنوانیوں اور غلط پالیسیوں کے خلاف لکھنا اور تبصرے شائع کرنا شروع کر دیا، لیکن اس طرح کے نظریات کے حامل اخبارات کی تعداد بہت کم تھی،اسی دور میں 16 جنوری 1877 کو منشی سجاد حسین کی ادارت میں لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری ہوا۔ اس ہفت روزہ اخبار نے اردو صحافت میں جدید طرز نگارش کی بنیاد ڈال کر ایک معین اور مستحکم پالیسی کے تحت اپنے صحافتی سفر کا آغاز کیا، جہاں اس نے مختلف میدانوں میں قابل قدر صحافتی اور ادبی خدمات انجام دیں۔ وہیں اس کا سب سے اہم اور نمایاں کارنامہ نوآبادیات مخالف کردار ہے۔

اودھ پنچ 16 جنوری 1877 کو جاری ہوا اور 1934 میں بند ہو گیا، یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا۔ یہ اپنے طرز کا پہلا اخبار تھا جس کی ایک معین پالیسی، مستقل مقصد اور مسلک تھا، اس نے صحافت کی عام روش سے ہٹ کر طنز وظرافت کا لب ولہجہ اختیار کیا اور سب سے پہلے نہ صرف اردو صحافت بلکہ اردو ادب میں مغربی طنز وظرافت کو رواج دیا۔ یہ اخبار نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں اس وقت قومی اخبار تھا اور قومی خدمت کی غرض ہی سے نکالا گیا تھا۔ اس اخبار کی اشاعت کے ابتدائی ایام ہی میں عوام وخواص کے درمیان اسے شہرت ومقبولیت حاصل ہو گئی اور ملک کے کونے کونے میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ اپنی نمایاں خصوصیات کی وجہ سے اس دور کا نمائندہ اخبار ہو گیا اور اس دور کے بلند پایہ قلم کاروں اور ادیبوں کا قلمی تعاون حاصل رہا، اس اخبار کی کامیابی اور مقبولیت عام کی واضح دلیل یہ ہے کہ اس نے اپنی اشاعت کے ابتدائی دور سے ہی قارئین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کر لیا، اس دور میں جبکہ دیگر عام اخبارات کی تعداد اشاعت دو، تین سو سے زیادہ نہیں ہوتی تھی، اودھ پنچ کی تعداد اشاعت تیرہ ہزار تک پہنچ گئی تھی، اس اخبار کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی نیز اس کے طرز نگارش سے عوامی دلچسپی نے اس طرز کی صحافت کا راستہ ہموار کر دیا اور ملک کے تقریباً 28 شہروں سے 70 کے قریب 'پنچ' اخبارات منظر عام پر آئے۔

اودھ پنچ کا عہد نوآبادیاتی رہا ہے جو بہت ہی پر آشوب اور خلفشار وانتشار کا دور تھا، اس اخبار کے مدیر منشی سجاد حسین جیسا حساس اور نباض قوم اور مشرقی تہذیب وتمدن کا دلدادہ اس دور سے کیسے نبرد آزما نہ ہوتا، لہٰذا انھوں نے اس وقت کے دیگر نمائندہ قلم کاروں کی معاونت سے مغربی تہذیب اور اس کے مضر اثرات سے ہندوستانیوں کو آگاہ ہی نہیں کیا بلکہ ان سے مقابلہ کرنے کے لیے ان کے اندر روح پھونک دی۔ انگریزوں کی طرف سے سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی حملوں کا اس اخبار نے بھرپور مقابلہ کیا اور انگریز حکمرانوں کی طرف سے ہندوستانیوں کے ساتھ کی جانے والی تفریق اور ظلم و زیادتی کو ہدف تنقید بنایا۔

نوآبادیاتی ہندوستان میں اس اخبار نے اپنی صحافتی ذمے داریوں کو بخوبی نبھاتے ہوئے قابل تعریف کارنامہ انجام دیا، یہ اپنی نوعیت کا وہ نمائندہ بے باک صحیفہ تھا جس نے انگریزی حکومت کے دبدبے کا لحاظ کیے بغیر ہندوستان میں سب سے پہلے جرأتمندانہ سیاسی تحریک کی بنیاد ڈالی اور قومی حقوق کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائی۔ اودھ پنچ کے مدیر اور دیگر نامہ نگاروں کی بے باکی، اس زمانے کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے، بڑی ہمت کا کام تھا لیکن طنز وظرافت کے پیرایۂ بیان نے اس مشکل اور ناخوشگوار کام کو آسان اور خوشگوار بنا دیا۔ یہ اخبار انگریزی حکومت کا مخالف، قومی یکجہتی کا حامی، امن وآشتی کا پیغامبر اور طنز ومزاح کا شاہکار تھا۔

اس اخبار کی اشاعت جن مقاصد کے تحت عمل میں آئی تھی ان کے حصول میں اس نے قابل قدر کوشش کی اور برطانوی حکمرانوں کی بدعنوانی کو ہمیشہ اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، نوآبادیاتی ہندوستان میں حکومت کی غلط پالیسیوں اور طرز حکومت، مغربی تہذیب وتمدن کی مخالفت اور مشرقی طرز معاشرت کی حمایت کے ساتھ ساتھ اس نے اردو صحافت میں جدید طرز نگارش کی بنیاد ڈالی، طنز ومزاح سے اردو صحافت کو متعارف کرایا، اردو اخبارات میں کارٹون کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور بامقصد صحافت کی ایک مضبوط بنیاد ڈالی۔ نظم ونثر میں طنز ومزاح نگاروں کی ایک جماعت کو تیار کیا اور اردو ادب میں طنز ومزاح کو رواج دیا۔

■

Razi Ahmad
C-217/2, Fourth Floor, Shaheen Bagh,
New Delhi - 110025
Mob.:9810758952

شہزاد انجم

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی

شخصیت اور ادبی خدمات

یہ عجیب بات ہے کہ اُردو کے مایہ ناز ادیب، شاعر، خاکہ نگار اور ترقی پسند ادبی تحریک کے مجاہد ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کے علمی و ادبی کمالات پر اب تک کوئی مبسوط تحریر نہیں آسکی ہے۔ مثنیٰ رضوی صاحب کے یہاں شعر و نثر کا خاصا ذخیرہ موجود ہے، جس پر یونیورسیٹیوں میں ایک نہیں بلکہ دو تین تحقیقی مقالے لکھے جاسکتے ہیں۔ جب 3 اگست 2009 کو اُن کا انتقال اُن کے لائق فرزند رضوان مثنیٰ کے دولت کدے پر لکھنؤ میں ہوا تو مثنیٰ رضوی صاحب کا ماتم لکھنؤ کے ساتھ دہلی، گیا، بھوپال اور دوسرے شہروں میں بھی کیا گیا۔ میں نے اُس زمانے میں ایک تاثراتی مضمون مثنیٰ رضوی صاحب پر لکھا تھا۔ وہ مضمون میں نے وہاب اشرفی صاحب کو ممبئی میں ساہتیہ اکادمی کے ایک سمینار کے بعد ہوٹل میں سنایا تھا۔ وہاب اشرفی صاحب کو ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی صاحب سے ایک خاص قربت تھی۔ وہاب صاحب ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی صاحب کی علمیت، ذہانت اور وضع داری کے حد درجہ قائل تھے۔ انھوں نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں وہ مضمون ان کے رسالے مباحثہ میں اشاعت کے لیے دے دوں۔ میں نے بخوشی اسے قبول کیا اور وہ مضمون انھیں سپرد کر دیا اور وہ مضمون اُن کے رسالہ 'مباحثہ' میں شامل ہوا۔ میری نظر سے ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر کوئی دوسرا مضمون اب تک نہیں گزرا ہے۔ ممکن ہے مضامین لکھے گئے ہوں لیکن وہ میری نظروں سے اوجھل ہوں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کا مجھ پر بہت بڑا قرض ہے میری تربیت اور سنوار نے سجانے میں انھوں نے بڑی محنت کی۔ بھلے ہی کالج کے زمانے میں فلسفہ میرا موضوع نہ رہا ہو لیکن شعر و ادب کے تعلق سے ادب کی تفہیم تحریکات اور رجحانات کو روشناس کرانے میں ان کا بڑا رول رہا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے جب میں اکثر صبح و شام ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتا اور ان سے گھنٹوں علمی و ادبی موضوعات پر گفتگو کرتا۔ ان کا دروازہ ادیبوں، شاعروں، طالب علموں اور ان تمام افراد کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا جو ان کے شناسا تھے۔ کبھی کبھی انجانے لوگ بھی تشریف لاتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے۔ چند احباب ایسے تھے جو پابندی سے ان کے یہاں حاضر ہوتے اور دیر تک بیٹھتے۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی صاحب تمام افراد کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے۔ وہ اکثر احتشام حسین، عابد حسین، ڈاکٹر ذاکر حسین، مسیح الزماں، زوّار حسین، اعجاز حسین، مونس رضا، آل احمد سرور، راہی معصوم رضا، اختر انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، سہیل عظیم آبادی، باقر مہدی، علامہ جمیل مظہری، کلام حیدری، شبیہ الحسن، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد حسن، ممتاز حسین، قمر رئیس، خورشید الاسلام، شارب ردولوی، سید محمد عقیل رضوی، اقبال مجید، مظہر امام، وہاب اشرفی، نیّر مسعود، جابر حسین، علی سردار جعفری، سبط بھائی، انجم اعظمی، مہدی جعفری، علی حماد عباسی صاحب کا ذکر کرتے۔ غرض کہ یادوں کا ایسا خزانہ ان کے سینے میں موجود تھا جسے وہ اکثر ورق ورق ہمارے سامنے پڑھتے، بیان کرتے۔ ان کے علاوہ اشتیاق عابدی، زبیر رضوی، وحید اختر، غیاث احمد گدی، شکیل الرحمٰن، گوپی چند نارنگ، حسن نعیم، سید محمد حسنین، معین احسن جذبی، کلیم الدین احمد، قاضی عبد الودود، شہاب جعفری، فصیح ظفر، تاج انور، علیم اللہ حالی، شاہد احمد شعیب، احمد یوسف، رام لعل، کمال احمد صدیقی، جعفر رضا، عابد سہیل، لطف الرحمٰن، حسین الحق وغیرہ کی علمی و ادبی و تخلیقی کارناموں کا بیان کرتے۔ ان میں سے بیشتر شعرا و ادبا سے میری واقفیت ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی صاحب کی ہی زبانی ہوئی۔ جب بھی وہ فراق گورکھپوری اور آر کے گرگ یا کسی بھی ادیب و شاعر کا ذکر کرتے تو ایسی زبانی تصویر بناتے، نقشہ کھینچتے کہ ان افراد کی شخصیت، علمیت، ادب سے وابستگی کی پوری تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی۔ جن ادیبوں اور شاعروں کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر سے ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کے ذاتی تعلقات تھے۔ کئی ادیبوں اور شاعروں مثلاً علی سردار جعفری، قمر رئیس، اشتیاق عابدی، شبیہ الحسن، نیّر مسعود، انیس اشفاق، جابر حسین، وغیرہ سے میری ملاقات مثنیٰ صاحب کے ساتھ یا ان کے توسط سے ہوئی۔

مثنیٰ رضوی صاحب کا ادب سے ایسا گہرا رشتہ اور ایسا کمٹ منٹ تھا کہ وہ بس اسی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ ہمہ وقت مطالعہ کرنے، ادیبوں سے ملاقاتیں کرنے، نئی نسل کی تربیت کرنے اور تخلیقی فنکاروں سے بحث و مباحثہ میں مصروف رہتے۔ انھوں نے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کی۔ کبھی کسی سے رنج ہوتے تو بہت کم دیر کے لیے پھر اسی طرح ملاقاتوں، باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نہایت وضعدار، روادار، اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ اقدار کے حامل انسان تھے۔ ان کے یہاں ایسی نیکیاں اور خوبیاں دیکھنے کو ملتی تھیں جن کا اب فقدان ہے۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مضمون نگاری سے کیا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران ہی وہ خلیل الرحمٰن اعظمی اور اپنے دوسرے دوستوں باقر مہدی، راہی معصوم رضا کی حوصلہ افزائی سے تنقید نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ مثنیٰ صاحب کے مضامین اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے خاکہ نگاری کی صنف کو اپنایا اور کئی بہترین خاکے لکھے۔ آخری دنوں میں انھوں نے اپنی توجہ شاعری کی طرف مبذول کی اور دیکھتے ہی دیکھتے چند برسوں میں تقریباً ڈیڑھ دو سو غزلیں کہہ ڈالیں۔ اس دوران متعدد کتابوں پر تبصرے بھی لکھے اور ہندی میں 'بھارتیہ راجستی: یادوں کے درپن میں' کتاب

بھی تصنیف کی جواب تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ جسے میں نے ان کے صاحبزادے رضوان مثنیٰ صاحب سے مطالعہ کرنے اور مقالہ لکھنے کے لیے مستعار لیا ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی صاحب کی تنقید پر گفتگو کروں؟ خاکہ نگاری کو موضوع بناؤں؟ یا ان کے شعری کارناموں کو روشنی میں لاؤں؟ یا ان کی غیر مطبوعہ ہندی کتاب پر تبصرہ کروں؟ یہ عجیب بات ہے کہ جب میں نے ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی پر مضمون لکھنے کا ارداہ کیا تو صرف ان کی کتاب خاکوں کا مجموعہ ''یہ لوگ'' میرے پاس تھی، جس پر ان کے دستخط موجود ہیں اور انھوں نے 26 جون، 1992 کو مجھے یہ کتاب عطا کی تھی۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی صاحب سے میں نے یہ سیکھا کہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کس طرح کی جاتی ہے۔ یہ کتاب فروری 1983 میں انڈین لیتھوگرافر چپلی کیشنز، میکلوڈ گنج، گیا سے کلام حیدری صاحب کے زیر نگرانی شائع ہوئی جس کی کتابت میرے والد مرحوم قمر نظامی صاحب نے کی تھی۔ اس کتاب کا انتساب ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نے اپنے مرحوم بھائی علی مثنیٰ کے نام کیا تھا اور ایک شعر درج کیا تھا:

چاندنی افسردہ، گُل بے رنگ و بو، نغمے اُداس
اک تیرے جانے سے ہائے کیا کہوں کیا ہوگیا

اس کتاب میں خواجہ غلام السیدین، علامہ جمیل مظہری، احتشام حسین، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، کلام حیدری، راہی معصوم رضا، آر کے گرگ اور مظہر امام کے خاکے موجود ہیں اور انھوں نے ابتدائیہ میں یہ لکھا کہ:

''یادوں پر مبنی یہ خاکے فنی اور اصطلاحی نقطۂ نظر سے نقادانِ فن کی نگاہ میں خاکہ کی تعریف پر پورے اترنے کے مستحق ثابت ہوں گے یا نہیں اس کے متعلق میں کیا عرض کروں؟ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ یادوں کی خلش ہائے پنہاں کے طفیل تاثرات اور باقیات کے بیان سے میں نے بعض شخصیتوں کی تصویر کشی کی ہے۔''

ابتدائیہ میں انھوں نے مزید لکھا ہے۔

''یہ خاکے اس گنجِ گراں مایہ کی دین ہیں جس کی طرف اختر انصاری نے اپنے مشہور شعر۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میں نہایت موثر اور خوبصورت انداز میں اشارہ کیا ہے۔''

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کے درج بالا اقتباسات سے ان کے خاکوں کو سمجھنے میں ہمیں بڑی مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کا حافظہ غضب کا تھا۔ وہ بیس تیس برسوں کی پرانی یادوں اور باتوں کو اس طرح پیش کرتے جیسے کہ وہ کل ہی کی بات ہو۔ ان خاکوں پر اُن کی یادوں کا گہرا نقش دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی صاحب نے اپنے خاکوں میں مرقع نگاری کا ایسا کمال دکھایا ہے کہ رشک آتا ہے۔ انھوں نے یہ خاکے اپنے اُن بزرگوں، ادیبوں اور دوستوں پر لکھا ہے جن سے ان کی قربت اور ذہنی ہم آہنگی تھی۔ انھوں نے اپنے خاکوں میں دیانت داری اور متانت وخلوص کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے قلم میں بڑی تاثیر ہے۔ وہ جب بھی کسی کا نقشہ کھینچتے، اس شخص کی جیتی جاگتی تصویر اُبھر آتی۔ 'یہ لوگ' میں پہلا خاکہ خواجہ غلام السیدین کا ہے۔ سیدین صاحب سے ان کی ذہنی ہم آہنگی اور ملک میں گرتی قدروں کا مظاہرہ انھوں نے جس بے باکانہ انداز سے کیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

''21 دسمبر کو پٹنہ کا اخبار 'انڈین نیشن' دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک ایسی خبر پر نظر پڑی جس کے لیے ذہن بالکل تیار نہیں تھا۔ خواجہ غلام السیدین کا 67 برس کی عمر میں قلبی حملہ کے باعث انتقال ہوگیا۔ اتنی اہم خبر، انتہائی غیر اہم گوشہ میں چند جملوں میں چھپی تھی۔ نمایاں طور پر چھپتی بھی کیسے؟ سیدین صاحب گھٹیا درجے کے سیاست داں یا جاہل قسم کے وزیر تو تھے نہیں۔ اپنے دیش میں انمول رتنوں کی قدر ہی کب ہوئی ہے۔''

چند جملوں میں ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نے خواجہ غلام السیدین سے اپنی عقیدت اور ان کی عظمت کا بیان جس انداز میں کیا ہے اس سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں اور علم کی قدردانی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک خاکہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ چند واقعات کو پیش کرکے اس شخص کے اوصاف، خوبیوں یا کمیوں کی نشاندہی کرے نہ کہ براہ راست اس کی خوبی اور خامی پر گل افشانیٔ گفتار کا دروازہ وا کردے۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کے خاکوں میں واقعات کے بیان کا موثر انداز اور ایک خاص سلیقہ ملتا ہے۔

علامہ جمیل مظہری سے انھیں خاص نسبت تھی۔ مثنیٰ رضوی صاحب نے ان کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ ان کے دل کی وسعت، فراخی، مہمان نوازی، شاعری اور انکساری وخاکساری کا ذکر کیا ہے۔

مثنیٰ رضوی، پروفیسر سید احتشام حسین کے عاشقوں میں تھے۔ وہ احتشام حسین کی علمیت، خطابت، ترقی پسند تحریک کی وکالت، شعر و ادب سے ان کی غیر معمولی دلچسپی، رواداری، وضعداری، دوست داری، کنبہ پروری اور خلوص کا ذکر اکثر کرتے۔ اپنے اس خاکے میں انھوں نے احتشام حسین کی ان تمام خوبیوں کو پیش کیا ہے۔ اس زمانے میں سہیل عظیم آبادی نئے اور پرانے تخلیق کاروں اور نقادوں کے لیے صرف 'سہیل بھائی' تھے۔ ان کے انتقال پر مثنیٰ رضوی نے اپنے خاکہ ''سہیل عظیم آبادی کچھ یادیں، کچھ باتیں'' میں لکھا ہے۔

''سہیل بھائی تو چلے گئے مگر اپنے بے شمار چاہنے والوں کی زندگی میں ایسا جذباتی اور روحانی خلا چھوڑ گئے جس کا پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ ایسی تھی ان کی شخصیت۔ دلنواز اور ہمہ گیر۔ سہیل بھائی نے بڑی خوددار طبیعت پائی تھی... سخت آزمائشی حالات میں بھی سہیل بھائی نے اپنی وضع قائم رکھی۔ ادھر ایک عرصے سے ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ لیکن ان کے کام کرنے کی لگن اور ان کی کج کلہی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا... اچانک ان کے انتقال کی خبر ملی۔ دل مسوس کر رہ گیا اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ لگا جیسے زندگی کا سونا پن اور بڑھ گیا ہے، سناٹا اور گہرا ہوگیا ہے۔''

ان سطور سے سہیل عظیم آبادی کی شخصیت کے نقوش ہم پر عیاں ہوتے ہیں ساتھ ہی ڈاکٹر مثنیٰ رضوی کے قلم کی روانی، سلاست اور دردمندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اختر انصاری کے بڑے قائل تھے۔ ان کی کتاب 'ایک ادبی ڈائری' کی خصوصیات اور ادبی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے یہ قبول کیا ہے کہ ان کی ادبی اور ذہنی تربیت میں اس کتاب کا بھی اچھا خاصا حصہ ہے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران وہ اپنے دوستوں خلیل الرحمٰن اعظمی اور باقر مہدی کے ساتھ متعدد بار اختر انصاری سے ملے۔ اختر انصاری پر ان کا یہ خاکہ نہایت ہی دلچسپ ہے۔ اختر انصاری کے سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، ملاقاتیں کرنے، شاعری، ادب، برجستگی و بے ساختگی وغیرہ کا ذکر جس خوبصورت پیرائے میں کیا ہے، وہ قابل داد ہے۔ اختر انصاری کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''ان کے ڈرائنگ روم کی آرائش، باقاعدگی اور نفاست مجھے شاید کہیں اور کسی ادیب یا پروفیسر کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملی۔ دو چیزیں خاص طور پر نمایاں تھیں کتابوں کا عشق اور پائپ کی محبت۔ ان کی آرام دہ کرسی کے سامنے والی میز پر طرح طرح کے متعدد پائپ پڑے ہوئے تھے اور کمرے میں کتابیں اور رسائل اس قدر سلیقہ کے ساتھ سجا کر رکھے گئے تھے کہ ان الماریوں کو دیکھ کر ایک بار نہایت بد ذوق شخص کو بھی ادب کے مطالعے کا شوق پیدا ہو جائے۔ ان کے ڈرائنگ روم کے ایک ایک نقش سے خوش سلیقگی، رکھ رکھاؤ، اور وقار ٹپک رہا تھا۔

ایسے نستعلیق لوگ واقعی اس دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔''
اختر انصاری کے شب و روز، معمولات، پسند و نا پسند، ادیبوں اور نئی نسل سے ان کی وابستگی، شخصیت کی نرمی اور رچاؤ، علم کے وزن و وقار، گفتگو میں تنوع اور دلکشی، مطالعے کی وسعت اور نظر کی گہرائی، شخصیت کے جوہر، شفقت و ہمدردی کو مثنیٰ رضوی صاحب نے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اختر انصاری مذہب، سائنس، ادب، سیاست، پر بڑی جچی تلی رائے رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو میں ایک خاص دلکشی اور دل نشینی تھی مگر پسند و ناپسند کا اظہار بھی اکثر بڑی بے باکی اور جرأت سے کرتے تھے۔ ایک واقعے کا ذکر مثنیٰ رضوی صاحب نے کیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

''اختر صاحب کے لیے تیسرے درجے کی ادبی تخلیق کو برداشت کر لینا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ ایک دن وہ خلاف معمول کسی ادبی نشست میں شریک ہونے کے لیے چلے آئے اور میری برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ باہر سے آئے ایک شاعر نے نہایت رسمی اور روایتی قسم کی غزل سنانی شروع کی۔ اختر صاحب کا حال دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ جس روحانی کرب سے گزرتے رہے اس کا اظہار ضبط کی ساری کوششوں کے باوجود ان کے چہرے اور آنکھوں سے نمایاں ہوتا رہا۔ غزل ختم ہوئی تو لگا کہ انھیں عمر قید سے یکا یک رہائی حاصل ہوگئی ہے۔ وہ کسی شعر یا فن پارہ کی تعریف رسم کے طور پر کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ واہ واہ کا ان کے یہاں قطعی گزر نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے ادبی جلسوں میں شرکت کرنے سے حتی الامکان پرہیز کرتے ہیں۔''

اختر انصاری پر لکھا گیا ڈاکٹر مثنیٰ رضوی کا یہ خاکہ نہایت عمدہ ہے جس میں مثنیٰ رضوی نے اختر انصاری کے علم وفضل، صاف گوئی، مخلصانہ محبت اور بے ریائی کو پیش کر کے حق ادا کر دیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی سے ڈاکٹر مثنیٰ رضوی کا رشتہ والہانہ تھا۔ ان کے بیشتر خاکوں میں کسی نہ کسی صورت میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے مختلف رنگوں اور جہتوں کا ذکر موجود ہے۔ مشکل سے مشکل وقت میں مثنیٰ رضوی نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو اپنے بے حد قریب پایا۔ اس خاکے میں انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی دلنوازیوں، مہربانیوں، محبتوں اور مروتوں کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی اُردو شاعری کے تعلق سے ان کی فہم اور تنقیدی شعور کا بیان بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کے ایک اور بے حد قریبی دوست باقر مہدی تھے۔ مشہور نقاد، شاعر اور انگریزی کے استاد۔ وہی باقر مہدی جب دہلی سے علی گڑھ آتے ہوئے ٹرین میں کچھ شر پسندوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو چھرے سے زخمی کر کے چلتی ہوئی ٹرین سے نیچے پھینک دیا تھا تو یہ کہہ کر ٹرین سے کود پڑے کہ:

''جب خلیل اس دنیا میں نہیں تو میں زندہ رہ کر اس دنیا میں کیا کروں گا''

ڈاکٹر مثنیٰ رضوی نے اس رفیق خاص باقر مہدی کا بے مثال خاکہ لکھا ہے جس میں باقر مہدی کی صاف گوئی، بے باکی، بے تکلفی، انسان دوستی، ادبی خدمت اور ٹیڑھے پن کا ذکر مختلف واقعات کی روشنی میں موجود ہے۔ مثنیٰ رضوی صاحب کا یہ خاکہ ذرا طویل ہے مگر دلچسپ اور اثر آفریں ہے۔

بہار کے شہر گیا کو ادبی مرکز بنانے اور شہر گیا کی ادبی و اعلیٰ شان کو بلند و نمایاں کرنے میں جن ادیبوں کی خدمات اہم اور نمایاں ہیں ان میں کلام حیدری کا نام سر فہرست ہے۔ مثنیٰ رضوی نے 'کلام حیدری: چند یادیں' کے عنوان سے اپنی یادوں کے نقوش کو قلم بند کیا ہے۔ وہ کلام حیدری جو ترقی پسند ادبی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ ہفتہ وار مورچہ اور مشہور ادبی رسالہ ماہنامہ 'آہنگ' کے ایڈیٹر تھے۔ مرزا غالب کالج گیا کے بانیان میں تھے۔ اُن کا شمار گیا کے متمول افراد میں ہوتا تھا۔ وہ اہم ترقی پسند افسانہ نگار اور معروف صحافی تھے۔ کلام حیدری نے نئے تخلیقی فن کاروں کو اپنے رسالہ آہنگ کے ذریعے شہرت عطا کی۔ 'آہنگ' کے اداریے کی گونج اس زمانے میں ہند و پاک میں سنائی دیتی تھی۔ وہ کاروباری مصروفیات کے باوجود شعر و ادب سے حد درجہ دلچسپی رکھتے تھے۔ مثنیٰ رضوی نے کلام حیدری کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں کو اپنے اس خاکے میں پیش کیا ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

'ریناہاؤس' (کلام حیدری کے مکان کا نام) ہمیشہ ادبی جلسوں کا گہوارہ رہا ہے۔ میں جن دنوں کا ذکر کر رہا ہوں یہ گہما گہمی اپنے شباب پر تھی۔ ادبی و شعری جلسے بڑی باقاعدگی کے ساتھ ہوتے تھے۔ مقامی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ مہمان ادبا اور شعرا بھی اکثر شریک ہوتے تھے۔ شعری و نثری تخلیقات پر ان جلسوں میں بہت کھلی بحثیں ہوتی تھیں اور عام طور پر ان کا معیار خاصا بلند رہتا تھا۔... ان محفلوں اور مجلسوں سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا... کاہل سے کاہل ادیب سے کچھ لکھوا لینے کا گُر بھی انھیں خوب آتا ہے۔... نوجوان ادیبوں کی ادبی کاوشوں میں وہ خاص طور پر دلچسپی لیتے ہیں... تخلیقی فنکار اور نظم و ضبط، یہ دونوں چیزیں عام طور پر ایک دوسرے کی ضد سمجھے جاتے ہیں لیکن کلام صاحب کے یہاں معاملہ برعکس ہے۔ ان کے یہاں زندگی میں نظم و ضبط، ترتیب اور خوش سلیقگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔''

اس طرح کے متعدد جملے اس خاکے میں موجود ہیں جن سے کلام حیدری کی شخصیت اور ادب سے ان کی گہری وابستگی کو سمجھنے میں ہمیں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نے راہی معصوم رضا، آر کے گرگ، اقبال مجید، مظہر امام، عبدالصمد وغیرہ پر بھی خوبصورت اور عمدہ خاکے لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن شخصیات پر ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نے قلم اٹھایا ہے ان سے مثنیٰ صاحب کا گہرا رشتہ تھا، احترام تھا، پیار تھا، جس کی مٹھاس اور جذبے کی پاکیزگی ان کے خاکوں میں موجود ہے۔ ان کی تحریر میں بڑی جاذبیت ہے۔ زبان میں بناؤ سنگار نہیں ہوتا۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کا انداز بیان عالمانہ اور پُر وقار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی خاکہ نگاری پر کوئی تحقیقی کام کیا جائے۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کو شاعری سے خاص شغف تھا۔ وہ رسائل و جرائد کا کثرت سے مطالعہ کرتے۔ شعری مجموعوں سے انھیں خاص دلچسپی تھی۔ ممکن ہے نوجوانی میں اپنے علی گڑھ کے دوستوں کے ساتھ رہ کر انھوں نے شاعری شروع کی ہو۔ چونکہ اس زمانے کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا جہاں آل احمد سرور، معین احسن جذبی، وحید اختر، اختر انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، باقر مہدی جیسے شعرا ہوں اور اُن کی صحبت میں شب و روز اٹھنا بیٹھنا ہو، احتشام حسین، اعجاز حسین اعظم گڑھ اور اکبر پور کی مجلسیں، محفلیں اور محبتیں ان کے خمیر کا حصہ ہوں تو بھلا شاعری سے وہ دامن کش کیسے رہ سکتے تھے؟ میری جب ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی صاحب سے ملاقات کا آغاز ہوا تو اس زمانے میں ان کی زیادہ توجہ خاکہ نگاری اور تنقید نگاری پر تھی لیکن اچانک ایسا کیا واقعہ ہوا کہ مثنیٰ رضوی صاحب نے عمر کے آخری پڑاؤ میں غزل کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لیا؟ ممکن ہے گیا کی ادبی محفلیں اور شاہد اختر صاحب کے ساتھ روز کا اٹھنا بیٹھنا انھیں شاعری کی طرف کھینچ لایا ہو اور پھر مثنیٰ صاحب نے کثرت سے غزلیں کہیں۔ بھلے ہی ان کی شہرت کا سارا دارو مدار غزلوں پر نہ ہو لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ ان کی تقریباً دو سو غزلیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کی غزلیں سادگی اور سوز و گداز سے لبریز ہیں ان کے انداز بیان میں متانت اور پختگی ہے۔ ان کی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ غزلیں میرے پیش نظر ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گری گری گھوم کے دیکھا، ہم کو لگے انجانے لوگ
اپنی اپنی سب کو پڑی ہے، درد سے ہیں بیگانے لوگ

آگ لگانا کھیل تھا جن کا، درد کے لالہ زاروں میں
شعلۂ سوزاں سے لرزاں ہیں، آج وہی فرزانے لوگ

سرمایۂ حیات ہے بس یادِ رفتگاں
اب زندگی سے سارے سنہرے وہ پل گئے

کوئی بتاؤ کہ اس کاروبارِ ہستی میں
وہ کیا کرے جسے سوداگری نہیں آتی

ہر ایک قدم پہ یہاں وحشتوں کے سائے ہیں
نہ جانے کیسی یہ بستی بسا رہے ہیں لوگ

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کے درج بالا اشعار میں غزل کا ایک خاص کلاسیکی رنگ عیاں ہے۔ زمانے کا کرب اور فکر کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے کلام پر ایک یاس انگیز فضا چھائی ہوئی ہے اس کا سبب شاید ان کا فلسفیانہ اور مفکرانہ مزاج ہے۔ ان کے بعض اشعار میں خودی اور انا کا شائبہ بھی موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

امیرِ شہر کے آگے جھکیں گے کیا ہم لوگ
ہمارا سر تو سرِ دار بھی جھکا ہی نہیں

جرأت اہلِ شوق کی، شانِ قلندری تو دیکھ
تختۂ دار پر بھی سر، اونچا رہا جھکا نہیں

اہلِ خرد تو ایسے گرے پھر نہ اُٹھ سکے
دیوانے گرتے گرتے بھی آخر سنبھل گئے

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کا شعری مزاج شدت جذبات اور عصری حسیت سے لبریز ہے۔ اندازِ بیان دلکش ہے۔ شعروں میں تاثیر ہے۔ میں نے صرف چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شہرت کا مدار غزل پر بھی ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اساتذۂ سخن کی پیروی کی ہے مگر اس میں کچھ بانکپن بھی لانے کی سعی کی ہے۔ محمد مثنیٰ رضوی نے اعتدال و توازن کو قائم رکھا ان کے یہاں عشقیہ اشعار بھی کثرت سے موجود ہیں لیکن ان کا عشق مجازی ہے۔ وہ عشق کی مختلف کیفیتوں کا اور حسن کی مختلف شکلوں کا بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے یہاں ہوسناکی نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نے اپنی غزلوں کو دلکش ترکیبوں اور خوبصورت لفظوں سے سجایا ہے جی چاہتا ہے چند اشعار مزید پیش کروں۔ ملاحظہ ہوں ان کے یہ اشعار:

رنگ پہ آ گئی محفل جو چھڑا ذکر اس کا
کتنی گل ریز ہے اُس کے لب و رخسار کی بات

بارہا ترکِ محبت کی قسم کھائی ہے
ایسے عالم میں مجھے یاد وہ آئے ہیں بہت

شکوے تمام ہجر کے دل ہی میں رہ گئے
تجھ سے ملے تو ہم تیری یادوں میں بہہ گئے

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کی زبان پختہ ہونے کے ساتھ دلکش اور شیریں ہے۔ ان کا ادبی ذوق بے حد رچا ہوا اور بالیدہ تھا۔ وہ ایک اچھے نثر نگار اور ناقد بھی تھے۔ انھوں نے مشہور شاعر علامہ جمیل مظہری کے کلام کا انتخاب بھی کیا تھا جو مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی کے متعدد تنقیدی مضامین ملک کے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ انھوں نے کئی کتابوں پر اور کئی ادبا و شعرا پر باقاعدہ مضامین لکھے۔ انھوں نے محض اکیس برس کی عمر میں 1949 میں 'اُردو ادب کی ترقی میں علی گڑھ کا حصہ' موضوع پر مقالہ لکھا تھا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رشید احمد صدیقی اور اختر انصاری کی صدارت میں ہونے والے جلسے میں پیش کیا تھا۔ اس مقالے کو ڈاکٹر عابد حسین نے اپنے اخبار 'نئی روشنی' میں شائع کیا تھا۔ جب نیاز فتح پوری نے رسالہ نگار کے لیے پچیس برس کے دوران شائع شدہ مضامین میں سے 16 مضامین کا انتخاب شائع کیا تھا تو نوجوان لکھنے والوں میں صرف خلیل الرحمن اعظمی اور مثنیٰ رضوی کے مضامین شائع ہوئے تھے۔ انھوں نے پوری زندگی ادب کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ وہ سیکولرزم کی بقا کے لیے عمر بھر لڑتے رہے۔

انھوں نے "Humanism and Nehru's Scientific Concept of Life" موضوع پر انگریزی میں مقالہ لکھا اور انھیں شعبۂ فلاسفی کی جانب سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ افسوس کہ ان کا یہ مقالہ شائع نہیں ہو سکا۔ کاش یہ مقالہ انگریزی میں اور اُردو میں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہوتا تو ہمیں نہرو جی کے نظریات اور مثنیٰ صاحب کے فلسفے کو سمجھنے میں مدد ملتی۔

آخری دنوں میں ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی صاحب "بھارتیہ راجنیتی یادوں کے درپن میں" موضوع پر کتاب لکھ رہے تھے۔ وہ کافی کمزور ہو چکے تھے۔ وہ لیٹے لیٹے اپنے بڑے بیٹے غلام الثقلین عرف رنو صاحب کو لکھواتے رہتے۔ انھوں نے فکشن کے انداز میں 'بھارت چھوڑو آندولن' کی تحریک سے اس کتاب کا آغاز کیا ہے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل، مولانا آزاد کی گرفتاری ان کے جیل جانے، انقلابیوں اور انگریز افسروں کے درمیان کی رسہ کشی اور اہنسا وادی آندولن کا ذکر کیا ہے۔ اسکول کے بعد الہ آباد یونیورسٹی اور وہاں کی سیاسی ہلچل کانگریسی اور مسلم لیگی کارکنان کی سرگرمیوں، 'آنند بھون' کی سیاسی ہلچل، کمیونسٹوں کی سیاسی بصیرت، ڈاکٹر امرناتھ جھا کی دانش مندی وغیرہ کو پیش کیا ہے۔ یہ ایک بے حد دلچسپ کتاب ہے۔ ہر صفحے پر ہندوستان کی سیاسی تاریخ ثبت ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت، ہندوستان کی آزادی اور پھر ہندوستان کی آزادی کے بعد مختلف سیاسی پارٹیوں کی حکمرانی، ان کی دانش مندی اور ناعاقبت اندیشی پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ مختلف حکومتوں کے بارے میں انھوں نے اپنی بیباک رائے بھی دی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس ملک کو مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے نظریات و افکار سے روشنی و بصیرت حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور انھیں کے اصولوں پر چل کر ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ کتاب بھی مسودے کی شکل میں موجود ہے اور شائع نہ ہو سکی۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ یہ کتاب ہندی میں اور ترجمہ ہو کر اُردو اور انگریزی میں بھی شائع ہوتی۔ بلا شبہ یہ کتاب ہندوستانی سیاسی تاریخ کی اہم دستاویز ہے۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نے لاأبالی پن، بے نیازی اور غیر مرتب انداز میں زندگی بسر کی۔ بس مطالعے کا انھیں حد درجہ شوق تھا۔ ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں کرنا، شاگردوں کی تربیت کرنا، اپنے عزیزوں اور احباب پر جان چھڑکنا، اُن کا شیوہ تھا۔ وہ بے ریا، بے غازہ، بے نیاز انسان تھے جن کے پاس اپنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سارے مسائل ادب کے تھے۔ کسی سے ان کی ذاتی رنجش نہیں تھی۔ نظریاتی اختلاف ضرور تھا۔ وہ علم و حلم، خاکساری اور انکساری سے بھرے ہوئے انسان تھے۔ اُن کے انتقال کی خبر جب مجھے ملی تو مجھے شدید صدمہ پہنچا۔ والد کے انتقال کے بعد اُن کے بچے یتیم ہو جاتے ہیں مگر ایک شفیق، انتہائی مخلص اُستاد کے اٹھ جانے کے بعد ان کے شاگرد کیا کہلائیں، میں سوچنے لگا تھا اور اب بھی یہی سوچتا ہوں۔

■

Prof. Shahzad Anjum
Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

موجودہ تعلیمی نظام میں
سوشل ورک پروفیشن کی اہمیت وافادیت

ابواسامہ

صنعتی انقلاب اور سرمایہ داری کے درمیان انتہائی گہرا ربط ہے اور یہ دونوں ہی مظاہر جدید دنیا کی بنیاد ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے ماقبل نظام یعنی جاگیردارانہ معاشرے کے بیشتر عناصر میں جارحانہ تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان میں سے ایک بڑی تبدیلی مزدور طبقے کی آمد تھی۔ (یہ تبدیلی بنیادی طور پر شہروں میں واقع فیکٹریوں میں واقع ہوئیں جہاں مزدوروں کی ضرورت تھی اور اس ضرورت کی تکمیل روزگار کی تلاش میں شہر کا رخ کرنے والے افراد کرتے تھے جن میں مرد اور عورت دونوں شامل تھے۔ مزید برآں اس طبقے کے پاس اپنی محنت کے سوا اور کوئی مالی یا معاشی ذریعہ نہیں تھا) یہ تمام تر تبدیلیاں عظیم انگلستان میں ہورہی تھیں جہاں سب سے پہلے صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ اور ملکوں کی دریافت نے یورپی ممالک کو سرمایہ داری اور سامراجیت پر آمادہ کیا جس کے نتیجے میں تاجروں اور امرا پر مشتمل ایک خاص طبقہ وجود میں آیا جس نے علمی وسائل، اقتدار اور دولت کے ایک بڑے حصے پر اجارہ داری قائم کرلی تھی۔ اشرافیہ اور حکمراں دونوں ہی طبقے ایک دوسرے کو اختیار اور اور وسائل پر دسترس کے سلسلے میں تقویت دے رہے تھے۔ سماج کا ایک بڑا طبقہ ان مراعات سے محروم رہا مگر ساتھ ہی ساتھ فلاح و بہبود پر مبنی جذبہ بھی پیدا ہوا۔ اسی جذبے کے تحت انگلینڈ اور امریکہ میں باقاعدہ طور پر ایک عمل کا ظہور ہوا جسے ہم پیشہ ورانہ سوشل ورک کے نام سے جانتے ہیں۔ دور حاضر میں ہندوستان اور بیرونی ممالک کے قومی اور بین الاقوامی اداروں میں ایک ڈسپلن کے طور پر سوشل ورک کی تدریس خصوصی توجہ کی حامل ہے۔

اس مختصر مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ سوشل ورک کے بنیادی پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے اور مختصر طور پر اس ڈسپلن کے وسیع دائرہ کار اور اس کی نوعیت وخدوخال کی وضاحت کی جائے۔ دراصل سوشل ورک کے موضوعات کی فہرست طویل اور جامع ہے۔ انسان کی پیدائش سے لے کر انسانی ترقی، انسانی حقوق، پسماندگی، غریبی اور اس کے اسباب، غریبی سے پیدا ہونے والے مسائل جیسے روٹی کپڑا مکان، تعلیم، روزگار، صحت، سہولیات کی دستیابی وغیرہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام مسائل سوشل ورک کے دائرۂ کار میں آتے ہیں۔ سوشل ورک کی ابتدائی فلسفیانہ اساس مذہبی جذبات اور تاثرات پر مبنی تھی جس میں منظم اور پیشہ ورانہ (مہارت، اخلاقیات، اقدار، اصول وضوابط اور خاص علمی مواد) پہلو کے بجائے ہمدردی اور نیک نیتی کا غلبہ زیادہ تھا۔

سوشل ورک پروفیشن کی ابتدا انگلینڈ اور امریکہ میں ہوئی اور سو سال سے زائد عرصے میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں مختلف مراحل سے گزرتا ہوا عصر حاضر میں یہ ایک نہایت اہم ڈسپلن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ سوشل ورک کو بطور ڈسپلن تو مقبولیت حاصل ہوگئی لیکن اسے بطور پروفیشن مسلمہ حیثیت حاصل کرنے میں طویل عرصہ لگا۔ روز مرہ کی سرگرمیوں پر تکیہ کرنے کے رویہ کی مخالفت کرتے ہوئے سوشل ورک کے قائدین نے ایک متحدہ پیشہ ورانہ تنظیم کی بنیاد ڈالنے پر زور دیا۔ National Conference on Charities and Correction کی میٹنگ میں ابراہیم فلیکسنر نے 'is Social Work a Profession?' کے نام سے لیکچر دیا۔ ابراہم فلیکسنر خود گریجویٹ تعلیم پر ایک اتھارٹی تھے اور ان کی شاندار اسٹڈی کی بدولت میڈیکل تعلیم میں خاصی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس کانفرنس کے ذمے داروں کو یہ امید تھی کہ ڈاکٹر فلیکسنر اب سوشل ورک کو ایک پروفیشن کا درجہ دے دیں گے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں کیونکہ انھوں نے پروفیشن کے اجزائے ترکیبی کا ذکر کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سوشل ورک ابھی پورے طور پر پروفیشن کہلانے کا اہل نہیں ہے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ سوشل ورک کو اپنی پہچان بنانے کے لیے ایک طویل علمی اور عملی سفر طے کرنا ہوگا۔ اس طرح اگلے کئی برسوں تک سوشل ورکرز اس مشورے پر کام کرتے رہے۔

ارنیسٹ گرین ووڈ کا اہم ترین کام Attributes of a profession کے نام سے 1957 میں شائع ہوا۔ گرین ووڈ نے Relative Approach کا استعمال کرتے ہوئے پروفیشن کی پانچ اہم خصوصیات کی شناخت کی جو مندرجہ ذیل ہیں:

(a) اصولوں کا ایک منظم نظام/ باڈی
(b) پروفیشنل اتھارٹی
(c) کمیونٹی/ آبادی کی منظوری
(d) اخلاقیات کا کوڈ
(e) پروفیشنل کلچر

انھوں نے سوشل ورک میں ان پانچوں خصوصیات کی موجودگی کو ثابت کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ سوشل

ورک ایک پروفیشن ہے۔ ووڈ نے کہا کہ ''جب ہم پروفیشنز کے موجودہ ماڈل کے تحت سوشل ورک کو دیکھتے ہیں تو اسے سمجھنے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگتا۔

ہمیں زیادہ وقت یہ صرف کرنے میں نہیں لگتا کہ ہم اسے پیشہ ور یا غیر پیشہ ور او کیوپیشن میں رکھیں۔ کیونکہ سوشل ورک پہلے سے ہی ایک پروفیشن ہے اور اس کے پاس کئی ایسے نکات ہیں جن کی بنا پر ہم اس پروفیشن کو موجودہ تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔''

اس طرح ڈاکٹر فلیکسنر کے نظریے کی گرین ووڈ نے باقاعدہ طور پر تردید کردی۔ 1958 میں National Association of Social Workers نے سوشل ورک پریکٹس کی ایک عملی تعریف Definition working شائع کی جس پر گورڈن نے زبردست تنقید کی اور جس کے نتیجے میں علم، اقدار اور پریکٹس کے طریقۂ کار میں تبدیلیاں کی گئیں۔ 1960 میں NASW نے اخلاقیات کے کوڈ کو اپنایا تاکہ یہ پیشہ وروں کے لیے ایک رہنمائی کا ذریعہ بن سکے۔ موجودہ زمانے میں سوشل ورک ایک باقاعدہ طور پر تسلیم شدہ پروفیشن بن گیا ہے۔ ہندوستان میں سوشل ورک کی تعلیم کی باقاعدہ شروعات 1936 میں کلفورڈ منشارڈٹ کی قیادت میں دوراب جی ٹاٹا گریجویٹ اسکول آف سوشل ورک سے ہوئی۔ جو بعد میں ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز کے نام سے مشہور ہوا۔ پھر وقتاً فوقتاً مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں اس کورس کا آغاز ہوا اور آج یہ کورس کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان میں سوشل ورک تعلیم ابتدا سے ہی بہت دلچسپ رہی ہے۔ ابتدائی سوشل ورک میں والنٹری سوشل ورک کی روایت رہی ہے جس میں سوشل ورکر یا سماجی خدمت گار شوق اور لگن سے اپنی سماجی خدمات کو انجام دیتے رہے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف شہروں جیسے دہلی، راج گری، ادے پور، ممبئی، مدراس اور اندور میں عیسائی مشنریوں کی جانب سے سوشل ورک اسکولوں کی بنیاد رکھی گئی۔ دوسری طرف گاندھیائی فلسفے سے متاثر ہوکر وارانسی اور احمد آباد میں بھی سوشل ورک کے ادارے کھولے گئے۔

ہندوستان میں سوشل ورک اسکولوں اور سوشل ورک تعلیم کی بتدریج ترقی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:

1. ابتدائی دور (1936-1946)
2. تجرباتی دور (1947-1956)
3. توسیعی دور (1957-1976)
4. درمیانی دور (1977-1986)
5. تیز توسیعی دور (1987 سے اب تک)

1986 میں محض 72 سوشل ورک اسکولوں کی فہرست 2005 میں 172 کی تعداد تک پہنچ گئی۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ پورے ہندوستان میں تقریباً 526 ادارے اس میدان میں خدمات انجام دے رہے ہیں جن میں مرکزی حکومت کے زیر انتظام چلنے والے ادارے، صوبائی ادارے، اداروں سے منسلک ادارے، پرائیویٹ ادارے اور پرائیویٹ کالجوں اور اداروں میں سوشل ورک تعلیم کے کورسز چلائے جاتے ہیں۔ (بجے بھٹ، 2016)

اس کورس کی پہچان ایک جدید اور اہم کورس کی صورت میں ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بدلتے دور میں درپیش نئے مسائل کے پس منظر میں اس کورس کی مانگ توقع سے زیادہ نظر آرہی ہے۔ جنوبی ایشیا کے بیشتر ممالک جیسے ہندوستان، پاکستان، سری لنکا، بنگلہ دیش، جاپان، تھائی لینڈ، ویتنام وغیرہ میں بھی یہ پروفیشن بخوبی اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس فہرست میں ہندوستان کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے جہاں سوشل ورک مختلف سطحوں پر اپنا کام انجام دے رہا ہے۔ آج زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔

پروفیسر ہاجرہ کمار اپنی کتاب سوشل ورک اینڈ ڈیولپمنٹل ایشوز میں لکھتی ہیں کہ ''کیا کسی سڑک کی تعمیر سوشل ورک سرگرمی ہے؟ نہیں لیکن اس سڑک پر کام کر رہے مزدوروں کے حق کی لڑائی بلا شبہ سوشل ورک کے دائرہ کار میں آتی ہے۔ کوئی اسکول کھولنا سوشل ورک نہیں ہے۔ ہاں، مگر اس میں سماجی خدمت یا کونسلنگ پروگرام کرنا، ایک سوشل ورک کا عمل ہے۔''

سوشل ورک کا تعلق سماجی علوم سے ہے۔ سماجیات، نفسیات، معاشیات، سیاسیات اور دیگر علوم جیسے مینجمنٹ، قانون وغیرہ کو ملا کر اس کورس کو نہایت ہی چابکدستی اور خوبصورتی سے ڈیزائن کیا گیا ہے تاکہ ان معلومات کو استعمال میں لاکر سماجی مسائل کو حل کیا جاسکے۔ بہت سارے تعلیمی اداروں میں سوشل ورک کی تعلیم گریجویشن کی سطح پر ہے مگر بیشتر اداروں میں پوسٹ گریجویشن سے اس کی شروعات ہوتی ہے۔

یہاں اس سوال کی گنجائش ہے کہ کیا غریب اور پسماندہ لوگوں کے لیے کام کرنے میں مخصوص مہارتوں اور تکنیکوں کی ضرورت ہے؟ سوشل ورک اور سوشل سروس میں خط امتیاز کھینچنے والی لکیر سائنٹفک اور منظم طریقہ کار ہے۔ چونکہ سوشل سروس میں جذبات اور گہرے لگاؤ کے ساتھ غریب یا ضرورت مند لوگوں کے لیے کام کیا جاتا ہے جس میں ضروری نہیں کہ مہارت، تکنیک، منظم طریقہ کار اور بنیادی معلومات کے ساتھ کام کیا جائے جبکہ سوشل ورک مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے مکمل تیاری، منصوبہ بندی، لائحہ عمل اور اصول وضوابط کے ساتھ ضرورت مند لوگوں کے ساتھ کام کرنے پر زور دیتا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ سماجی علوم کے دیگر مضامین اور سوشل ورک میں قابل ذکر فرق کیا ہے؟ ایک سرسری جائزہ لینے سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ نظریہ (Theory) اور عمل (Practical) کے امتزاج سے یہ پیشہ ایک پیکج کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ فیلڈ ورک سوشل ورک کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسے انسانی زندگی کے زمینی مسائل اور ان کے ابعاد سے روبہ رو کرانے کی غرض سے رکھا گیا ہے۔ یہ ایک طرح کی انسانی تجربہ گاہ ہے جہاں ایک طالب علم لوگوں سے مل کر، مشاہدہ کرکے اور غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ مل کر بہت کچھ سیکھتا ہے اور سوشل ورک کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے۔ اس کے پس پشت سوشل ورک کا یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ طلبا اس کورس سے فراغت کے بعد لوگوں کو بااختیار بنانے اور ان کو انسانی ترقی کے تمام پہلوؤں کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوسکیں۔ دراصل فیلڈ ورک معاشرے کے بنیادی اصولوں، سیاسی ڈھانچہ اور معاشی جدلیات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ پھر مسائل کو سمجھ کر ان پر کام کرنے کے لیے بنیادی مہارتوں کو حاصل کرتا ہے۔

سوشل ورک لٹریچر پر نظر ڈالی جائے تو ایک بنیادی عنصر نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے جو کئی بار سوشل ورک کے اولین فرائض میں شامل رہتا ہے اور وہ ہے مظلوم اور پسماندہ لوگوں کی نمائندگی اور ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کا سلسلہ۔ اس پر عمل کرنے کے لیے باقاعدہ ٹریننگ اور مخصوص مہارتوں کی حصولیابی ناگزیر ہے۔ اس پروفیشن کو دوسرے سماجی علوم سے منفرد ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ اس میں تھیوری اور پریکٹکل کے درمیان ہم آہنگی اور مضبوط ربط کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو اس مضمون کی عمدہ نوعیت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں جہاں انسان نے زبردست دنیاوی کامیابی حاصل کی ہے وہیں دوسری طرف اتنے زیادہ مسائل بھی سامنے آئے ہیں جن کے سامنے بسا اوقات ماہرین علوم بے بس نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں سوشل ورک کا پیشہ نہایت اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مختلف اور نت نئے علوم کو اپنے اندر سمیٹ لینے اور اس کو ضرورت کے وقت استعمال کرنے کی بدولت یہ ایک اہم اور ہمہ گیر ڈسپلن کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ خاطر رہے کہ سوشل ورک کا مکمل تصور اور توجہ انسانی مسائل پر مرکوز ہے۔ یہ اپنے وجود میں آنے سے لے کر اب تک لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے وقف ہے۔ سوشل ورک لٹریچر پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو اس کی ہمہ گیریت اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک پائیدار معاشرے کی تعمیر کے لیے سوشل ورک کس طرح سے انسان کے نفسیاتی، سماجی اور معاشی مسائل پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک میں سوشل ورک کی ذمے داریاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ غریبی، بے روزگاری، ذات پات، علاقائیت، مذہبی تنگ نظری وغیرہ ایسے مسائل ہیں جہاں سوشل ورک کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ غریبی جس کے نتیجے میں جرائم، بے روزگاری (فرد کی ترقی اور معاشی ترقی میں رکاوٹ) ذات پات اور مذہبی تنگ نظری کی وجہ سے مجموعی اعتبار سے معاشرے کے کبھی کام میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور انسانی بھائی چارہ اور امن و امان ختم ہو جاتا ہے۔

دراصل ایک ایماندار سوشل ورکر کا فرض یہ ہے کہ وہ سماجی نا انصافی کو دور کرنے اور انسانی حقوق کے لیے کام کرے تا کہ مظلوم عوام کو ان کا حق مل سکے۔ دوسری طرف ایک طالب علم کو ضرورت مند فرد، گروپ یا کمیونٹی اور وسائل کے درمیان فاصلوں (اور اس فاصلے کی سماجی، سیاسی اور معاشی وجوہات ہیں) کو کم کرنے کے لیے منظم طریقوں کو اپنانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ روایتی سوشل ورک کے فرائض اور ذمے داریوں کو نبھانے کے لیے جہاں ضرورت مند لوگوں (یہ ضرورت ذہنی، جسمانی، جذباتی، معاشی، سماجی، ان میں سے کوئی ایک یا سبھی ہو سکتی ہیں) کی شمولیت کے ساتھ مسائل سے نمٹنے کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا اور سرکاری اداروں اور با اختیار لوگوں کے تئیں بہتر اور پر خلوص رویہ رکھنا سوشل ورک تعلیم کی اخلاقیات کا حصہ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک سوشل ورکر عالمانہ طور یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ پیدا شدہ مسائل کی وجوہات اور جڑیں کہاں پیوست ہیں اور اس کی تدابیر ایسے منظم طریقوں سے کرتا ہے کہ دوبارہ یہ صورت حال نہ پیدا ہو۔ اس کے برعکس کئی ممالک کی حکومتیں اپنے عوام کی نگہبان ہوتی ہیں اور اپنے شہریوں کو ہر طرح کی آزادی کا حق فراہم کرتی ہیں۔ مزید برآں یہ فرد کی ترقی کی ضامن ہوتی ہیں۔ فرد اور ریاست کے اس مثالی رشتے کو برقرار رکھنا اس پروفیشن کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔

> سوشل ورک کی روح اس کے فلسفے میں ہی پنہاں ہے۔ صاحب ثروت اور مقتدر طبقے کے ناجائز اور غیر مناسب رویے اور معاشرے میں معاشی سماجی اور سیاسی عدم مساوات کے خلاف آواز اٹھانا ایک ایماندار سوشل ورکر کا فرض ہے اور یہ جنگ مقامی منظر نامے سے لے کر عالمی پیمانے تک جاری رہتی ہے۔ موجودہ سماجی اور معاشی مسائل کے تناظر میں سوشل ورک ایک کلیدی رول کا حامل ہے۔ ایک پروفیشن کی تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر انسان دوستی کے عناصر سے بھرپور یہ مضمون علمی و تعلیمی میدان میں بھی اپنی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی مسائل کے مختلف پہلوؤں، انسانی رشتوں اور روزمرہ کی زندگی پر اس پروفیشن کی گہری نظر ہے۔

یہاں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ سوشل ورک اداروں سے جڑے تمام ہی لوگ انسان کی بحیثیت مجموعی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ قطع نظر اس حقیقت سے کہ مختلف مکتب فکر کے حامل حضرات اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مرد کی ذہنی، جسمانی اور معاشی ترقی ہی ایک پائیدار معاشرے کی ضامن ہے جیسا کہ بین الاقوامی سوشل ورک کی تعریف سے اس نکتے کی وضاحت ہوتی ہے، ایک سوشل ورکر اس وقت لوگوں کے درمیان داخل ہوتا ہے جب وہ مختلف قسم کی پریشانیوں سے گھرے ہوتے ہیں یا جب دو یا دو سے زیادہ لوگ ہی پریشان ہوتے ہیں۔

قومی انجمن برائے سوشل ورکرز (NASW) 1973 میں سوشل ورک کی ابتدائی صورت حال اور نوعیت کے پس منظر میں کہا گیا ہے کہ "سوشل ورک افراد، گروپ یا مختلف طبقات کی مدد کے لیے ایک پیشہ ورانہ عمل ہے جو کہ ان کے سماجی تعامل کی استعداد کو بڑھا سکے یا بحال کر سکے اور ایسے حالات پیدا کر سکے جو اس کے مقاصد کے حصول کے لیے کارآمد ہوں۔"

اس اکیڈمک پیشہ کی دو بڑی تنظیمیں بین الاقوامی فیڈریشن برائے سوشل ورکرز (IFSW) اور اسکولوں کی بین الاقوامی انجمن برائے سوشل ورک (IASSW) مستقل اس پیشے کے دائرہ کار اور موضوع بحث مسائل کی شمولیت کے سلسلے میں غور و فکر کرتی رہتی ہیں اور تمام دنیا کے پیشہ وروں اور سوشل ورک کے معلمین سے رابطے میں رہتی ہیں۔ سنہ 2004 میں ان دونوں تنظیموں نے سوشل ورک کی ایک جامع تفہیم کی اور کہا کہ "سوشل ورک ایک عمل پر منحصر پیشہ ہے اور ایک ایسا مضمون ہے جو سماجی تبدیلی اور ترقی، سماجی ہم آہنگی اور لوگوں کی آزادی اور خود مختاری کو فروغ دیتا ہے۔ سماجی انصاف، سماجی حقوق، اجتماعی ذمے داری اور یگانگت کے لیے احترام اس مضمون کے مرکزی موضوع ہیں۔"

2014 میں ان بین الاقوامی تنظیموں نے انسانی زندگی کے دوسرے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ "سوشل ورک ایک عمل پر منحصر پیشہ ہے اور ایک ایسا اکیڈمک مضمون ہے جو سماجی تبدیلی اور ترقی، سماجی یوگنگی اور لوگوں کی آزادی اور خود مختاری کو فروغ دیتا ہے۔ سماجی انصاف، سماجی حقوق، اجتماعی ذمے داری اور یگانگت کے لیے احترام اس مضمون کے مرکزی موضوعات ہیں۔ سوشل ورک، سماجی علوم، انسانی علوم اور مقامی علوم کے مباحث سے لیس ہے اور لوگوں کے عوامی مسائل اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے ان کو اداروں شامل کرتا ہے۔" بڑھتے ہوئے مسائل کے پیش نظر اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل میں ان تعریفات میں اضافے کی گنجائش برقرار رہے گی۔

مندرجہ بالا بحث سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ درحقیقت سوشل ورک کی روح اس کے فلسفے میں ہی پنہاں ہے۔ صاحب ثروت اور مقتدر طبقے کے ناجائز اور غیر مناسب رویے اور معاشرے میں معاشی، سماجی اور سیاسی عدم مساوات کے خلاف آواز اٹھانا ایک ایماندار سوشل ورکر کا فرض ہے اور یہ جنگ مقامی منظر نامے سے لے کر عالمی پیمانے تک جاری رہتی ہے۔ موجودہ سماجی اور معاشی مسائل کے تناظر میں سوشل ورک ایک کلیدی رول کا حامل ہے۔ ایک پروفیشن کی تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر انسان دوستی کے عناصر سے بھرپور یہ مضمون علمی و تعلیمی میدان میں بھی اپنی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی مسائل کے مختلف پہلوؤں، انسانی رشتوں اور روز مرہ کی زندگی پر اس پروفیشن کی گہری نظر ہے۔

حوالہ جات:

www.ifsw.org

www.iassw.org

Abu Osama

Asst. Prof. Dept of Social Work

MANUU, Hyderabad- 500032 (Telangana)

پرویز اشرفی

سہسرام... ایک تاریخی اور تہذیبی و ثقافتی شہر

سہسرام ایک ایسا شہر ہے جس کی عظمت اور بلندی پر وقت کی دھول جمتی جا رہی ہے۔ اس سرزمین نے دور وسطیٰ میں خاندان سور اور مغل فرمانرواؤں کے عہد میں سونے کے دن اور چاندی کی راتیں دیکھی ہیں۔ اس کی پیچ و خم کھاتی ہوئی کوتاہ گلیاں، لاہوری اینٹوں سے تعمیر شدہ تاریخی عمارتیں دور قدیم کے رؤسا اور تاریخی شخصیات کے وقار کی داستان کہہ رہی ہیں۔ پتھروں سے بنے خوبصورت محلوں کے کھنڈر ہوتے در و دیوار گزرے دور کی محض باقیات رہ گئیں ہیں۔

سہسرام کی دھرتی اس معنی میں نہایت زرخیز ہے کہ یہاں درویش بھی ہوئے اور عالم بھی، شاعر بھی ہوئے اور ادیب بھی۔ اسی وجہ سے عرف عام میں لوگ اسے پیروں اور فقیروں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ عظیم بادشاہ سلطان فریدالدین شیر شاہ سوری اسی سہسرام کا رہنے والا تھا۔ اس کا مقبرہ آج بھی اس کی عظمت کا تنہا گواہ ہے۔ مشہور مورخ کنگھم نے جسے تاج محل سے بھی زیادہ خوبصورت قرار دیا ہے۔

اس شہر میں مسلمانوں کا پہلے پہل داخلہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کے سپہ سالار بختیار خلجی کے ذریعے ہوا۔ بنگال کو فتح کرنے کے بعد سہسرام سے اس کا گزر ہوا۔ اس کی فوج میں ایک بزرگ تھے جن کا نام سید میر حسن تھا۔ انھوں نے شہسرام کو کفر سے پاک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کی تکمیل کے بعد آپ شہید ہو گئے اور کیمور پہاڑی کی چوٹی پر اپنے جاں نثاروں کے ہمراہ مدفون ہیں۔ عرف عام میں 'چندتن شہید پیر' کے نام سے مشہور ہیں۔ عقیدت مندوں نے ان کی قبر پر ایک بڑا مقبرہ تعمیر کر دیا ہے۔ اس طرح یہاں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ خاندان سور، اس کے بعد مغل دور حکومت میں تو مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی آباد ہو گئی۔ جس کی علمی، روحانی، تہذیبی اور ثقافتی وراثت آج بھی قائم ہے۔

صوبہ بہار کا تاریخی شہر سہسرام کیمور پہاڑی کے دامن میں آباد ہے، جہاں قدرت کے حسین مناظر کو دیکھ کر کشمیر کی وادی کا گماں ہوتا ہے۔ ''خبر نیلی سڑک'' (شیر شاہ سوری روڈ) جسے انگریزوں نے گرانڈ ٹرنک روڈ کہا تھا، کے جنوب میں مغل بادشاہ فرخ سیر کا عطیہ کردہ مدرسہ خانقاہ جسے آج خانقاہ کبیریہ کہتے ہیں اپنے علمی اور دینی فرائض کی روشنی سارے ملک میں پھیلا رہا تھا آج بڑھتی آبادی کا شکار ہو کر اپنی خوبصورتی کھو چکا ہے۔ کرن سرائے، شیخ پورہ، املی آدم خاں، کبیر گنج، دائرہ، منڈئی کشور خان۔ ذکی شہید، شاہ ہارون، شیر گنج، نورن گنج اور مغل پورہ ایسے محلے ہیں۔ جہاں کثیر مسلم آبادی ہے۔ اس وقت یہ محلے چاروں طرف سے اکثریتی فرقے کے محلوں سے محصور ہو چکے ہیں۔

تعلیمی بیداری: 60 کی دہائی میں یہاں غربت تھی۔ بیڑی بنانے کا کام کاروبار تھا۔ خواتین میں تعلیم کا رواج قرآن اور اردو تک محدود تھا۔ لیکن وقت نے کروٹ بدلی 70 کی دہائی میں تعلیم نسواں نے نمایاں مقبولیت حاصل کی اور دیکھتے دیکھتے اس شہر کی تقریباً 80 فی صد خواتین و لڑکیاں میٹرک، بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے ٹیچرس ٹریننگ کر کے تمام طالبہ اس وقت سرکاری اسکولوں میں معلمہ کے عہدے پر فائز ہیں۔ معاشرہ میں علم کی شمع فروزاں کرنے میں تعاون دے رہی ہیں۔ لڑکے بھی پیچھے نہیں گزشتہ سال کئی مسلم لڑکے آئی۔ اے۔ ایس کا امتحان پاس کر کے ملک کے اہم شہروں میں کمشنر اور ایس۔ ڈی۔ ایم کے عہدے پر فائز ہو چکے ہیں اور سہسرام کا نام روشن کر رہے ہیں۔ جو قابل تحسین عمل ہے۔

تاریخی عمارتیں:

اشوک اعظیم کا کتبہ: چندتن پہاڑی کی چوٹی پر مغربی جانب ایک غار میں چٹان پر اشوک اعظم کا مذہبی فرمان کندہ ہے۔ جو یہاں کے بودھ راہبوں کی ہدایت کے لیے بطور اشتہار لگایا گیا تھا۔ اس کی عبارت پالی زبان میں ہے۔ یہ زبان اشوک کے عہد میں عام لوگوں کی بول چال کی زبان تھی۔

حسن خاں سور کا روضہ: محلہ شیر گنج کے مغرب جانب ایک وسیع و عریض خطے پر سہسرام کے جاگیر دار حسن خاں سور کا مقبرہ ہے۔ اسے بادشاہ ہند شیر شاہ سوری نے اپنے والد کی قبر پر تعمیر کرایا تھا۔ افغانی فن تعمیر کا یہ نادر نمونہ ہے۔ اس مقبرے کے مغرب جانب شیر شاہ نے ایک مسجد اور مدرسہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ مسجد میں آج بھی پنجگانہ و جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں۔

سلطان فرید الدین شیر شاہ کا روضہ: پتھروں سے تعمیر یہ عظیم الشان مقبرہ ہندوستان میں اپنے طرز کا واحد اور بہترین نمونہ ہے۔ ہشت پہل بنیاد پر بنا اس کا بالائی حصہ افغان فن تعمیر کا نادر و نایاب نمونہ ہے۔ اس کی سادگی اور فلک نما عمارت سے ہی شیر شاہ کی شخصیت اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مربع میل جھیل کے قلب میں دور سے یہ مقبرہ پانی پر تیرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اپنے طرز کا یہ واحد مقبرہ ہے جو کسی

جھیل کے بیچ کھڑا ہے۔ اس مقبرے کے وسط میں ہندوستان کا عادل بادشاہ سلطان فریدالدین شیر شاہ سوری ابدی نیند ہو رہا ہے، مقبرے کے پہلے درجے میں ایک محراب کے نیچے انگریزی میں یہ عبارت کندہ ہے۔

This Tobib was built for Himself by Sultan Fariduddin Sher shah suri Emperor of India wherein he was Buried. Anno domini 1545."

اس مقبرہ کی بلندی 190 فٹ ہے جو آگرہ کے تاج محل سے 13 فٹ چوڑا ہے اور بیجاپور کے گول گنبد کے بعد اونچائی میں دوسرے نمبر پر ہے۔

سلیم شاہ سوری کا روضہ: یہ شیر شاہ کا فرزند تھا۔ جس نے اپنے باپ دادا کے روضے سے ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنا مقبرہ چھوٹا تعمیر کرانا چاہا۔ شہر کے شمال مغرب کی جانب ایک تالاب کے درمیان میں اس کی تعمیر شروع ہوئی لیکن یہ روضہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ سلیم شاہ سوری کی دنیاوی عمر مکمل ہوگئی اس طرح یہ تاریخی عمارت ادھوری رہ گئی۔ اس ادھورے روضے میں جانے کے لیے محض ایک پل اور چند محرابیں غنیمت یادگار ہیں۔

مساجد:

جہانگیری مسجد: چندن شہید پہاڑی کے دامن میں حضرت نورالدین جہانگیر کے عہد میں 1021ھ کو علی اکبر نامی ایک شخص نے ایک مسجد اور کنواں تعمیر کرایا تھا۔ مسجد کے اندر فارسی میں قطعہ تاریخی کندہ ہے۔

بدر شاہ نورالدین جہانگیر
زمان خان سرور صفدر القاب
علی اکبر چہ و مسجد بنا کرد
کہ تالب تشنگاں گردند سیراب
چو تار منش طلب کردم خرد گفت
زبہر طاعت رزاق وہاب

1241ھ

شاہجہانی عید گاہ: شیر شاہی تالاب کے مغربی کنارے پر مجاہد خاں حاکم سہسرام نے شاہ جہاں کے دور حکومت میں اس عید گاہ کو بنوایا تھا۔ شہر کے لوگ عیدین کی نماز بڑی رونق اور مجمع کثیر کے ساتھ اس میں ادا کرتے ہیں۔

عالمگیری مسجد: ڈھائی کنگورے والی قناتی مسجد سہسرام سے جنوب تارا چنڈی دیوی مندر سے کچھ اوپر پہاڑی پر واقع ہے۔ اندرون مسجد کے چھوٹے کتبے کی پہلی سطریں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد "اللہ کافی" دوسری سطریں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اب اس مسجد کے متصل تارا چنڈی دیوی کے مندر کو مزید اونچا کر دیا گیا ہے جس سے مسجد کا بیشتر حصہ نظر نہیں آتا۔

تیوہار و رسمیں: سہسرام میں ہندو اور مسلمان کثرت سے تیوہار مناتے ہیں۔ خصوصاً مسلمان عید، عیدالاضحیٰ، آخری چہار شنبہ، گیارہویں شریف کا عید میلادالنبی، شب برات اور محرم الحرام اہم ہیں۔ برادران وطن ہولی، دیوالی اور دسہرہ دھوم سے مناتے ہیں۔

سہسرام کا محرم: محرم کا مہینہ ایک خاص جوش وخروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ چاند نمودار ہونے کے دن سے ہی شہر کے ہر محلے میں شہدائے کربلا اور حضرت امام حسینؓ کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی کا نظم

نہایت تزک و اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ سڑکوں اور چوراہوں پر شربت اور پانی کی سبیلیں لگائی جاتی ہیں۔ دس یوم تک شربت فاتحہ کرکے ہر ایک آنے جانے والے کو نوش کرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف محلوں میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی یاد میں علما تقریر فرماتے ہیں۔ ان کے صبر و استقلال کا ذکر ہوتا ہے۔ محلہ کرن سرائے اور شیخ پورہ میں باضابطہ مرثیہ اور منقبت کی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ مختلف محلوں سے اکھاڑے نکلتے ہیں جس میں نوجوان، بوڑھے اور بچے اپنی فن سپہ گری کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ایک اور قابل ذکر چیز 'نعل شریف' نکلتی ہے: جسے لوگ بڑے احترام سے اٹھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس میں ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ اٹھانے والا تیزی سے لے کر بھاگتا ہے۔ (واللہ اعلم) شمشیر زنی اور نیزوں کا بڑا دلچسپ مقابلہ ہوتا ہے۔ اعزادار تعزیہ نکالتے ہیں۔ موتیوں سے تیار تعزیے دیکھی دستکاروں کی فنکارانہ صلاحیت کا بے مثال نمونہ ہیں۔ اگر ہندوستان میں لکھنؤ کا محرم مشہور ہے تو سہسرام صوبہ بہار کا لکھنؤ ہے 9 اور 10 محرم الحرام کو نعل شریف نکلتی ہے جن میں صدر کی دو بڑی نعل شریف اور چھوٹی نعل شریف، شاہ جلال پیرؒ کی نعل شریف اور کالے خاں کی نعل شریف۔ ان کی اہمیت کے متعلق روایت ہے لیکن تاریخ نہیں۔

قدرتی مناظر: سہسرام میں قدرتی مناظر، پہاڑ، جھرنے اور چشمے کثرت سے ہیں۔ اہل سہسرام موسم برسات میں شملہ وکشمیر کا لطف حاصل کرتے ہیں۔ پہاڑی چشموں اور جھرنوں کا پانی نہایت خوشگوار شیریں اور ہاضم ہوتا ہے۔

ریڈیو اسٹیشن اور دور درشن کیندر: اس چھوٹے سے شہر کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں ایک بڑا آکاشوانی کیندر اور ٹیلی ویژن ریلے سینٹر بھی ہے۔ جہاں سے علاقائی پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔

دینی مدارس: دینی علوم کے حصول کے لیے سہسرام میں دو قدیم مدارس ہیں 'خانقاہ کبیریہ' اور دارالعلوم خیریہ نظامیہ" جو فرزندان توحید کے دلوں کو دینی علوم کی روشنی سے منور کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے مدارس ومکتب اپنا فرض انجام دینے میں مصروف ہیں۔ ان کے علاوہ رضا اکیڈمی منڈی کشور خان اور بے بی گارڈن اسکول بھی قابل ذکر ہیں۔

سہسرام ایک شہر نہیں اپنے آپ میں ایک مکمل تاریخ اور تہذیب ہے، شیر شاہ سوری کا سہسرام، اولیاء کرام کا مخزن سہسرام، خوبصورت پہاڑوں اور جھرنوں کا سہسرام، پان بھٹ اور کا دہری کا سہسرام، کجری اور بارہ ماسے کا سہسرام اپنے آنچل میں قدیم روایت، قومی یکجہتی کو سمیٹے ہوئے نئے دور کی طرف بڑھ رہا ہے۔!!

Parwez Ashrafi, Dawat Nagar
D-321, Abul Fazal Enclave
Jamia nagar, Okhla New Delhi-110025
Mob: 09990129128

سر سید کا تصورِ علم

حافظ محمد جہانگیر اکرم

بلاشبہ سرسید احمد انیسویں صدی کے ان یادگار زمانہ عظیم ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی فکرِ عمیق سے قوم وملت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ وہ مصلح اعظم بھی تھے، قومی مدبر اور ماہر تعلیم بھی۔ وہ اردو نثر کے عہد زریں کے معمار بھی تھے اور صاحب طرز انشاپرداز بھی۔ وہ عزم مستحکم، یقیں محکم اور عمل پیہم دل میں لے کر اٹھے۔ وہ فرسودہ رسومات اور بے جا توہمات کی آندھیوں سے بچ جدید علوم کی شمع اپنے ہاتھوں میں لے کر جہالت کی تیرگی کو رفع کرتے رہے اور اس طرح انھوں نے نفسِ سوختہ شام وسحر تازہ کرنے کا کام کیا۔

سرسید احمد خاں کے فکر وعمل کے میدان خصوصاً تین تھے مذہب، سیاست اور تعلیم۔ ان کے علاوہ اگر کچھ تھا بھی تو وہ انھیں نظریات وخیالات کے گرد گھومتا تھا۔ ان کی ادبی حیثیت گرچہ مسلّم اور ثابت شدہ ہے لیکن انھوں نے انشاء وادب کو کبھی مقصد نہیں بنایا بلکہ اپنے مقصد کی حصولیابی کے ضمن میں استعمال کیا۔ جس طرح علامہ اقبال نے شاعری کو مقصد نہیں بنایا بلکہ مقصد کے لیے شاعری کی۔ اسی طرح ادب سرسید کے نزدیک محض تفریحی مشغلہ نہ تھا بلکہ خیالات ونظریات کے اظہار کا وسیلہ تھا۔ حالانکہ نثر میں ان کا طرزِ بیان اور ان کا کل سرمایہ تحریر اردو زبان وادب کا نادر اور ناقابلِ فراموش حصہ ہے لیکن وہ اصلاً مصلح قوم، سیاسی اور مذہبی مفکر تھے۔ لہٰذا ان کے تمام تصنیفی کارناموں کو ان کے عقائد سیاسی، تعلیمی مشن اور افکار دینی کی روشنی میں جانچنا وپرکھنا چاہیے کیونکہ ان کی ادبی حیثیت انھیں چیزوں کے تابع ہے۔

سرسید جس صدی کی پیداوار ہیں وہ بحث ومناظرہ کی صدی ہے۔ اقدار مشرق ومغرب، قدیم وجدید، بدعت وسنت، مذہب وسائنس، جبلت وعقل تمام معاملات میں ایک طرح کا تصادم نظر آتا ہے۔ سرسید ایک صاحبِ فکر اور اثر پذیر شخص تھے اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان تنظیموں اور ہنگاموں کو تماشائی بن کر ایک تفریحی نظر ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔ وہ ساحل سے طوفان کا نظارہ کرنے والوں میں سے نہیں تھے بلکہ اس میں کود کر سینہ سپر ہونے والے بہادروں میں سے تھے۔ اس لیے انھوں نے ہر مورچہ پر عملی حصہ لیا۔ خواہ

عقل اور مذہب کی معرکہ آرائی ہو یا مذہب اور سیاست کا تصادم یا علمِ دین اور دنیوی کی سرد جنگ، ایک بہادر اور جانباز سپاہی کی طرح ہر مورچہ پر ہم انھیں سرگرمِ عمل پاتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا یہ اقتباس پیشِ خدمت ہے:

''غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا، نہ مال واسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا........ جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کردیا اور میرے بال سفید کردیے''۔ (تہذیب الاخلاق)

سرسید احمد خاں یورپ سے درآمد فکر، عقل پسندی سے بہت متاثر ہوئے۔ اس زمانے میں یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ حقیقت تک رسائی اور اس کے ادراک کا بڑا ذریعہ عقل ہے۔ اسی طرح قوانینِ فطرت یا نیچر کا مشاہدہ اور تجزیہ بھی اس صدی کا ایک اہم موضوع تھا۔ نیچر اور فطرت کی اصطلاح نے یورپ کے ادیب ومفکر کو سرشار کر رکھا تھا اور یورپ کا یہ تحفہ جب ہندوستان پہنچا تو یہاں بھی اس کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا۔ سرسید احمد اور ان کے رفقا نے اہلِ مغرب کی طرح نہ صرف اس کا استعمال کیا بلکہ مدتوں اس کو سرآنکھوں پر رکھا۔ اس صدی کے ہندوستان کی ترقی اور ارتقاء کے مغربی نظریوں سے بھی سرسید بے حد متاثر ہوئے مگر یہ امر قابلِ غور ہے کہ ان کو ارتقاء سے زیادہ ترقی کی اصطلاح زیادہ پسند تھی۔

اس عہد کے ہندوستان میں اجتماعیت، سویلائزیشن، تہذیب اور کلچر کے مغربی تصورات کی اشاعت میں سرسید اور ان کے رفقا نے خاص دلچسپی دکھائی اور جدید نظریۂ تہذیب کے ایک بڑے مبلغ اور داعی بن کر سامنے آئے۔ یہی وجہ تھی کہ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' میں تہذیب سے متعلق بہت سے مقالے لکھے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ جہاں ان تصورات نے فکر ونظر کی حدود کو وسعت عطا کی وہاں ان سے زندگی کی جذباتی اور روحانی بنیادوں کو بہت ضعف پہنچا۔ اس کی وجہ سے نجاتِ اخروی کی جگہ موجودہ زندگی کے اجتماعی راحت وآرام نے لے لی اور مذہب کے ساتھ ساتھ اکثر اخلاقی قدروں کے متعلق شک اور تردد پیدا ہوگیا۔

تعلیم کے معاملے میں سرسید کے خیالات ونظریات بے حد مقبول ہونے کے باوجود کچھ زیادہ جدید نہ تھے۔ سائنس وعلوم جدیدہ اور انگریزی زبان کی تعلیم گرچہ اس زمانے میں بڑی کشش رکھتی تھی مگر وہ تعلیم کے معاملے میں اتنے انقلابی نہ تھے جتنا ان کو سمجھ لیا گیا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے سرسید کے انھیں نظریات پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

سید جو گزٹ لے اٹھے تو لاکھوں لائے
ہم قرآن دکھاتے رہے پیسہ نہ ملا

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید انگریزی تعلیم کے حق میں تھے اور اسے پھیلانا چاہتے تھے اور علماء وقت انگریزی تعلیم کو دین کا دشمن سمجھتے تھے۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ علماء کو اختلاف سرسید کے مذہبی عقائد اور انگریزی تہذیب وتمدن سے تھا نہ کہ انگریزی تعلیم کے پھیلاؤ سے۔ اب چوں کہ سرسید انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب وتمدن کے بھی مداح تھے اس لیے بہت سے مغالطے پیدا ہوگئے۔ اسی طرح سرسید نے عربی تعلیم اور قدیم مدارس کے خلاف تہذیب الاخلاق میں کئی مضامین لکھے اس سے بھی ان کے خلاف فضا پیدا ہوئی۔

سرسید کے افکار کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قدیم کے مقابلے میں جدید اور ماضی کے مقابلے میں عہد حاضر سے زیادہ وابستہ نظر آتے ہیں۔ ان کا ذہن تجدد پسند تھا یہی وجہ تھی کہ انھوں نے عہدِ حاضر کے مسائل کی طرف زیادہ توجہ کی اور علم وادب کے جن موضوعات پر لکھا ان میں خاص مقصد یہی تھا کہ جہاں تک ہو قوم وملک کی موجودہ حالت چست ودرست ہو۔ مسائل حاضرہ سے سرسید کی دلچسپی کا اہم ثبوت تہذیب الاخلاق کے ان مضامین میں موجود ہے۔

سرسید احمد نئی تہذیب کو گلے لگانا چاہتے تھے۔ یہ حقیقت ہے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ فیشن پرست تھے اور تہذیبِ نو کی چمک دمک نے ان کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا اور یہ بھی نہیں تھا کہ انھیں اپنے دین ومذہب، معاشرت وروایت سے لگاؤ نہیں تھا بلکہ ان کی چاہت تھی کہ اپنے دین ومذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر اچھی بات اور ہر اچھی چیز کو اپنا لیا جائے جو ترقی کا زینہ بنے۔ وہ چیز خواہ وراثت سے آئی ہو یا پھر نئی تہذیب کے ذریعے۔ اسی طرح ہر بری چیز اور بیجا رسومات کی پیروی جو ترقی میں رکاوٹ ہو انھیں قطعی پسند نہیں تھی اس لیے سرسید نے مذہب کی فرسودہ باتوں کی مخالفت کی اور مذہب کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش کرنے کی اصلاحی کوششیں کرتے رہے اور نئی تہذیب کی اچھی چیز کو اپنانے کی تلقین کرتے رہے اور معاشرے کو اس لائق بنانے کے لیے کوشاں رہے کہ اس کے افراد میں اچھے برے کی تمیز پیدا ہوسکے۔ وہ کھلے ذہن اور پوری آزادی کے ساتھ برائی کو اچھائی میں بدلنے کا ہنر لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی سعی کرتے رہے۔

تمام تر سرگرمیوں کے باوجود سرسید احمد اپنے ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے کچھ وقت نکال لیتے تھے ان کی ادبی دلچسپیوں کا دائرہ بہت ہی وسیع وہمہ گیر تھا۔ تاریخ، سیاسیات، آثار قدیمہ، صحافت، ادب، مذہب اور سائنس جیسے تمام موضوعات پر انھوں نے متاعِ لوح وقلم لٹائے۔ سرسید احمد پہلے شخص تھے جنھوں نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے آزادیِ رائے اور حریتِ خیال کا رواج عام کیا۔ انھوں نے ایک ایسے مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی جس کے حلقے ودائرے میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی سبھی کچھ موجود اور محفوظ تھی۔ انھوں نے کھلے ذہن سے سوچنے وفکر کرنے اور سائنٹفک طور پر کسی چیز کو پرکھنے اور جانچنے کا رجحان رائج کیا۔ اس طرح انھوں نے دین کو جلا بخشنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ ادب کے معاملے میں انھوں نے کلاسکی اور رومان کے بیچ کی چیز کو اختیار کر کے ایک نئی روش کا رواج ڈالا۔ انھوں نے فکر وادب میں روایات واسالیب کو غیر ضروری قرار دیا۔ الغرض ادب میں جو فرسودگی، خشکی، تعطل اور جمود طاری ہوگیا تھا ان کی اصلاحی تحریک سے اس کا ازالہ ہوگیا۔ یہ ان کا انتہائی اہم کارنامہ تھا۔ وہ اردو زبان کے لیے مسیحا بن کر آئے۔ انھوں نے اردو ادب میں جدت، ہمہ گیری، ایک مقصد ادراک اور ایک خاص طرح کی معقولیت پیدا کی ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ادب وزندگی اور ادب ومعاشرے کے رشتے کو استوار کیا۔

''سرسید نے اردو ادب کو خانقاہ، دربار اور کوچہ وبام سے نکال کر دفتروں، تعلیم گاہوں اور متوسط طبقے کے دل ودماغ تک پہنچایا۔ 'تہذیب الاخلاق' کے مضامین میں

سرسید اپنی فکر کی بلندی پر نظر آتے ہیں۔ اس پرچے نے قوم کی ذہنی قیادت، علماء اور رئیسوں کے بجائے متوسط طبقے کے ہاتھوں میں دے دی۔ اس نے دین کی خاطر دنیا کو بھی سنوارنے پر زور دیا۔ باوجود شدید مخالفت کے اس کا اثر ہوا اور لوگ سرسید کے پیام کی طرف تیزی سے متوجہ ہونے لگے''۔ (مضامین سرسید انتخاب۔ ص 9)

انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط و اقتدار کے بعد مسلمانانِ ہند بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے۔ تعلیمی، معاشی و اقتصادی، معاشرتی ملازمتوں اور روزگاروں غرض تمام سہولتوں سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انھیں محروم و بے دخل کر دیا گیا اور سب سے زیادہ فکر کی بات یہ ہے کہ ان کے دین و مذہب پر بھی خطرے کے بادل منڈلانے لگے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ عیسائی مشنری و مبلغین حکومت کی سرپرستی میں سرگرم عمل ہو گئے اور سر ولیم میور نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں اپنی کتاب 'لائف آف محمدؐ' میں نازیبا و ناشائستہ خیالات کا اظہار کیا جس کے جواب میں سرسید احمد نے 'خطباتِ احمدیہ' لکھ کر ان تمام نظریات و خیالات کی تردید کی۔

سرسید چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو علوم جدیدہ حاصل کر کے مذہب کا دفاع کرنا چاہئے اور اس کے تحفظ کے لیے تمام سازشوں اور اسکیموں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ اگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا تو ہندوستان سے مذہب اسلام معدوم ہو جائے گا۔

مغربی تعلیم سے نوجوان مسلمانوں کے مذہبی عقائد پر جو اثر پڑ رہا تھا سرسید اس سے پوری طرح باخبر تھے۔ مذہب کے تحفظ کے لیے دینیات کی تعلیم کے بھی وہ طرفدار تھے لیکن مسلمانوں کے یہاں جو کتابیں دینیات میں داخلِ نصاب تھیں سرسید کے خیال میں وہ اس مسئلے کا سدِ باب کرنے کے لیے ناکافی تھیں جو انگریزی تعلیم کے زیر اثر پیدا ہو رہا تھا اس لیے وہ درسی کتابوں میں ترمیم چاہتے تھے تاکہ اسے پڑھ کر دین کی حفاظت کا شعور پیدا ہو سکے۔

سرسید احمد نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی ضرورت ہے اس لیے اپنی تمام صلاحیت اور قوت اس کام کے لیے لگا دی۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ان کی قوم اس پر آسانی سے رضامند نہیں ہو گی۔ اس کے لیے کافی محنت و کوشش درکار ہے اور اس محنت و مساعی سے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سرسید احمد راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کو اسلام کی صداقت کا یقین کامل تھا۔

"
سرسید انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر اس لیے زور دیتے رہے کہ ان کے خیال میں سائنس، جغرافیہ، حساب وغیرہ کی تعلیم کے لیے اس زبان میں وافر مقدار میں کتابیں دستیاب ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔ حالانکہ حالی اس خیال سے کافی حد تک اختلاف رکھتے تھے۔ ان کی یہ سوچ تھی کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہوتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمّی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔
"

ان کو قرآن کا کتابِ الٰہی ہونے اور حضور ﷺ کے آخری نبی ہونے کا ایمان کامل تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ بے باک، بے خوف اور جرأت مند تھے اس لیے ان کے متعلق یہ رائے قائم کرنا کہ وہ انگریزوں کو خوش کرنے یا ذاتی مفاد کی خاطر بعض باتیں کرتے تھے جو حقیقت پر مبنی نہیں۔ لہٰذا انھیں باتوں سے متعلق اپنے بے تکلف دوست سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں اپنے دل کا حال لکھتے ہوئے سچائی کا اقرار کرتے ہیں:

''میں سچ اپنے دل کا حال لکھتا ہوں اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکلتا اور میں خود تحقیقاتِ حقیقتِ اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقیناً مذہب کو چھوڑ دیتا''۔ (حیاتِ جاوید۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو، ص: 423)

سرسید کا تصورِ تعلیم سب سے زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ کسی بھی قوم کی ترقی و عروج میں تعلیم کا اہم کردار ہوتا ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی تنزلی اور زبوں حالی کی ایک خاص وجہ تحصیلِ علم سے بے اعتنائی ہے۔ علم نہیں ہونے کی وجہ سے معاشرے میں مسلمانوں کی کوئی عزت، قدر اور وقعت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ علم سے پرہیز اور دین سے دوری مسلمانوں کو ذلیل و خوار کر کے چھوڑے گی اور مسلمانوں کی حیثیت وہ ہو جائے گی جس کا ذکر علامہ اقبال نے اس طرح کیا ہے کہ۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اسی راکھ کے ڈھیر میں پھر سے چنگاری جگانے کی کامیاب کوشش سرسید نے کر دکھائی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ چنگاری علم کے چراغ سے پیدا ہو گی اس لیے تعلیم کے فروغ کے لیے اور جدید علوم و فنون کی طرف مائل کرنے کے لیے انھوں نے اپنی اصلاحی تحریک پر خاص طور سے زور دیا۔

سرسید نے دیکھا تھا اور سمجھا تھا کہ جدید علم و سائنس ہی ترقی کی راہیں دکھاتی ہیں لہٰذا عصرِ جدید میں سرسید کی ان تحریکوں کی بڑی اہمیت و افادیت ہے بلکہ اس کی معنویت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی اہمیت و معنویت دائمی ہے۔ آج پورے عالم میں مسلمانوں پر جو خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں اس کا علاج جدید سائنسی علم و ٹکنالوجی میں پوشیدہ ہے۔ جس کے سرسید قائل اور حامی تھے اس لیے مطالعہ سرسید کی اہمیت اور معنویت دائمی حیثیت کی حامل ہے۔

سرسید انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر اس لیے زور دیتے رہے کہ ان کے خیال میں سائنس، جغرافیہ، حساب وغیرہ کی تعلیم کے لیے اس زبان میں وافر مقدار میں کتابیں دستیاب ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔ حالانکہ حالی اس خیال سے کافی حد تک اختلاف رکھتے تھے۔ ان کی یہ سوچ تھی کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہوتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمّی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔ بہرحال اس بحث سے جدا سرسید احمد کے اس موقف اور جذبے پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے جو انھوں نے اپنی قوم کی ترقی کے لیے اختیار کیا تھا۔ اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے سرسید کی کوششوں کو ان الفاظ میں خوش آمدید کہا ہے:

''اغلب خیال یہ ہے کہ عوام کے ذہنی رجحان پر جتنے ہمہ گیر اثرات 'تہذیب الاخلاق' نے چھوڑے ہیں ہندوستان (برصغیر پاک و ہند) کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے''۔

■

Hafiz Mohd Jahangir Akram
PGTUrdu, Kamran Model School
Chanda Patti, Lahirya Sarai
Darbhanga - 846004 (Bihar)

م ق سلیم

ماہنامہ 'اردو دنیا'

(مطبوعات نمبر)

قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کی فخریہ پیش کش اردو دنیا ہے جو تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے ہم پوری اردو دنیا اور اردو زبان کا بہترین ماہنامہ کہہ سکتے ہیں۔ ہر شمارے میں اردو کے ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلباء واساتذہ کی ضرورتوں کا خیال بھی رکھا جاتا ہے۔ اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس صحافت اور نئی کتابوں پر تبصرے قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں وسمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال بھی پیش کرتا ہے۔

سرورق پر ہی لکھا ہے۔ قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ — اس سے خود اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ بین الاقوامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کام کررہا ہے اس بار یہ خصوصی شمارہ اپریل 2017 مطبوعات نمبر ہے جس میں قومی اردو کونسل کی جانب سے شائع ہونے والی مطبوعات کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا گیا ہے۔

ہماری بات کے تحت مدیر پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) لکھتے ہیں کہ "قومی اردو کونسل نے کلاسیکی ادب پاروں اور نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت پر توجہ مرکوز کی ہے۔ ادب اطفال سیریز میں باتصویر کتابیں شائع کیں اردو کونسل سے فکر وتحقیق اردو دنیا اور بچوں کی دنیا جیسے رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ اردو دنیا میں قومی اردو کونسل کی مطبوعات پر گوشہ مختص کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ کونسل کی کتابوں سے پوری اردو دنیا کو واقف کروایا جائے۔"

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اشاعتی خدمات پر مضمون ہے جس میں کونسل کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔ یہ ادارہ ترقی اردو بورڈ کے نام سے 1969 میں قائم ہوا۔ ترقی اردو بیورو کا قیام 1973 میں اور 1975 میں اس کو سرکاری ادارے کا درجہ ملا اس ادارے کا باضابطہ قیام یکم اپریل 1996 کو عمل میں آیا۔

اردو دنیا پہلے سہ ماہی تھا۔ جولائی تا ستمبر 1997 میں شائع ہوا اور اس کے بعد ماہنامہ ہوگیا اور 2011 اگست سے بڑے سائز پر مکمل رنگین صفحات پر شائع ہوا۔ فکر وتحقیق کا آغاز 1998 سے ہوا۔ 2013 سے بچوں کی دنیا شائع ہورہا ہے۔

اداریہ میں مدیر کا کہنا ہے کہ 1200 کتابیں ادارہ سے شائع ہوئیں جبکہ محمد آدم نے اشاعتی خدمات کے مضمون میں 1300 کتابیں بتائی ہیں صحیح کیا ہے 100 کتابوں کا فرق ہے۔

مطبوعات نمبر کو 16 مضامین کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب تاریخ ادبیات کا ہے، تاریخ ادب اردو، عربی ادب کی تاریخ، بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا، تاریخ نثر اردو، نمونہ منثورات، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی ادبیات کی چارسو

سالہ تاریخ، امریکی ادب کا مختصر جائزہ، اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ، پر مختصر مگر جامع تبصرے ہیں۔ جس سے ان کتابوں کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دوسرا باب: زبان ولسانیات کا ہے جس میں نئی اردو قواعد، اسلوبیاتی تنقید نظری بنیادی اور تجزیے، صحت الفاظ، اردو املا اور اردو لسانیات ہے۔ تیسرا باب: فرہنگ ولغات کا ہے۔ فرہنگ آصفیہ، دکنی لغت، جدید ہندی اردو لغت (دو جلدوں میں) فرہنگ اصطلاحات وشماریات، اردو کی صوتی لغت، چوتھا باب تحقیق وتنقید ہے۔ جس میں کاشف الحقائق، یادو بود غالب، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، آبشار اور آتش فشاں، تحقیق و تعارف، نئی شعری روایت، مقالات مسعود، اردو کے ابتدائی ادبی معرکے، واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات، سرور جہان آبادی اور اکسیر سخن، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، تحقیق کا فن، ساحری، شاہی صاحب قرانی ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات کی تاریخ، مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔

پانچواں باب: دواوین رکلیات کا ہے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ، کلیات میر، کلیات سراج، سراج اورنگ آبادی، دیوان بیدار، کلیات اکبرالہ آبادی، کلیات پریم چند (جلد 1 تا 24) کلیات ماجدی، کلیات سعادت حسن منٹو (اول و دوم) کلیات ملا رموزی، کلیات ابراہیم یوسف، کلیات کمار پاشی، کلیات اسعد بدایونی، کلیات آل احمد سرور، کلیات راجندر سنگھ بیدی۔

چھٹواں باب: مونوگراف ہے جس میں عوامی، سراج اورنگ آبادی، شیخ محمد ابراہیم ذوق، میر غلام حسن دہلوی، محمد حسین آزاد، جگت موہن لال رواں، غلام رسول ناز کی ملا رموزی، آغا حشر کاشمیری، شاد عارفی، قاضی عبدالودود، راجندر منچندا بانی اور عصمت جاوید۔

ساتواں باب: ابلاغیات/ صحافت ہے جس میں اردو صحافت کے دو سو سال، رہبر اخبار نویسی، طلسم لکھنؤ، اردو میڈیا، ٹی وی نیوز پروڈکشن فن اور طریقہ کار۔

آٹھواں باب: تاریخ ہند کا ہے جس میں، جامع تاریخ ہند (عہد سلطنت) انقلاب اٹھارہ سوستاون، تاریخ تحریک آزادی ہند (جلد اول) تاریخ تمدن ہند حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدو جہد، جنوبی ہند کی تاریخ، قدیم ہندوستان کی تاریخ، تاریخ جہانگیر، تاریخ ٹیپو سلطان، منتخب التواریخ۔

نواں باب: سوانح وتذکرے ہیں جس میں حیات جاوید، مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت، ذ شناسی، سحر ناتک کی ادبی شخصیات، پرواز از خود نوشت اے پی جے عبدالکلام زندگی نامہ: قرۃ العین حیدر۔

دسواں باب: بچوں کا ادب ہے جس میں منٹو اور آنکو، آدم زاد پری لوک میں، دور بین، مختصر کہانیاں، ہندوستان کی کہانیوں کا خزانہ، عقل مند مچھیرا، موگھیا لوک کہانیاں، اخبار کی کہانی، نورتن کہانیاں، ایک نانی اور رنگ ساز کا قصہ۔

گیارہواں باب: سائنس رٹکنالوجی کا ہے جس میں تاریخ ایجادات، انسانی ارتقا، بجلی کی کہانی، اردو سافٹ ویئر، پودحفاظتی آلات کی مرمت، دیکھ بھال، آموزشی اور عملی کتابچہ، سائنس کی کہانیاں، سائنس کی باتیں، فضائی آلودگی، حیوانات کی دلچسپ دنیا۔

بارہواں باب: طب و معالجات ہے جس میں، تاریخ علم الادویہ، قدیم علم الامراض معالجات شامل ہے۔

تیرہواں باب: قانونیات کا ہے جس میں بھارت کا آئین، ہندوستانی نظام قانون، قانون فرہنگ اصطلاحات۔

چودھواں باب: سماجیات معاشیات نفسیات ہے جس میں اقتصادیات برائے عوام، اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت، تعلیمی نفسیات۔

پندرہواں باب: خطاطی کا ہے جس میں صحیفہ خوش نویساں، اردو خوش نویسی برائے سال سوم)۔

سولھواں باب: تراجم کا ہے جس میں ناول اور عوام، شعریات، کشمیر کی وادی، جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین، شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ، اردو نظم میں، تعلیمی تشکیل ان کے مسائل، خواجہ غلام السیدین شامل ہیں۔

مختصر تفصیل اس طرح ہے:

عنوانات	کتابوں کی تعداد
1۔ تاریخ ادبیات	10
2۔ زبان ولسانیات	05
3۔ فرہنگ لغات	05
4۔ تحقیق وتنقید	18
5۔ دواوین رکلیات	14
6۔ مونوگراف	13
7۔ ابلاغیات صحافت	05
8۔ تاریخ ہند	10
9۔ سوانح وتذکرے	07
10۔ بچوں کا ادب	09
11۔ سائنس رٹکنالوجی	09
12۔ طب معالجات	03
13۔ قانونیات	03
14۔ سماجیات رمعاشیات رنفسیات	02
15۔ خطاطی	02
16۔ تراجم	06

100 صفحات کے اس رسالے کو جو مکمل آرٹ پیپر پر ملٹی کلر ہے صرف -/15 روپے کا شمارہ ہے۔ اسی طرح اگر قومی کونسل تمام کتابوں کے تبصرہ کا ایک علیحدہ سے مجلہ شائع کرے تو قارئین کے علاوہ، محققین کو بھی سہولت ہوگی اور انہیں لائبریریوں کے چکر لگانے نہیں پڑیں گے۔ البتہ کونسل کسی شمارے میں 1300/1200 کتابوں کے نام اور قیمت شائع کریں۔ ان تبصروں میں بھی کتابوں کی قیمت درج نہیں۔ ہر تبصرہ کے ساتھ کتاب کی قیمت اور صفحات درج کریں تاکہ قاری خرید کر اس کو پڑھ سکے۔

16۔ عنوانات کے تحت تقریباً سبھی کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔

اس کے علاوہ فاروق ارگلی کا انٹرویو حقانی القاسمی کا، خطوط، خبر نامہ شامل ہے۔

100 صفحات کے اس رسالے کو جو مکمل آرٹ پیپر پر ملٹی کلر ہے صرف -/15 روپے کا شمارہ ہے۔ اسی طرح اگر قومی کونسل تمام کتابوں کے تبصرہ کا ایک علیحدہ سے مجلہ شائع کرے تو قارئین کے علاوہ، محققین کو بھی سہولت ہوگی اور انھیں لائبریریوں کے چکر لگانے نہیں پڑیں گے۔ البتہ کونسل کسی شمارے میں 1300/1200 کتابوں کے نام اور قیمت شائع کریں۔ ان تبصروں میں بھی کتابوں کی قیمت درج نہیں۔ ہر تبصرہ کے ساتھ کتاب کی قیمت اور صفحات درج کریں تاکہ قاری خرید کر اس کو پڑھ سکے۔

ارتضی کریم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کئی نمبر نکالے۔ اسی طرح وہ اردو ادب کی خدمت کرتے رہیں گے اور اردو دنیا کے پرچہ کا بین الاقوامی معیار برقرار رکھیں گے۔

■

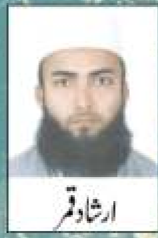

ارشاد قمر

'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ

'فکر و تحقیق' کا پہلا شمارہ 1989 میں شائع ہوا ہے۔ اس کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ اس وقت کی ڈائرکٹر ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے حوالہ جاتی اور نصابی کتب کے پینل کے ایک اجلاس میں ایک تجویز پیش کی تھی کہ قدیم اردو کی تدریس کے مسائل کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہونا چاہیے تاکہ تدریس کے دوران پیش آنے والے ان مسائل ومشکلات کو بحسن خوبی سمجھا جائے اوران باریک و پیچیدہ گتھیوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اس پر پیچ موضوع پر باتیں تو سب کرتے ہیں لیکن ان کو حل کرنے کی جانب پہل کوئی نہیں کرتا۔ لہٰذا اس تجویز کا کمیٹی کے سارے اراکین اور چیئر مین نے خیر مقدم کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں زور وشور سے شروع ہوگئیں۔ اس عنوان پر سیمینار منعقد کرنے کی پرزور تائید کے ساتھ یہ سفارش بھی کی گئی تھی کہ سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالے شائع بھی کردیے جائیں تاکہ جو لوگ اس میں شریک نہ ہوسکے ہوں وہ ان شائع شدہ مضامین سے مستفید ہوں۔ ان مقالات کو حاصل کرلینے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کی بنیاد پر فکر وتحقیق کا پہلا شمارہ مرتب کرکے شائع کردیا جائے۔

ترقی اردو بیورو، محکمۂ تعلیم، حکومت ہند کے زیر اہتمام شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے تعاون سے 27 تا 29 اکتوبر 1987 کو دکنی ادب کی تدریس اور تحقیق کے مسائل پر اپنی نوعیت کا پہلا کل ہند سہ روزہ سیمینار اور ورکشاپ منعقد ہوا۔ اس سیمینار کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں، کالجوں اور دیگر اردو اداروں کے اساتذہ وطلبا اور زبان و ادب کے ماہرین نے کثیر تعداد میں شرکت فرماکر اس سیمینار کی معنویت و افادیت کو دوبالا کیا۔ ساتھ ہی یہ سیمینار پوری کامیابی کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچا اور اس میں پڑھے گئے مقالات کو یکجا کرکے فکر وتحقیق کا پہلا شمارہ 1989 میں شائع ہوا لیکن کسی وجہ سے یہ بند ہوگیا اور اس کا باضابطہ آغاز 1997 سے شروع ہوکر آج تک علمی وادبی حلقوں میں اپنی منفرد شناخت بنایا ہوا ہے اس پہلے شمارے (جنوری-جون 1989) میں شامل مضامین کا توضیحی اشاریہ ملاحظہ ہو۔

پہلا حصہ: تدریس کے مسائل

(1) دکنی متون اور قرأت کے مسائل: ڈاکٹر حنیف نقوی ص 15 تا 25

ادب کے سنجیدہ مطالعے کے لیے متن کی حیثیت خشت اوّل کی ہے اور اس دشوار گزار مرحلے کو سر کرنے کے لیے لفظ کی صحت اور اس کے املا وتلفظ بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس خارزار میں زبان کی قدامت کے پہلو بہ پہلو رسم الخط کی اجنبیت بھی برابر کی شریک ہے اس بات کو بھی اپنے دل ودماغ میں جگہ دینے کی ضرورت ہے کہ دکن میں عرصۂ دراز تک خط نسخ کا رواج رہا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے اس مضمون میں اردو کے عام طالب علموں کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے ادبا کو دکنی ادبیات کے مطالعے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان وجوہات کو بڑی ہی سنجیدگی سے پیش کرنے کی سعی کی ہے اور ان گتھیوں کو سلجھانے کی بھی کوشش کی ہے جس سے عام طور سے لوگ گریز کرتے ہیں۔

(2) دکنی ادب کی تدریس — انتخاب: مسائل و امکانات: ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی ص 26 تا 35

انسان اپنی زندگی میں جن تجربات ومشاہدات سے دوچار ہوا اور اس کے ذہن ودماغ پر جو کیفیات طاری ہوئیں اور جن ہیجانات سے اس کا جسم متاثر ہوا، ان کا اظہار زبان کے ذریعے ادب کی شکل میں رونما ہوتا رہا ہے۔ ہر علاقہ اور ہر دور کے ادب میں اس دور کے افکار و تصورات محفوظ ہوجاتے ہیں۔ سیاسی اور سماجی تاریخیں

اگرچہ اپنے عہد کے اہم واقعات وتغیرات کو بیان کرتی ہیں لیکن کسی دور کی روح کو دیکھنا ہو تو اس کی سچی تصویریں اور عکس ادب میں ہی نظر آئیں گی اور اس عکس کو ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی نے اپنے اس پر مغز مقالے میں دکھانے کی کوشش کی ہے اور دکنی ادب کی تدریس کے مسائل و امکانات پر مفصل اور مبسوط باتیں قلم بند کی ہیں۔

(3) سب رس کی تدریس کے مسائل: ڈاکٹر منظر اعظمی ص 36 تا 44

سب رس کی تدریس کے مسائل کم و بیش وہی ہیں جو دکنی ادبیات کی تدریس کے ہیں۔ لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ جتنی کوششیں شمالی ہند کے اردو شعر و ادب کی صحت کی تلاش وجستجو کے لیے ہوئی ہیں اتنی کوشش دکنی ادبیات کے لیے نہیں ہوئی اگر اتنی ہی محنت و کاوش کا مظاہرہ کیا گیا ہوتا تو آج یہ صورت حال پیش نہ آتی انھیں وجوہات اور مسائل کی جانب ڈاکٹر منظر اعظمی نے اپنے اس مضمون میں اشارہ کیا ہے اور ان باریک گتھیوں کو حل کرنے کی ایک کوشش کی ہے جن میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

(4) دکنی نثر کی تدریس طریقۂ کار اور مسائل: ڈاکٹر محمد ہاشم علی، ص 45 تا 59

موصوف نے اپنے مضمون میں دکنی نثر کی تدریس طریقۂ کار اور مسائل میں سب سے پہلے اردو نثر کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیا ہے۔ لگ بھگ ان تمام اداروں اور شخصیتوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے اردو نثر کی تاریخ میں اپنی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر محمد ہاشم علی نے ان شواہد کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جنھوں نے مختلف جہات سے چند اہم کتابوں کی تحقیق و تنقید کی اور منظر عام پر لائے اور ان الفاظ کی بھی نشاندہی کی جو آج متروک ہو چکے ہیں اور صرف کتابوں تک محدود ہیں جسے آج کا طالب سمجھنے سے قاصر ہے چند الفاظ کا ذکر کر کے ان کے معانی بھی بیان کر دیے ہیں تاکہ آسانی ہو۔

(5) دکنی مراثی کی تدریس کے مسائل: ڈاکٹر فضل امام ص 60 تا 69

دکنی مراثی کی تفہیم بھی ایک مشکل امر ہے۔ ان کی صحیح طور پر تشریح وتوضیح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کی شد بدنہ ہو۔ جن الفاظ یا تراکیب کا استعمال کیا گیا ہے وہ کس پس منظر کی ترجمانی کرتے ہیں چونکہ ایک ناقابل انکار حقیقت یہ بھی ہے کہ دکنی شعر و ادب میں دراوڑی تہذیب اور زبانوں کے اثرات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کی جانب ڈاکٹر فضل امام نے دیانت داری کے ساتھ اشارہ کیا ہے اور ان رموز و اوقاف کو وا کیا ہے جو پردۂ خفا میں تھے۔ دکنی مراثی کی تدریس کے کیا مسائل تھے اور یہ فن کن دشواریوں کا شکار رہا ہے ان سب کا مفصل تبصرہ اس مضمون میں موجود ہے۔

(6) دکنی متصوفانہ مثنویوں کی تدریس اور اس کے مسائل: ڈاکٹر مہ نور زمانی بیگم ص 70 تا 81

صوفیاءِ کرام نے اپنے متبعین سے عام فہم انداز میں اپنے خیالات اور نظریات کو گوش گزار کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے یہاں کی مقبول اصناف دوہا، گیت اور جھولنا وغیرہ کی صورت میں اپنے افکار بھی پیش کیے ہیں لیکن علاقائی زبانوں کے الفاظ، ان کی اصل صوت و لہجے سے بے اعتنائی برتی گئی۔ مشکل اور سخت الفاظ کی تشریح وتوضیح مہ نور زمانی بیگم نے کی ہے چونکہ صوفیاء کرام سخت اور غیر مانوس الفاظ کا بھی استعمال کیا کرتے تھے۔

(7) دکنی ادب کی تدریس کچھ مباحث کچھ مسائل: ڈاکٹر شام لال کالڑا عابد ص 82 تا 95

ہم میں سے کسی کو اس سے انکار نہیں ہے کہ دکنی ادب اردو کا قدیم ترین ادب ہے اس کے باوجود اس کی تدریس کی جانب توجہ کم سے کم ہے یہ ایک المیہ ہے اس کے حل کے لیے ہم سب کو ہوش کے ناخن لینے ہوں گے تبھی کسی صحیح نتیجے پر پہنچیں گے۔ موصوف نے اس پر کافی زور دیا ہے کہ قدیم ادب کی خاطر خواہ تدریس تب تک ممکن نہیں ہے جب تک سنجیدگی سے باقاعدہ منصوبہ بنا کر ملک کی سب یونیورسٹیوں میں جہاں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے وہاں اس کو متعارف نہ کروایا جائے اور اس کے لیے موزوں اساتذہ کا تقرر نہ کیا جائے۔

(8) دکنی میں املا و تلفظ کے بعض مسائل: ڈاکٹر حنیف نقوی ص 96 تا 103

اردو رسم الخط کے ارتقا اور طرزِ املا کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا تعلق علاقائی اثرات اور لسانی تغیرات سے وابستہ رہا ہے۔ عربی اور فارسی خطوط سے اس کا جو ایک رشتہ رہا ہے اس نے اس کی ارتقائی شکل میں مزید اضافہ کیا ہے اور اس کی خطی روشوں اور املائی علامتوں پر بھی اثر انداز ہوا ہے۔ یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ بعض املائی علامتوں کا رواج کسی دور یا کسی علاقہ میں زیادہ رہا یا خط نسخ، تعلیق، نستعلیق اور شکستہ نستعلیق نے اپنے رسمی دائرہ طرز املا کو کئی اعتباروں سے متاثر کیا ہے۔ موصوف نے ان مسائل کی توضیح وتعبیر بڑے ہی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

(9) دکنی شاعری کی تدریس مسائل اور طریقہ کار: ڈاکٹر نجم الھدیٰ ص 104 تا 109

دکن کی قدیم اردو شاعری جسے عرف عام میں دکنی شاعری کہتے ہیں ہمارے ادب کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہے اور اس کی تدریس کے بغیر ہمارا ادبی وشعری مطالعہ نامکمل رہے گا۔ دکنی شاعری کے مطالعے میں سب سے بڑا مسئلہ زبان کا ہے انھیں مسائل اور طریقۂ کار کی جانب ڈاکٹر نجم الہدیٰ نے اشارہ کیا ہے اور جہاں تک ہو سکا ہے اس کی تشریح وتوضیح کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

(10) دکنی شاعری کی تدریس: طریق کار اور مسائل: ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ص 110 تا 118

شاعری بنفسہ تفہیم وتدریس سے بالاتر ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ شاعری تفہیم وتدریس کی گرفت سے باہر ہوتی ہے۔ سچ پوچھیے تو شاعری کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے جس طرح کسی رنگ کو، خوشبو کو، کسی حسین منظر کو، کسی خوبصورت چہرے کو وغیرہ کو صرف محسوس کر سکتے ہیں اس کی ہیئت و ماہیت کو بیان نہیں کر سکتے۔ شاعری کے تعلق سے بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ انھیں مسائل اور طریق کار پر موصوف نے کاوش کی ہے۔

(11) تدریس مثنوی: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ص 119 تا 141

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے اپنے مضمون میں قدیم مثنویوں کا مختصر تعارف پیش کیا ہے جیسے مثنوی لیلیٰ مجنوں، مینا ستونتی، سنگھاسن بتیسی، خاور نامہ، ابلیس نامہ، ماہر پیکر، ابراہیم نامہ، تصویر جاناں، بوستانِ خیال، سیف الملوک و بدیع الجمال وغیرہ ساتھ ہی انھوں نے مثنویوں کے نام کی صراحت بھی کر دی ہے تاکہ قاری کو پورا پس منظر سمجھ میں آجائے اور کسی طرح کا کوئی شک وشبہ نہ رہے۔

دوسرا حصہ: مطالعہ تدریس

(12) دکنی ادب کا مطالعہ و تدریس: ڈاکٹر محمد انصاراللہ ص 142 تا 148

ڈاکٹر محمد انصاراللہ نے بھی دکنی شاعری کے اسرار و رموز سے بحث کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دکنی شاعری کتنی دشوار ہے اور طلبہ خاص طور سے وہ طلباء جن کا تعلق شمالی ہند سے ہے وہ کس قدر دکنی شاعری وغیرہ سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ محنت ولگن سے کوئی کام کیا جائے تو وہ آسان ہو جاتا ہے۔

(13) جامعات میں دکنی تدریس: ڈاکٹر م.ن. سعید ص 149 تا 158

جامعات میں تدریس کی سطح پر دکنی ادب سے ہماری شناسائی کس حد تک ہے ہم میں سے ہر کوئی اس سے واقف ہے اور سب سے بڑا مسئلہ اس کی قرأت کا ہے اس جانب ہم لوگوں کو سر جوڑ کر سوچنے اور تدبر کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی اس کے مثبت پہلو کی جانب طلبا کو راغب کرنے کے ساتھ اس کی اہمیت وافادیت اور معنویت کو واضح کرنا ہمارا فرض اولین ہونا چاہیے تب جا کر ہم جامعاتی سطح پر دکنی تدریس کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں۔

(14) دکنی ادب کے نصاب سے متعلق چند باتیں: رشید حسن خاں ص 159 تا 175

رشید حسن خاں نے دکنی ادب کے نصاب کی ترتیب سے متعلق چند اہم اور معلومات باتیں کہی ہیں جس کا جاننا اور اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا ہم سب کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم تدریس اور تدوین کی شکلوں پر واقعتا نتیجہ خیز بحث کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم دو بنیادی باتوں کو تسلیم کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں دکنی ادبیات کو صرف نصابی ضرورت کے تحت پڑھایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ قواعد کے علامات و رموز سے ہماری اچھی واقفیت ہو تب جا کر ہم دکنی ادب سے کچھ انصاف کر سکتے ہیں۔

(15) دکنی نثر کا مطالعہ: ڈاکٹر سید حامد حسین ص 176 تا 182

ڈاکٹر سید حامد حسین نے دکنی نثر کے مطالعے کے سلسلے میں یہ بات کہی ہے کہ صحیح تدوین کے ساتھ دکنی نثر کے ایک مشترکہ انتخاب کی تیاری نہایت ضروری ہے چنانچہ دکنی زبان بالخصوص دکنی نثر کے کسی بھی انتخاب کا ایک بنیادی مقصد دکنی زبان کے اس لسانی رشتے کی وضاحت ہونا چاہیے جو اردو کے ساتھ ہے اور جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اردو کی جڑیں عوامی زندگی سے وابستہ ہیں۔

تیسرا حصہ: تحقیق وتنقید

(16) دکنی نثر میں تحقیق کے مسائل: پروفیسر رفیعہ سلطانہ ص 183 تا 191

تحقیق یوں بھی اردو میں زیادہ برگ و بار نہ لاسکی۔ شاعری کے شجر سایہ دار کے مقابلے میں تحقیق کے بنجر ریگستان کی بادیہ پیمائی چند ہی جیالوں نے کی۔ جب اردو تحقیق اس کم مائگی کی نوحہ خواں ہے تو پھر دکن اور وہ بھی دکنی نثر کی طرف تو ظاہر ہے کہ توجہ کم ہی ہوتی لیکن اس کے باوجود چند اہم لوگوں نے اپنی توجہ کا مرکز دکنی نثر کو بنایا۔ رفیعہ سلطانہ نے ان لوگوں کا ذکر اپنے اس مضمون میں احسن طریقے سے کرنے کی کوشش کی ہے۔

(17) دکنی اردو ادب کی تدریس اور ادبی تحقیق و تنقید– جمالیات کے تقاضے: ڈاکٹر شکیل الرحمان ص 192 تا 202

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے اردو ادب کی ایک ایسی تاریخ کی طرف زور دیا ہے جس میں ایک جانب برصغیر کی مشترکہ تہذیب کی روایات و اقدار کے بہتر تسلسل اور سماجی ارتقا اور رونما ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات کی پہچان ہو اور دوسری جانب فنکاروں کے تخلیقی تجربوں، اسالیب کی تبدیلیوں اور تکنیک کی مختلف صورتوں کے گہرے نقش کو بھی ابھارا جائے اور ساتھ ہی دونوں کی جمالیاتی سطحوں کو مختلف تاریخی منزلوں پر نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ اردو ادب کی تدریس اور ادبی تحقیق و تنقید کے لیے اس طرح کا کام اہم اور انتہائی بصیرت افروز ہوگا۔

(18)دکنی زبان و ادب کا تہذیبی، ثقفاتی اور سماجی پس منظر: ڈاکٹر محمد حسن ص 203 تا 212

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے اس بیش بہا مضمون میں دکنی زبان وادب کا پس منظر تاریخی شواہد کی بنا پر بڑی ہی سنجیدگی سے پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح عربوں نے دنیا چھائی مگر ایران نے ثقافتی برتری بڑی حد تک قائم رکھی اور ساتھ ہی اس وقت کی سیاسی صورت حال کا بھی ایک جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جس میں وہ حتی المقدور کامیاب بھی نظر آئے۔

(19) دکنی ادب کی تحقیق کے چند مسائل: ڈاکٹر سیدہ جعفر ص 213 تا 231

سیدہ جعفر نے دکنی ادب کے محققین کی ان کاوشوں کو سراہا ہے جنھوں نے اپنے تحقیقی وتنقیدی عمل سے دکنی ادب کو مالا مال کیا ہے چاہے وہ شمس اللہ قادری، ڈاکٹر زور اور نصیرالدین ہاشمی وغیرہ رہے ہوں ان حضرات نے دکنی ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور اس کا دامن بیش بہا موتیوں سے بھر دیا بلکہ لسانی تحقیق کے نئے باب بھی وا کر دیے ہیں۔ دکنی ادب کی تحقیق کے بنیادی اور اہم مسائل وہی ہیں جسے زبان کی قدامت و اجنبیت تحقیقی مواد کی عدم دستیابی اور لسانی تغیرات نے دکنی ادب کی تحقیق کو وادی پر خار بنا دیا ہے۔

(20) دکنی ادب کا سیکولر مزاج: ڈاکٹر وہاب اشرفی ص 232 تا 240

قدیم دکنی ادب کے امتیازات وخصوصیات میں اس کا سیکولر پہلو بہت نمایاں ہے۔ ان حقائق کی جانب ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اس مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ ساتھ ہی قدیم ادبا وشعرا جن میں حکمراں بھی ہوا کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان کی کشادہ قلبی، وسیع المشربی، وسیع النظری اور بے تعصبی کی بے مثال نظیریں ملتی ہیں۔ اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم دکنی ادب ہر لحاظ سے سیکولر ہے۔ قدیم دکنی ادب کا سرمایہ انتہائی وقیع ہے اس کے ہر پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

(21) دکنی زبان و ادب کی تاریخی و تہذیبی جہت اور اساس: ابوالفیض سحر ص 241 تا 248

ابوالفیض سحر نے بڑی ہی سنجیدگی اور دیانت داری سے ہندوستانی تہذیب کی تحسین شناسی اور گہری بصیرت کی متقاضی چیزوں کو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ہڑپا اور موہن جوداڑو جیسی اولین تہذیبوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

(22) ملا وجہی، حیات و خدمات: ڈاکٹر جاوید وششت ص 249 تا 261

ڈاکٹر جاوید وششت نے ملا وجہی کی حیات و خدمات کے تمام گوشوں کا ایک سرسری جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور وجہی کی جو بھی خدمات رہی ہیں چاہے وہ درباری یا عوامی ان باتوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اس طرح کی کوشش کار خیر میں آتی ہے۔

(23) معرکہ وجہی و غواصی: ڈاکٹر محمد یعقوب عامر ص 262 تا 282

یعقوب عامر نے وجہی اور غواصی کے درمیان جو چپقلش رہی ہے ان کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ادبا و شعرا کی چپقلشوں کو منظر عام پر لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے اور اس طرح کی باتوں سے ہم جیسے طالب علموں کو فائدہ ہوتا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے دکنی ادب کے اجلاس کا صدارتی خطبہ دیا۔ یہ خطبہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد خطبہ ہے۔ خواجہ صاحب نے سمینار کی ساری باتوں کا نچوڑ اپنے اس اختتامیہ خطبے میں پیش کیا ہے۔

■

Irshad Qamar
AB 452, First Floor, Amarpuri
Ram Nagar, Nabi Karim, Pahar Ganj
New Delhi - 110055

اردو ادب میں سائنس کی شمولیت

توصیف خان

انسانی زندگی میں سائنس کی اہمیت روزِ اول سے ہی مسلّم ہے لیکن اس طرف توجہ کافی بعد میں دی گئی۔ ماضی میں سائنس کی مدد سے جو پیشین گوئیاں کی گئیں وہ نہ جانے کتنے سائنس دانوں اور دانشوروں کی موت کا فرمان ثابت ہوئیں۔ دھیرے دھیرے انسان کا مزاج بدلا اور جب اسے سائنس کی افادیت کا اندازہ ہوا تب اس نے سائنس کو کھلے دل سے قبول کرنا شروع کیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور آگے بھی رہے گا۔ سائنس نے جہاں انسانی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا وہیں ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ دنیا کے ہر ادب میں وقتاً فوقتاً سائنس کی شمولیت ہوتی چلی گئی۔ اردو شاعری اور فکشن میں یہ سلسلہ دورِ قدیم سے جاری ہے۔ ہم میر و غالب کے اشعار میں بھی سائنس کا پہلو تلاش کر سکتے ہیں اور طلسم ہوش ربا اور باغ و بہار جیسی داستانوں میں بھی۔

اردو ادب میں سائنس کی ایجادات اور نظریات وقت کے ساتھ ساتھ شامل ہوتے گئے۔ ان کا مطالعہ کریں اور یہ پتہ لگانے کی کوشش کریں کہ ہم نے ادب میں کس طرح کے سائنسی عناصر شامل کیے ہیں اور دورِ حاضر کے تقاضے کیا ہیں۔

1. غالباً ہر زبان کا سائنسی ادب نئی نئی ایجادات کو ضرور پیش کرتا ہے خواہ وہ منظرِ عام پر آئی ہوں یا نہیں۔ اکثر سائنس فکشن لکھنے والے ادیبوں نے صرف قاری کی دلچسپی اور تجسس برقرار رکھنے کے لیے اس طرح کے آلات یا مشینری کا استعمال اپنے ناولوں یا افسانوں میں کیا ہے۔ خورشید اقبال صاحب نے اپنی کتاب 'اردو میں سائنس فکشن کی روایت' میں متحیر کرنے والی کئی ایجادات کے متعلق لکھا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اگر آپ نے 'قانون والا' کے جاسوسی ناول پڑھے ہیں تو آپ کو یاد ہوگا کہ کیپٹن سیما کے پاس ایک ننھا سا زیرو نائن ٹرانسمیٹر ہوا کرتا تھا جس سے وہ نامساعد حالات میں کرنل زاہد سے باتیں کیا کرتی تھی۔ اس قسم کے آلات کا تصور اس زمانے کے بے شمار جاسوسی اور سائنسی ناولوں میں پیش کیا گیا تھا۔''[1]

2. کسی بھی سائنس فکشن میں اگر کسی جنگ یا کوئی چھوٹے موٹے گروہوں کی جھڑپ کا منظر پیش کیا جاتا ہے تو عجیب و غریب قسم کے آلات کی وجہ سے ہیرو یا ڈیٹیکٹو بچ کر بدمعاشوں کو شکست دے دیتا ہے یا کسی سائنسی ناول میں جنگ کا سین ہے تو وہ ریڈیائی یا دیگر جدید اسلحوں سے لڑی جاتی دکھائی دیتی ہے۔

3. سائنس کی ترقی کی وجہ سے آج کمیونیکیشن میں جو آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ اب سے کچھ سال پہلے نہیں تھیں لیکن ہمارے سائنس فکشن لکھنے والے ادیبوں نے کافی پہلے سے ہی موبائل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ویڈیو کالنگ شاید ہی ایسا کچھ ہو جس کا استعمال انھوں نے اپنے ناولوں یا افسانوں میں نہ کیا ہو۔ آج ہم کسی سے رابطہ کرنے کے لیے یا اپنی بات کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کے لیے طرح طرح کے Chatting Apps اور Social Sites کا استعمال کرتے ہیں۔ سائنس فکشن

میں ان سب کا ذکر بہت پہلے سے کیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

’’انٹرنیٹ پر چیٹنگ کے دوران ایک دوسرے کی تصویریں اسکرین پر دیکھتے ہوئے بات چیت کرنا آج ایک عام سی بات ہے کسی بھی اسمارٹ موبائل فون میں یہ خوبی موجود ہے اور آپ مخاطب کی تصویر اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن سب سے پہلے یہ تصور ایک سائنس فکشن نگار کے ہی ذہن میں آیا۔ 1911 میں Hugo Gernsback نے اپنے ناول +Ralph124 C 41 میں پیش کیا۔ اس کے 53 سال کے بعد 1964 میں AT&T کمپنی نے پکچر فون کا پہلا نمونہ نیویارک ورلڈ فیر میں پیش کیا تھا اور آج Skype نامی سروس کی مدد سے ہم بڑی آسانی سے اپنے موبائل فون، لیپ ٹاپ یا ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر پر ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھتے ہوئے باتیں کرتے ہیں۔‘‘[2]

4. پرانے زمانے میں مختلف قسم کے Gadjets یا آلات تجسس کا سامان ہوتے تھے لیکن عہد حاضر میں اس طرح کے Gadjets سے وہ تاثر نہیں پڑتا دوسرے یہ کہ کبھی کبھی ایسا بھی لگنے لگتا ہے کہ ان Gadjets یا Products کی صرف تشہیر کی جارہی ہے۔ آج کل فلموں میں باقاعدہ معاہدے کے تحت یہ کام ہوتا ہے۔

5. بعض اوقات سائنس فکشن پر مبنی فلموں کو دیکھنے یا جاسوسی ناولوں کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ سامعین کو صرف مرعوب کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔

6. ادب ہمیشہ سے انسان کے لیے Entertainment کا ذریعہ رہا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادب بامقصد زندگی کا ذریعہ بنتا گیا۔ اگر ہم ادب کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سائنس فکشن میں صرف تجسس اور Adventure نظر آتا ہے مقصد نہیں۔ کسی سائنسی

ناول میں کوئی جاسوس یا ڈٹیکٹو اپنی ہوشیاری اور جدید آلات کی مدد سے کامیابی حاصل کرلے یا کوئی کیس سلجھا لے تو اس میں Adventure اور تفریح طبع تو ہے لیکن مقصد نہیں۔

اب ہم سائنسی ادب (سائنس فکشن/ شاعری) سے دور حاضر کے تقاضے Point out کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ حصہ اس مضمون کا اصل موقف بھی ہے۔

رفاہ عامہ اور اردو سائنسی ادب

یا

دور حاضر میں اردو سائنس فکشن سے تقاضے

1. گلوبل وارمنگ (Global Warming)
2. ایکوٹیررزم (Ecoterrorism)
3. آلودگی (Pollution)- فضائی آلودگی / ہوائی آلودگی، صوتی آلودگی، زمینی آلودگی، آبی آلودگی، ریڈیائی آلودگی وغیرہ۔
4. اوزون پرت (Ozone Layer)
5. نفسیات کا مثبت ارتقا (Positive Psychological Development)
6. نظم وضبط، انداز اور آداب کا ارتقاء (Discipline, Manner & Eticates Development

1. پوری دنیا کے لیے گلوبل وارمنگ ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے سمندر کی سطح تیزی سے اوپر اٹھ رہی ہے جس کے سبب آس پاس کی بستیوں یا پھر جزیروں پر بسنے والے لوگوں کے لیے پانی کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔ کریباتی جزیرے پر پانی کی سطح اس قدر اوپر اٹھ گئی ہے کہ وہاں کے صدر نے فجی میں زمین خرید کر اپنے ملک کے لوگوں کو وہاں بسانے کا اعلان کیا۔

کیا اب وہ وقت نہیں آگیا جب سائنسی ادب میں Global Warming کے متعلق لکھا جانا چاہیے......؟ جس سے لوگ بیدار ہوں۔

2. ایکوٹیررزم (Ecoterrorism) ایک ایسی دہشت گردی کو کہتے ہیں جو Ecosystem اور Environment کو بری طرح متاثر کرے۔ اس میں صارفیت (Consumerism)، Industries اور Colonialism کافی حد تک ذمے دار ہیں۔ کیا آج سائنسی ادب میں Ecoterrorism جیسا موضوع شامل ہے؟ اس طرح کے موضوع شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انور قمر اردو افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ 'ہاتھیوں کی قطار' Ecoterrorism کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

’’گزشتہ دس سالوں سے بیرام جی محسوس کررہے تھے کہ ان کے کھیل اور تفریح کے میدان، وہ بنگلے، وہ پہاڑیاں، وہ بل کھاتی سڑکیں رفتہ رفتہ غائب ہوتی جارہی ہیں اور ان کی جگہ دیو پیکر، آہنی سنگلاخ کی سیدھی اور سپاٹ عمارتیں کھڑی ہوتی جارہی ہیں۔ رفتہ رفتہ قدرتی حسن پامال ہورہا ہے۔ اب نہ تو سبزہ ہے نہ درخت، نہ پھول ہیں نہ پتے، نہ چڑیاں ہیں نہ گلہریاں، نہ تتلیاں ہیں نہ بھونرے، نہ گرگٹ ہیں نہ ٹڈے، کچھ بھی تو نظر نہیں آتا! اوگاڈ، وہ سب کہاں گئے؟ کیا ہوئے؟ انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ کئی دنوں تک وہ بڑے فکر مند رہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ کیسے ہو رہا ہے؟ کتنا ہو چکا ہے؟ اور کتنا ہونا باقی ہے؟ اس کی کوئی انتہا بھی ہے؟ اس کا کوئی خاتمہ بھی ہے؟ یا یہ اسٹیل اور سیمنٹ کا جنگل جو ہر لحہ اور ہر پل اپنے پھیلاؤ میں بڑھتا ہی جارہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان کی ہر سانس کا احاطہ کرلے اور اس کا جینا دوبھر کردے یہ تو اس کے ذہن، قلب اور روح پر ظلم کا پہاڑ بن کر ٹوٹ رہا ہے؟ مجھے اس کی مخالفت کرنی ہی پڑے گی۔‘‘[3]

پوری دنیا کے لیے گلوبل وارمنگ ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔اس کی وجہ سے سمندر کی سطح تیزی سے اوپر اٹھ رہی ہے جس کے سبب آس پاس کی بستیوں یا پھر جزیروں پر بسنے والے لوگوں کے لیے پانی کا خطرہ بڑھ گیا ہے۔ کریباتی جزیرے پر پانی کی سطح اس قدر اوپر اٹھ گئی ہے کہ وہاں کے صدر نے فجی میں زمین خرید کر اپنے ملک کے لوگوں کو وہاں بسانے کا اعلان کیا۔

راشد انور راشد کے شعری مجموعے 'گیت سناتی ہے ہوا' کی ساری نظمیں اور غزلیں Ecofriendly یا کہہ سکتے ہیں کہ Ecosystem کی حمایت میں تخلیق کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک غزل سے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

چہار سمت سے اب کاٹتا ہے جنگل کو
یہی قبیلہ کسی وقت پوجتا تھا درخت
نہ کر سکا وہ مسافر کا دل سے استقبال
خود اپنی چھاؤں سے محروم ہو چکا تھا درخت

ہمیں اپنے سائنسی ادب کا احتساب کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ہمارا سائنسی ادب Ecofriendly ہے بھی یا نہیں۔ آج ہمیں ماحولیات کے تناسب کو برقرار رکھنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے کی ضرورت ہے، اس کام میں سائنسی ادب بھی اپنا مثبت رول ادا کر سکتا ہے۔

3. آلودگی- ماحولیات کے کسی بھی جز مثلاً ہوا، پانی، زمین وغیرہ کو CFC، Aerocel، Fogg اور دیگر گیسوں کی زیادتی سے جو نقصان ہوتا ہے یا فضائی تناسب بگڑتا ہے اسے آلودگی کہتے ہیں۔ اس کی کئی اقسام ہیں:

(ا) فضائی آلودگی، (ب) زمینی آلودگی، (ج) آبی آلودگی، (د) صوتی آلودگی، (ہ) ریڈیائی آلودگی وغیرہ۔

ان تمام اقسام کی آلودگی پر لکھنے کو بہت کچھ ہے لیکن مضمون کی طوالت کا خوف دامن گیر ہے اس لیے مذکورہ بالا آلودگیوں کے متعلق تفصیل نہ پیش کرتے ہوئے صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ جن سائنسی ناولوں میں مختلف قسم کے اسلحے، آلات، ریڈیائی اسلحے، کیمیکل اور گیسیں دشمنوں پر فتح کے لیے ڈیکلو یا ہیرو استعمال کرتا ہے اور یہ سب کچھ ہمارے تحیر و تجسس کو برقرار رکھتا ہے۔ کیا ایسے ناولوں میں آلودگی کی طرف توجہ دلانے کی زحمت گوارہ کی گئی ہے......؟

4. اوزون پرت (Ozone layer)- آفتابی حدت اور UV شعاعوں سے ہمیں محفوظ رکھتی ہے لیکن اب اس پرت کو دن بہ دن نقصان ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے Global Warming میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جتنے بھی Luxries Life Styles ہیں، ان کی وجہ سے Pollution بڑھ رہا ہے، وہ چاہے Refrigerater ہوں یا AC، حالانکہ دیگر چیزیں بھی اس کے لیے ذمے دار ہیں جیسے: ریل، ہوائی جہاز، ملوں، فیکٹریوں سے نکلنے والا دھواں، Missile experiment اور خلا میں بھیجے گئے راکٹ سے نکلنے والا دھواں یا گیس وغیرہ۔ کیا سائنسی ادب میں اوزون کو ہو رہے نقصان اور بڑھتی ہوئی حدت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے......؟ اگر نہیں تو اب ایسا ہونا چاہیے۔

سائنسی ادب کے افادی پہلوؤں کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارا سائنسی ادب دور حاضر میں مثبت رول ادا کر بھی رہا ہے یا نہیں؟ اب وقت آ گیا ہے کہ سائنسی ادب صرف تجسس کی چیز بن کر نہ رہے بلکہ اسے رفاہ عامہ کے لیے کسی Tool یا آلے کی طرح استعمال بھی کیا جاسکے۔ آج کے سائنسی ادب سے کیا کیا تقاضے ہو سکتے ہیں جن کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے اسی طرح کے اور بھی نکات تلاشے جا سکتے ہیں۔

5. نفسیات کا مثبت ارتقاء (Positive Psychological Development) کوئی بھی ادب صرف تفریح طبع کا سامان نہیں ہو سکتا اس سے کسی نہ کسی طرح کے افادی پہلو کی توقع تو رہتی ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حصۂ اوّل میں جن نکات کا ذکر آیا ہے ان کا مقصد اُس وقت میں یہی رہا ہو کہ جدید طرز کی مشینری یا آلات سے لوگوں کی واقفیت کرائی جائے۔ انواع و اقسام کے Gadjets، ترسیل عامہ کے مختلف ذرائع یا نئی نئی ایجادات نے انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ لٹریچر کا (کتابوں یا فلموں) کسی بھی طرح سے انسانوں پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے، بالخصوص TV کے ذریعے۔ اکثر رپورٹس میں آتا رہتا ہے کہ بچوں کو Violent فلمیں نہ دکھائی جائیں، ان کا بچوں پر برا اثر پڑتا ہے اور یہ اثر صرف بچوں پر ہی نہیں بلکہ بڑوں پر بھی ہوتا ہے اور خیالات برانگیختہ ہو سکتے ہیں۔ اب ایک اور نکتہ یہ زیر بحث لایا جا سکتا ہے یا توقع کی جا سکتی ہے کہ سائنسی ادب سے قارئین کی نفسیات کا مثبت ارتقا کیوں نہیں ہو سکا؟ اس طرح کے سائنسی عناصر ادب میں کیوں شامل نہیں کیے گئے؟ مار دھاڑ کے بجائے امن و سکون کا پیغام کیوں نہیں دیا گیا؟ جن سے کوئی مثبت فکر سامنے آتی اور قارئین یا فلم دیکھنے والے ناظرین فیضیاب ہوتے۔

6. نظم وضبط، انداز اور آداب کا ارتقا (Discipline, Manner & Eticates Development)- ایک زمانے میں 'شکتی مان' سیریل نے بچوں کو 'سچ' کی تعلیم تو دی ہی ساتھ ہی شکتی مان کے گھوم کر اڑنے کے اسٹائل کی وجہ سے کئی بچے مجروح ہوئے اور کچھ جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ آج ہم دیکھیں تو 'بالبیر'، 'ڈوریمان'، 'ننجا ہتھوڑی' اور 'موٹو پتلو' اسی طرح کے کچھ سیریل بچوں کو ایک طرف تو بہت کچھ اچھے آداب و اطوار سکھاتے ہیں تو دوسری طرف بچے خود کو بالبیر، ڈوریمان یا ننجا ہتھوڑی سمجھنے لگتے ہیں اور انھیں لگنے لگتا ہے کہ وہ ہر مشکل کام کو آسانی سے کر سکتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ Excitements کے علاوہ ان Half science fictional serials یا فلموں کے ذریعے بچوں اور جوانوں کو Manners، Eticates اور Discipline کی طرف بھی مائل کیا جا سکے......؟ حالاں کہ شکتی مان سیریل نے کافی بعد میں 'چھوٹی چھوٹی مگر موٹی باتیں' ایک چھوٹے سے Session کے تحت اخلاقی باتیں بچوں تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

مذکورہ بالا نکات کی بنا پر دور حاضر میں سائنسی ادب سے جو توقعات کی جا سکتی ہیں ان کو پیش کیا گیا ہے اور سائنسی ادب کو دیگر زاویوں سے دیکھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ سائنسی ادب کے افادی پہلوؤں کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارا سائنسی ادب دور حاضر میں مثبت رول ادا کر بھی رہا ہے یا نہیں؟ اب وقت آ گیا ہے کہ سائنسی ادب صرف تجسس کی چیز بن کر نہ رہے بلکہ اسے رفاہ عامہ کے لیے کسی Tool یا آلے کی طرح استعمال بھی کیا جا سکے۔ آج کے سائنسی ادب سے کیا کیا تقاضے ہو سکتے ہیں جن کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے اسی طرح کے اور بھی نکات تلاشے جا سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا بحث کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ سائنسی ادب بالخصوص 'سائنس فکشن' کو دور حاضر میں اپنے اغراض و مقاصد بدلنے ہوں گے جو انسانیت کے لیے خوش آئند بات ثابت ہو اور سائنسی ادب کے لیے مثبت اور بہترین تبدیلی بھی۔

حواشی:

1. اردو میں سائنس فکشن کی روایت، خورشید اقبال، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ص 40-41
2. ایضاً، ص 45-46
3. جادوگر (انور قمر کے منتخب افسانے)، انتخاب و ترتیب: مظہر سلیم، عامر قریشی، تحریک پبلی کیشنز، ممبئی، نومبر 2015، ص 60-61
4. گیت سناتی ہے ہوا، راشد انور راشد، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2015، ص 31-32

■

Tauseef Bareilvi
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University,
Aligarh - 202001 (UP)

بنا دوا بلڈ پریشر پر قابو پائیے

شمس الاسلام فاروقی

موجودہ دور میں نہ صرف ماحولیاتی کثافت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ افراد کی زندگیاں بھی ذہنی الجھنوں، دشواریوں اور پریشانیوں کی وجہ سے دشوار گزار ہوگئی ہیں۔ نتیجتاً لوگوں کی صحت عامہ متاثر ہوئی ہے اور لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہورہے ہیں جن میں بلڈ پریشر زیادہ عام ہے۔ سروے کرنے پر پتہ چلے گا کہ اکثر و بیشتر لوگ خواہ وہ کسی بھی عمر کے کیوں نہ ہوں، ہائی بلڈ پریشر کے شکار ہیں۔

ہائی بلڈ پریشر کا خاص سبب ذہنی الجھنیں اور ماحولیاتی کثافتیں ہیں۔ بلڈ پریشر دراصل خون کا وہ دباؤ ہے جو ہمارے خون کی سطحی نالیوں میں دل کے سکڑنے اور پھیلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ تکنیکی زبان میں اسے سسٹولک (Systolic) اور ڈائسٹولک (Diastolylic) کہتے ہیں۔ جب دل سکڑتا ہے تب وہ خون کو قوت کے ساتھ نالیوں میں پمپ کرتا ہے۔ اس وقت نالیوں میں خون کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے اور وہ سسٹولک بلڈ پریشر کہلاتا ہے لیکن جب دل پھیلتا ہے اور خون واپس آتا ہے تب یہ دباؤ کم ہوجاتا ہے جسے ڈائسٹولک بلڈ پریشر کہتے ہیں۔ ایک تندرست آدمی کا بلڈ پریشر 80/120 یعنی سسٹولک 120 اور ڈائسٹولک 80 ہونا چاہیے۔ اگر کسی فرد کا بلڈ پریشر اس سے بڑھتا ہے تو اسے مختلف قسم کی تکالیف پیدا ہونے لگتی ہیں۔ خون کا زیادہ دباؤ مستقل بنے رہنے یا ضرورت سے زیادہ بڑھ جانے کی شکل میں مریض دل کے دورے یا برین ہیمرج جیسی مہلک صورت سے دوچار ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر بڑھتے ہوئے بلڈ پریشر پر قابو پانے کے لیے جو دوائیں تجویز کرتے ہیں وہ عموماً وقتی نہیں ہوتیں بلکہ مریض کو انھیں مستقل طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ ان دواؤں کے لگاتار استعمال کرنے سے اکثر دوسری بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں جن سے مریض مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ ان سب باتوں کے پیش نظر بلڈ پریشر کو قدرتی طریقوں سے قابو میں رکھنا دواؤں کے استعمال کے مقابلے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ ذیل میں کچھ ایسے ہی طریقے بیان کیے جارہے ہیں۔

بلڈ پریشر کو قابو میں رکھنے کے لیے مناسب غذا اور جسمانی ورزش انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔

غذا:

ہماری غذا ہلکی اور زود ہضم ہونا چاہیے جس میں کم سے کم تیل اور گھی کا استعمال کیا جائے۔ تلی ہوئی غذا سے مکمل پرہیز کریں۔ کھاتے وقت پیٹ کو بہت زیادہ نہ بھریں اور کھانا وقت پر ہی کھائیں۔ اپنی غذا میں جب بھی ممکن ہو حسب ذیل اشیاء کو شامل کرنے کی کوشش کریں:

1۔ **سنترے کا رس:** سنترہ، موسمی، مالٹا کینو یا لیمو کے رس کا استعمال بلڈ پریشر کو نارمل رکھنے میں بہت اہم رول ادا کرتا ہے۔ دن میں دو گلاس رس پینا بے حد مفید ہے۔ اگر پابندی سے سنترے یا موسمی کا رس پینا ممکن نہ ہو تو لیمو کا رس تو پیا ہی جاسکتا ہے۔ ان سے خون کی نالیوں میں لچک پیدا ہوتی ہے اور ان میں خون کا بہاؤ بہتر ہوجاتا ہے۔

2۔ **کیلا:** ایک عام سستا پھل ہے جسے ہر آدمی آسانی سے استعمال کرسکتا ہے۔ کیلے میں پوٹاشیم کی مقدار زیادہ لیکن نمک کی مقدار کم ہوتی ہے۔ بلڈ پریشر کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کا استعمال بہت مفید ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ بے قاعدہ بلڈ پریشر والوں کے لیے ہر روز دو کیلوں کا استعمال بہترین نتائج کا حامل ہوتا ہے۔

3۔ **چقندر:** ایک بہترین سبزی ہے جو آسانی سے دستیاب ہوتی ہے۔ عام لوگ البتہ اس کی طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ ہر روز چقندر کے رس کا ایک گلاس پینے سے بڑھا ہوا بلڈ پریشر بہت جلد نارمل ہوجاتا ہے۔ چقندر کا اصل جز نائیٹریٹ ہے جو دیگر سبز ترکاریوں میں بھی موجود ہوتا ہے جو بڑھتے ہوئے بلڈ پریشر کو نارمل کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

4۔ **لوکی:** بعض لوگوں کو لوکی کی سبزی زیادہ اچھی نہیں لگتی اور وہ اس کی مفید خصوصیات سے واقف نہیں ہوتے۔ سستی، عام طور پر ملنے والی اس ترکاری کو مختلف طرح سے پکا کر کھانے، اس کا رس یا سوپ پینے سے نہ صرف بڑھا ہوا بلڈ پریشر قابو میں آجاتا ہے بلکہ ذیابیطس کے مریض بھی صحت یاب ہوجاتے ہیں۔ ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لوکی بے حد مرغوب تھی اور آپ سالن سے لوکی کے ٹکڑے ڈھونڈھ ڈھونڈ کر کھایا کرتے تھے۔ جدید دور میں سادھو سنت بھی بڑھے ہوئے بلڈ پریشر کے لیے علی الصبح ایک گلاس لوکی کا رس پینے کی صلاح دیتے ہیں۔

5۔ **لہسن:** ہندستانی غذاؤں میں لہسن کا استعمال بہت عام ہے۔ اسے عام طور پر چٹنی، اچار اور مسالوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لہسن کا استعمال نہ صرف خون کے دباؤ کو قابو میں رکھتا ہے بلکہ اس کے استعمال سے کولسٹرول بھی بڑھنے نہیں پاتا۔ خون پر اس کے اثرات اسپرین کے مشابہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ خون کو پتلا کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ لوگ لہسن کے جووں کو کچا چبا کر کھالیتے ہیں تاہم جو اس کی بو برداشت نہیں کرپاتے وہ انھیں کیپسولس کی شکل میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ کیپسولس کیمسٹ کے پاس آسانی سے مل جاتے ہیں۔

6۔ **زیتون کا تیل:** ہمارے ملک میں زیتون کا تیل عام نہیں ہے۔ یہ عموماً بیرونی ممالک سے منگایا جاتا ہے اور مہنگا ہوتا ہے۔ تاہم جو لوگ اسے استعمال کرسکتے ہیں انھیں ضرور استعمال کرنا چاہیے کیونکہ یہ کولسٹرول کو قابو میں رکھنے اور بلڈ پریشر کو نارمل رکھنے میں بہت مفید پایا گیا ہے۔ زیتون کے تیل میں موجود اولک ایسڈ خون کے دباؤ کو کم کرنے اور خون کی نالیوں کی حفاظت کے لیے بے حد مفید ہے۔ صحت کے نقطۂ نظر سے زیتون کے تیل کا استعمال مکھن، گھی، ناریل کے تیل، پام اور سورج مکھی کے تیل کے مقابلے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

7۔ **سرسوں کا تیل:** سرسوں کے بیجوں میں موجود میگنیشیم خون کے دباؤ کو کم کرنے میں بے حد مفید ہے۔ اس کا تیل نہ صرف خون میں موجود چربی کو کم کرتا ہے بلکہ

انجماد خون کو روکنے میں بھی اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس کا استعمال دمے اور گٹھیا جیسی بیماریوں میں بھی ہے۔ کھانا پکانے کے لیے دوسرے تیلوں کے مقابلے سرسوں کے تیل کو ترجیح دینا چاہیے۔

8۔ **ہرا دھنیا:** ڈاکٹر یقین کے ساتھ اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہرے دھنیے کا پابندی کے ساتھ استعمال بڑھے ہوئے خون کے دباؤ کو نارمل کر دیتا ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق ہرے دھنیے میں موجود مخصوص تیل اُن عضلات کو پرسکون کر دیتا ہے جو خون کے دباؤ کو منضبط رکھنے کے لیے ذمے دار ہیں۔ وہ خون کے بہاؤ کو بہتر کر کے بلڈ پریشر کو کم کر دیتا ہے۔

9۔ **ہلدی:** ہندستانی مسالوں میں ہلدی ایک اہم جز ہے۔ اس میں موجود کرکیومن (Curcumin) جراثیم کش ہے جو بلڈ پریشر کو کم کر کے خون کی نالیوں میں خون کے بہاؤ کو تیز کرتی ہے۔ خون کی نالیوں کو مضبوطی دینے میں بھی ہلدی اہم رول ادا کرتی ہے۔

10۔ **تربوز:** دیگر پھلوں اور سبزیوں کی طرح تربوز بھی پوٹاشیئم کا ایک اہم وسیلہ ہے اور ظاہر ہے کوئی بھی غذا جس میں پوٹاشیئم کی مقدار زیادہ ہو وہ بلڈ پریشر کو کم کرنے میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔ پوٹاشیئم ہمارے جسم کے خلیوں میں موجود نمکیات اور دیگر اشیا کا توازن قائم رکھنے، عضلات کے سکڑنے اور عصبی تحریک کو جاری و ساری رکھنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ تربوز میں کولسٹرول برائے نام ہوتا ہے اور اسی لیے ان لوگوں کے لیے بے حد مفید ہے جو اپنا وزن کم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بلڈ پریشر کو کم کر کے دل کے دورے کے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ کیونکہ تربوز کے استعمال سے پیشاب زیادہ آتا ہے اور جسم میں ٹھنڈک کا احساس بڑھتا ہے اس لیے بلڈ پریشر کو کم کرنے میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

11۔ **پیاز:** پیاز کا استعمال بھی ہندستانی کھانوں میں بہت عام ہے۔ لوگ اسے مسالوں یا پھر سلاد کے طور پر کچا استعمال کرتے ہیں۔ پیاز میں موجود کیمیا کیورسٹین (Cuercetin) خون کا دباؤ کم کرنے میں بے حد مفید ہے۔ ایک نئی تحقیق کے مطابق 730 گرام کیورسٹین فی یوم استعمال کرنے سے بلڈ پریشر کے 22 مریضوں میں خون کا دباؤ خاطر خواہ طور پر کم ہوگیا۔ ایک دوسرے مطالعے کے مطابق روزانہ دو سے تین بڑے چمچے پیاز کھانے سے اُن لوگوں کو بے حد فائدہ ہوا جو ہائی بلڈ پریشر کے شکار تھے۔ پیاز کے استعمال سے 67% لوگوں میں ان کا سسٹولک بلڈ پریشر 25 پوائنٹ اور ڈائسٹولک پریشر 15 پوائنٹ کم ہوگیا تھا۔ پیاز اتنی عام چیز ہے کہ لوگ خون کے دباؤ کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کا استعمال بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔

12۔ **شہد:** شہد میں موجود اسٹیل کولین دل کی جانب خون کے بہاؤ کو بہتر کر کے خون کے دباؤ کو کم کر دیتا ہے اور دل کی رفتار پر بھی قابو رکھتا ہے۔ شہد سے بھرپور فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایک ایک چمچہ شہد، ادرک کا رس اور زیرے کا سفوف پانی میں ملا کر دن میں دو بار پینا چاہیے۔ شہد میں موجود بعض اجزاء دل کی طرف خون کے بہاؤ کو بڑھا دیتے ہیں جس سے دباؤ کم ہو جاتا ہے اور دل کی رفتار بھی گھٹ جاتی ہے۔

13۔ **انگور:** انگور میں موجود اینٹی آکسی ڈینٹس نالیوں میں خون کے بہاؤ کو بہتر کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ایک مطالعے کے دوران کچھ لوگوں کو چوتھائی پیالی انگور کھلائے گئے۔ انھوں نے محض تین گھنٹے بعد ہی بتایا کہ ان کے پھیپھڑوں کی نالیوں میں خون کا بہاؤ بہت بہتر ہوگیا تھا۔ تین مہینوں تک لگاتار انگوروں کے استعمال سے نتائج اور بھی بہتر نکلے تھے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ انگور میں موجود اینٹی آکسی ڈینٹس ہی خون کی نالیوں کو پرسکون بناتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں خون کا بہاؤ اچھی طرح عمل میں آتا ہے اور بالآخر بلڈ پریشر نارمل ہو جاتا ہے۔

14۔ **سبز چائے:** سبز چائے بھی خون کے دباؤ کو کم کرنے میں بے حد مفید ہے۔ چین کے تحقیق کاروں نے معلوم کیا ہے کہ روزانہ صرف ایک پیالی سبز چائے پینے سے بلڈ پریشر حیرت انگیز طور پر نارمل ہو جاتا ہے۔ چین کے لوگوں میں سبز چائے کا استعمال بہت عام ہے تاہم اب مغربی ممالک بھی بلڈ پریشر کنٹرول کرنے کے لیے اسے اپنانا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں امریکی تحقیق کاروں نے بھی اس امر کی توثیق کی ہے کہ سبز چائے کا استعمال خون کے دباؤ میں کمی کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

15۔ **تُلسی:** ہندستان کے ہندو گھرانوں میں تُلسی کے پودے کو ایک خصوصی مذہبی حیثیت حاصل ہے۔ عام گھروں میں اس کا پودا ضرور ہوتا ہے۔ تلسی میں موجود وٹامن سی، اینٹی آکسی ڈینٹس، پوٹاشیئم، اور کیمفین نہ صرف نروز کو سکون بخشتی ہیں بلکہ تھکاوٹ دور کر کے خون کے بہاؤ میں تیزی پیدا کر دیتی ہیں جس کے نتیجے میں بلڈ پریشر نارمل ہو جاتا ہے۔

جسمانی کسرت:

1۔ **چہل قدمی:** پابندی سے چہل قدمی کرنے اور ساتھ میں ہلکی پھلکی ورزش کرنے سے بلڈ پریشر نارمل رہتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جسمانی حرکت سے دل کے عضلات میں مضبوطی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح دل خون کی نالیوں میں کسی بھی قسم کا دباؤ پیدا کیے بغیر خون کو پمپ کرتا رہتا ہے۔

2۔ **یوگا ورزشیں:** بلڈ پریشر کو نارمل رکھنے میں یوگا ورزشیں بہت کارگر ثابت ہوئی ہیں۔

(I) **وشرام مُدرا:** بلڈ پریشر کو کم کرنے میں سکون کی پوزیشن بہت کارگر ہے۔ اس کے لیے آپ:

(i) کسی صاف ستھری کھلی ہوئی جگہ پر پیٹھ کے بل سیدھے ہو کر لیٹ جائیے۔

(ii) اپنی آنکھوں کو بند کر لیجیے۔

(iii) تمام خیالات سے بالکل خالی الذہن ہو جائیں لیکن صرف آپ کا جسم آپ کے دھیان میں رہے۔ اس کے بعد اپنے دماغ کو جسمانی اعضا پر مرکوز کر دیں۔

(iv) اب پیر کے انگوٹھوں سے سر تک تمام اعضا کو اپنی مرضی سے ڈھیلا چھوڑ دیں۔

(v) خیال رہے کہ اس دوران کوئی بھی پریشان کن خیال آپ کے دماغ میں نہ آنے پائے۔ چند منٹ اس حالت میں رہنے سے آپ اپنے اندر ایک سکون اور آرام کی کیفیت محسوس کریں گے جو آپ کے بلڈ پریشر کو نارمل کرنے میں مدد کرے گی۔

(II) **انوم ولوم:** سانس کی یہ ورزش بلڈ پریشر کو نارمل رکھنے میں بے حد کارگر ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آلتی پالتی مار کر سکون کی حالت میں بیٹھ جائیں۔ اپنے دائیں نتھنے کو انگوٹھے کی مدد سے بند کر کے بائیں نتھنے سے سانس اندر کھینچیں۔ اب بائیں نتھنے کو بند کریں اور دائیں کو کھول کر اس سے سانس باہر نکالیں۔ یہ سانس لینے اور باہر نکالنے کی پہلی حالت ہوئی۔ اس کے بعد اس کا الٹا کریں یعنی بائیں نتھنے کو بند کریں، دائیں سے سانس اندر لیں اور پھر بائیں سے باہر نکالیں۔ چند منٹ روزانہ اس عمل کو دہرائیں۔

اگر آپ اپنی روزمرہ کی زندگی کو باقاعدہ بناتے ہوئے پابندی کے ساتھ متوازن غذا کھائیں اور اوپر بیان کی ہوئی کسی بھی ممکن غذا کا استعمال کریں جس کے ساتھ چہل قدمی اور یوگا ورزشیں بھی شامل ہوں تو یقین رکھیں کہ دواؤں کے بغیر ہی آپ اپنے بلڈ پریشر کو نارمل رکھ پائیں گے۔

■

Shamsul Islam Farooqui
90-B, Ahata Talib, Noor Nagar
New Delhi - 110025

تبصرہ و تعارف

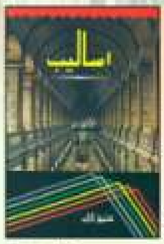

اسالیب

مصنف: عتیق اللہ

صفحات: 376، قیمت: 166 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: چودھری ابن النصیر، 9 کانپور روڈ، نیو فرینڈز کالونی، الہ آباد 211001

1970 کے بعد اردو کے جن ناقدوں کو اعتبار و استناد کا درجہ حاصل ہوا ان میں عتیق اللہ کا نام بھی شامل ہے۔ ان کی ذہنی پرورش و پرداخت ایسے ادبی رجحانات کے زیر اثر ہوئی جنھیں ہم ترقی پسندی اور جدیدیت کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کا طرز احساس، طرز فکر اور طرز بیان اپنے معاصرین سے بالکل مختلف ہے۔

'اسالیب' بائیس مضامین پر مشتمل ان کا ایک ایسا نیا مجموعہ ہے جو ماضی کی ادبی تنقیدی روایت پر شب خون مارنے جیسی حیثیت رکھتا ہے۔ کم و بیش تمام مضامین میں تنقید کے مابعد جدید تصورات، نظریات، فکریات کے حوالے سے تجزیاتی مطالعے پیش کیے گئے ہیں جو آج کے طرز فکر سے سروکار رکھتے ہیں۔ اردو میں تانیثیت، نئی تاریخیت، تہذیبی و ثقافتی شعریات، نومارکسیت اور دیگر نئے افکار و تصورات کو بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے مختلف مضامین میں ان کا اطلاق کیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عتیق اللہ عملی طور پر فن پارے کے تجزیاتی مطالعے پیش کرنے میں نہایت سرگرم کار رہے ہیں اور نقد ادب میں اطلاقی تنقید کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا پہلا مضمون 'تنقید کا تفاعل' سب سے طویل مضمون ہے اور اس کو شروع میں شامل کرنے کا منشا یہی ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو تنقید نے جو چولا بدلا ہے، جو نیا رنگ اختیار کیا ہے، فکر و تعقل کے جو نئے در وا کیے ہیں اور جن سے ادبی تنقید کی تازہ ہوائیں آرہی ہیں، ان سب سے قارئین کو روشناس کرایا جاسکے۔ عتیق اللہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اچھے اور غیر معمولی تخلیقی ادب میں اعلیٰ درجے کی تنقید کے امکانات بھی مضمر ہوتے ہیں۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ نئی نسل کو بزرگ نقادوں سے لو ہی نہیں لگانا چاہیے کیوں کہ وہ عموماً اپنے نظریوں اور ادب فہمی کے رویوں میں بے لچک ہوتے ہیں۔

عتیق اللہ نے حالی/شبلی، مظفر علی سید کا منٹو، گوپی چند نارنگ کا طریقۂ نقد، شمیم حنفی کی تنقید، سلیم احمد، جیسے مضامین میں ان ناقدوں کے تنقیدی رویے، تنقیدی مطلقات اور ادبی مابعد الطبیعات کی چھان بین کی ہے۔ شمیم حنفی پر لکھتے ہوئے انھوں نے ان کے مضامین کے بعض متنازعہ فیہ بیانات اور بحث طلب ارشادات پر کھل کر گفتگو کرتے ہوئے اپنے موقف کو ہی نہیں پیش کیا بلکہ دلائل و براہین سے زیر کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مظفر علی سید کے مضمون سے پہلے منٹو کو کیوں نہ اس طرح دیکھا جائے' میں منٹو کی افسانوی دنیا کی ایسی سیر کرائی ہے کہ ان کے لیے زبان سے دعائیہ کلمات نکلتے ہیں۔ منٹو پر یوں تو ہزاروں مضمون لکھے گئے لیکن اس تیئس صفحے کے مضمون میں منٹو کے ذہنی اور تخلیقی عمل کے تمام گوشوں کو یکلخت کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ چوں کہ عتیق اللہ خود بھی ایک اچھے شاعر ہیں اور ان کی تخلیقی سرگرمی کبھی مدھم نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر اور شاعری کے حوالے سے ان کا تنقیدی وژن ٹھوس اور پختہ ہے۔ اس کتاب میں مشمولہ کئی مضامین جو شاعری کے حوالے سے ہیں عتیق اللہ کی ذہنی بلندی اور ان کی تنقیدی علمیت کی مثال ہیں۔ غالب کے حوالے سے چار مضامین 'بیسویں صدی کا تخلیقی ذہن اور غالب'، 'غالب کے ایک شعر کی مصنفانہ تعبیر'، 'پورے غالب کی تلاش اور آل احمد سرور' اور 'فتح محمد ملک کے غالب' شامل ہیں۔

میر انیس ایک ایسے شاعر گزرے ہیں جنھیں ہر دور میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ عتیق اللہ نے انیس کی عظمت کے عنوان سے ان کی مرثیہ گوئی پر جامع مضمون لکھا ہے۔ شاد عظیم آبادی کی غزل کے دو رنگ کے زیر عنوان مضمون میں شاد کی شاعری کی نئی پرتیں کھولی ہیں۔ 'سردار جعفری کے کلام میں شعری عمل کی سطحیں' ایک ترقی پسند شاعر کو صرف خراج عقیدت ہی نہیں ہے بلکہ ترقی پسند شاعری کو کسی نظریے سے الگ رکھ کر دیکھنے کی کوشش ہے۔ قاضی سلیم جدید اردو نظم کا ایک معتبر نام ہے۔ ان پر عتیق اللہ کا مضمون خود آگاہ اور خود آگہی کی عمدہ مثال بن کر سامنے آیا ہے۔ سلیم احمد پر عتیق اللہ کا مضمون پڑھ کر جی بہت خوش ہوا۔ یوں تو سلیم احمد کی تنقید کی کتابیں زیادہ اور شاعری کی کم ہیں اور عتیق اللہ نے شاعری کی تین کتابوں (بیاض، اکائی، چراغ نیم شب) کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان کی طویل نظم مشرق (جو اسی نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی) کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالاں کہ سلیم احمد کی نظم نگاری کے تعلق سے کوئی بھی بیان اس نظم کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ سرسید پر عتیق اللہ کا مضمون ان کی صحافتی، علمی، تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں کا احاطہ کرتے ہوئے ایسے چند اہم گوشے واشگاف کرتا ہے جن سے آج کے عہد میں سرسید کی ضرورت کا احساس تیز تر ہو جاتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور پر ان کے دو مضامین ٹیگور سے ان کی شیفتگی کا عمدہ ثبوت ہیں۔ جس میں انھوں نے موجودہ عہد میں ٹیگور کی معنویت پر بحث کی ہے نیز ٹیگور کے فکری رویوں کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ مجتبیٰ حسین پر ان کا مضمون واجبی سا ہے صرف اس لیے کہ طنز و مزاح ان کا میدان بھی نہیں۔ ان کا مضمون 'ہندوستانی تہذیبی روایت اور اردو شاعری' بھرپور معنویت کا حامل ہے۔ اردو شاعری کو تہذیبی/ثقافتی روایات کے تناظر میں جانچنے

پرکھنے کا عمل مشکل تر ہے لیکن عتیق اللہ نے اردو شاعری کے چیدہ چیدہ شاعروں کے حوالے سے کامیاب مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ مضمون سنجیدہ مطالعے کا متقاضی ہے کیونکہ ہماری تہذیبی زندگی میں اردو زبان کی تاریخ اجتماعی لاشعور کا حصہ ہے اور اس حوالے سے گفتگو ہمارے ذہن کے دریچوں کو کھولتی ہے۔ اردو ادبی تنقید میں عتیق اللہ کی حیثیت ایک ایسے ناقد کی جس نے بندھے ٹکے اصولوں اور کلیشے سے ہمیشہ گریز کیا ہے اور اپنی نئی راہ اختیار کی ہے۔ ادب کا صاف ستھرا ذوق رکھنے والے طالب علم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے اور کاغذ بھی بہت عمدہ ہے۔ 336 صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف 166 روپے ہے۔

اردو فکشن کی تنقید

مصنف: پروفیسر ارتضیٰ کریم

صفحات: 546، قیمت: 230 روپے، سنہ اشاعت: 2016

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، D64، فلیٹ نمبر 10، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

فکشن کا المیہ یہ ہے کہ نہ اس کی شعریات منظم و مربوط طور پر مرتب کی گئی ہے نہ ہی ایسے اصول وضوابط وضع کیے گئے ہیں جو شاعری کی تنقید سے مختلف ہوں۔ اسی لیے عمومی تاثر یہ ہے کہ شاعری کی تنقید کے مقابلے میں فکشن کی تنقید قدرے کمزور ہے۔ فکشن کے باب میں یوں بھی ایسی معروضی تنقید کم ہے جس میں زبان کے تفاعل اور متن کے ساختیے پر گفتگو ہو۔ زیادہ تر فکشن ناقدین بیانیے کی تعبیر اور تشریح میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور فکشن کے نظری قضایا اور عملی اطلاقات نظر سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اردو فکشن کی تنقید کے حوالے سے ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں فکشن تنقید کے تمام تر تناظرات اور ارتقائی سفر کا جائزہ لیا گیا ہو۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے اردو فکشن کی تنقید کو اپنا موضوع اور محور بنایا اور فکشن تنقید کے تعلق سے جتنا بھی سرمایہ اردو ادب میں موجود ہے اس کا محاسبہ اور محاکمہ کرتے ہوئے کچھ ایسے نتائج برآمد کیے جس سے یہ اندازہ ہوا کہ اردو میں افسانے کی تنقید کم ضرور لکھی گئی ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ افسانہ نگاروں کو یہ شکایت ہو کہ اس صنف کی طرف ناقدین کی توجہ کم رہی ہے۔ ارتضیٰ کریم نے اپنی کتاب اردو فکشن کی تنقید کے ذریعے یہ ثابت کردیا ہے کہ اردو میں فکشن تنقید کا قابل قدر سرمایہ موجود ہے۔ یہ اور بات کہ اردو افسانے کی تنقید کا منظرنامہ بہت زیادہ روشن نہیں ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے فکشن تنقید سے متعلق لکھی گئی کتابوں اور مقالوں کے مباحث کا بہت ہی عمدہ تجزیہ کیا ہے اور افسانوی ادب کی تنقید کے ارتقائی سفر کا مکمل منظرنامہ پیش کردیا ہے۔

پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب کا پہلا باب 'اردو فکشن کی تنقید: آغاز وارتقا' کے حوالے سے ہے۔ اس باب میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اٹھارھویں صدی عیسوی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک اردو میں افسانوی ادب کی تنقید کا مرحلہ وار جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سترھویں صدی سے اٹھارھویں صدی کے اختتام تک اردو میں فکشن کی تنقید کے سلسلے میں تقریباً خاموشی کی سی کیفیت ہے اور جو بھی تنقیدی اشارے سامنے آئے ہیں وہ تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ انھوں نے خط تقدیر کے مقدمے کی بنیاد پر مولوی کریم الدین کو اردو افسانے کا پہلا باضابطہ نقاد قرار دیا ہے اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ناول کی ہیئت و ساخت کے متعلق عبدالحلیم شرر نے سب سے زیادہ مضامین تحریر کیے۔ فکشن تنقید کے معماروں میں انھوں نے مولوی کریم الدین، خواجہ بدرالدین خان امان دہلوی، مرزا غالب، نذیر احمد، شرر، رسوا اور سجاد حیدر یلدرم کے نام تحریر کیے ہیں اور یہ معلومات بھی بہم پہنچائی کہ اردو میں لفظ 'ناول' کو سب سے پہلے شاد عظیم آبادی نے اور سب سے زیادہ شرر نے استعمال کیا۔ اس باب میں بہت سے اہم انکشافات کیے گئے ہیں مثلاً تمثیل کا لفظ پہلی بار ملا وجہی نے استعمال کیا، سب سے پہلے اس کی تعریف گارساں دتاسی نے کی۔ داستان کا لفظ سب سے پہلے تحسین نے استعمال کیا۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی اہم معلومات ہیں جو فکشن کے حوالے سے اس باب میں درج کی گئی ہیں۔

دوسرے باب میں تمثیل نگاری کے حوالے سے تنقیدی سرمایے کا جائزہ لیا گیا ہے جس کے بہ موجب اردو میں تمثیل کے نقادوں میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر گیان چند جین، عزیز احمد، ڈاکٹر منظر اعظمی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان لوگوں نے تمثیل کے تنقیدی سرمایے میں اضافہ کیا ہے۔ داستان کے تنقیدی سرمایے پر بھی انھوں نے بہت ہی مبسوط اور مفصل گفتگو کی ہے۔ داستان کی تنقید پر لکھی گئی اہم کتابوں اور ناقدین کا محققانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے کلیم الدین احمد، ڈاکٹر گیان چند جین اور راہی معصوم رضا وغیرہ کے نام درج کیے ہیں جن کی کتابیں داستان کی تنقید میں نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ناول کے تنقیدی سرمایے پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ناول تنقید کے ضمن میں مرزا رسوا کے تصورات کو زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ ناول کی فنی خصوصیات پر سب سے پہلا اور طویل تنقیدی مضمون سید سجاد حیدر کا ہے جو 'معارف' علی گڑھ میں 1898 میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے عبدالحلیم شرر، پریم چند اور ناول تنقید کے حوالے سے لکھے جانے والے تنقیدی مقالات کے علاوہ علی عباس حسینی، نورالحسن ہاشمی، احسن فاروقی، پروفیسر قمر رئیس، آدم شیخ، عبدالسلام، یوسف سرمست، ڈاکٹر شریف احمد اور پروفیسر خورشید الاسلام اور دیگر ناقدین کی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ محاکمے کے بعد انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ ناول کا تنقیدی سرمایہ ابھی بہت زیادہ تشفی بخش نہیں کہا جاسکتا اور ناول کے فن پر نظریاتی تنقید کی بہت کمی ہے۔ انھوں نے ناول کے تنقیدی سرمایے پر اپنی مایوسی کا اظہار بھی کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ باب ناول تنقید کے باب میں غور وفکر کے بہت سے نئے دریچے کھولتا ہے۔

افسانے کے تنقیدی سرمایے کا بھی انھوں نے بہت ہی مربوط جائزہ پیش کیا ہے۔ اس تعلق سے جو تنقیدی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی انھوں نے فہرست بھی درج کی ہے۔ تقریباً ستانوے کتابوں کی فہرست پیش کرنے کے بعد وہ یہ لکھتے ہیں کہ ان میں کچھ کتابیں ایسی ہیں جن کی تاریخی اہمیت ہے اور کچھ ایسی ہیں جو بقول اکبر الہ آبادی قابل ضبطی ہیں۔ انھوں نے ان تمام کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اس میں عبدالقادر سروری، وقار عظیم، ممتاز شیریں، جعفر رضا، وارث علوی، شہزاد منظر، مرزا حامد بیگ وغیرہ اہم ہیں۔ انھوں نے افسانے پر لکھے گئے بیشتر نقادوں کی تحریروں کا بے لاگ تجزیہ کیا ہے اور کچھ کتابوں کے بارے میں انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ یہ افسانے کی تنقید کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بہت ہی عمدہ تجزیہ ہے، جس سے اردو افسانے کی تنقید کے منظرنامے پر مکمل روشنی پڑتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی اردو افسانے کی تنقید میں معروضیت، معنویت اور وسعت کی ضرورت ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو فکشن کی تنقید کا ایک اشاریہ بھی مرتب کیا ہے جس میں اردو کے قدیم وجدید رسائل میں اردو فکشن پر بکھرے ہوئے اہم مضامین کی فہرست دی گئی ہے۔ یہ فہرست فکشن تنقید پر کام کرنے والوں کے لیے سنگ نشاں کی حیثیت رکھتی

ہے۔ یہ ایک بہت ہی اہم اشاریہ ہے جو بڑی محنت اور عرق ریزی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس اشاریے میں آجکل دہلی، آہنگ گیا، ادب لطیف لاہور، ادبیات اسلام آباد، ادبی دنیا لاہور، اردو اورنگ آباد، اردو ادب علی گڑھ، اسلوب کراچی، اشارہ پٹنہ، اظہار ممبئی، اکادمی لکھنؤ، الناظر لکھنؤ، اوراق لاہور، اورینٹل کالج لاہور، جامعہ دہلی، جواز مالیگاؤں، دریافت کراچی، ذہن جدید دہلی، راوی پٹنہ، زبان و ادب پٹنہ، زمانہ کانپور، ساقی کراچی، سوغات بنگلور، سب رس حیدرآباد، سویرا لاہور، سیپ کراچی، شاعر ممبئی، شاہراہ دہلی، شب خون الہ آباد، صبا حیدرآباد، صحیفہ لاہور، صریر کراچی، صنم پٹنہ، طلوع افکار کراچی، عالم گیر لاہور، عصری آگہی دہلی، علی گڑھ میگزین علی گڑھ، فکر و نظر علی گڑھ، فنون لاہور، قومی زبان کراچی، کتاب لکھنؤ، کتاب نما دہلی، گفتگو بمبئی، ماہ نو لاہور، محور دہلی، مخزن لاہور، معارف علی گڑھ، معاصر پٹنہ، معلم اردو لکھنؤ، معیار، مفاہیم گیا، ندیم پٹنہ، نقوش کراچی، نگار لکھنؤ، نوائے ادب بمبئی، نیا دور کراچی، نیا دور لکھنؤ، نیرنگ خیال لاہور، ہمایوں لاہور، ہندوستانی الہ آباد اور دیگر قدیم رسائل میں اردو فکشن پر چھپنے والے بیش قیمت مضامین کا اندراج کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو فکشن کی تنقید میں یہ کتاب ایک 'نقطۂ حوالہ' کی حیثیت رکھتی ہے۔ دستاویزی اہمیت کی حامل اس کتاب کا امتیاز یہ ہے کہ بقول انور سدید یہ کتاب اس موضوع پر اولیت کا درجہ رکھتی ہے اور بقول وحید قریشی ارتضیٰ کریم پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو فکشن کی تنقید کو موضوع بنا کر پوری کتاب لکھی ہے۔

یہ کتاب 1996 میں شائع ہوئی تھی اس لیے اس میں وہ تمام مقالے اور کتابیں شامل نہیں ہیں جو دو ہزار کے بعد فکشن تنقید کے حوالے سے منظر عام پر آئی ہیں۔ دو ہزار کے بعد اردو فکشن کی تنقید میں قابل قدر سرمایے کا اضافہ ہوا ہے اور بہت سے رسائل اور جرائد نے فکشن پر خصوصی شمارے بھی شائع کیے ہیں جن میں بہت ہی مفید اور کارآمد مضامین بھی شامل ہیں۔ قومی اردو کونسل سے شائع شدہ اس کتاب کی تازہ اشاعت میں ایک ضمیمہ شامل کیا جاتا تو اس کتاب کی افادیت اور معنویت مزید بڑھ جاتی۔

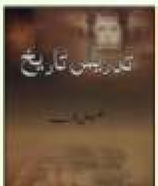

تدریس تاریخ

مصنف: خلیل الرب
صفحات: 272، قیمت: 110 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر زیب النساء سعید، شعبۂ اردو،
سی، ایم، پی، ڈگری کالج (الہ آباد یونیورسٹی)، الہ آباد 2

خلیل الرب اردو زبان کے تعلیمی میدان میں ہمیشہ سرگرم کار رہے۔ انھوں نے اردو تدریس کے میدان میں بھی نمایاں کارنامے انجام دیے۔ تعلیمی موضوعات پر اردو میں عمدہ کتابیں بہت کم دستیاب ہیں۔ خلیل الرب کی کتاب تدریس تاریخ ان معنوں میں مفید کتاب ہے کہ اس میں تاریخ کے حوالے سے درس و تدریس کے ایسے طریقہ ہائے اصول بتائے گئے ہیں جن سے طلباء کی ذہنی آراستگی تو ہوتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کی تدریسی ضروریات کے لیے نشان راہ ہیں۔ تاریخ دراصل اپنے مفصل معنوں میں ہمارے ماضی کا مطالعہ ہے اور یہ مطالعہ ماضی کے براہ راست مشاہدے پر موقوف نہیں بلکہ ماضی کی معلومات ایسے حالات و واقعات، ایسے حادثات و وقوعات سے منسوب ہوتے ہیں جو ماضی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دراصل تاریخ ہمارے ماضی کا علم حاصل کرنے کا ایک ایسا ذریعہ ہے جسے ہم وقت کے گم گشتہ نشانات میں ڈھونڈتے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ابن خلدون نے بہت پہلے کہا تھا کہ تاریخ کو انسانی معاشرہ یا عالمی تہذیب اور اس میں رونما ہونے والے تغیرات کی دستاویز ہونا چاہیے۔ تاریخ کا مطالعہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہوتی ہے۔

اس کتاب کو چودہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں تاریخ کے حوالے سے اس کی تعریف بیان کی گئی ہے اور تاریخ کے متعلق مختلف نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان سے بحث کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں تاریخ کے مطالعے کے حوالے سے اس کے متعلق نظریاتی تصورات و میلانات اور ہندوستان کے نظام تعلیم میں تاریخ کے مقام پر گفتگو کے ساتھ عصری تاریخ کے تصور کے آغاز، اس کی نوعیت اور حدود اور عصری تاریخ کی تعمیمات کے اصول بتائے گئے ہیں۔

تیسرے باب میں تاریخ کی تدریس کے لیے ماخذ کی اہمیت اور تاریخ کے مطالعے کا سائنسی طریقہ نیز داخلی اور خارجی تنقید کے ذریعے ماخذ کی نوعیت کے تعین وصحت کی توثیق کے مسئلے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

چوتھے باب میں تاریخ کو مقامی، علاقائی، قومی، طبقاتی، عالمی تاریخ کے حوالے سے ان میں باہمی ربط اور تدریس میں ان کے استعمال پر گفتگو کی گئی ہے۔

پانچواں باب ان معنوں میں اہم ہے کہ اس میں تاریخ کے مقاصد اور اقدار کے تعین کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اساتذہ کے لیے تدریس تاریخ کے لیے ممکنہ اصول طے کیے گئے ہیں۔ اس طرح باقی ابواب اساتذہ کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ ان میں تدریس تاریخ کے جدید طریقے، تدریس تاریخ کے اہم عناصر اور تاریخ میں پیمائش قدر (Evaluation) کے ساتھ تدریس تاریخ میں تصور وقت کی اہمیت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ تاریخی مواد کے انتخاب، ترتیب وار سلسلہ تدریج کے اصول کے تحت خلیل الرب صاحب نے سائنٹفک اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عصری مسائل کی شمولیت میں وقت کے تناظر کے لحاظ پر زور دیتے ہوئے تدریس تاریخ کے لیے جو اصول بتائے ہیں وہ ہمارے اساتذہ کے لیے انتہائی کارآمد ہیں۔ تاریخ کی تدریس کے یوں تو اس جدید ٹیکنالوجی کے عہد میں مغرب میں کئی اصول و نظریات ترتیب پاتے رہتے ہیں اور تاریخ کے مطالعے پر عالمی اذہان کو مرتکز کرنے کے لیے کئی انسائیکلوپیڈیائی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن اردو میں تدریس تاریخ کی کتابوں کے فقدان کے باعث اس کتاب کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ اس میں تدریس تاریخ کے انتہائی جدید طریقہ ہائے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی مختلف جہتوں پر بحث کی گئی ہے اور بڑے جامع اصول مرتب کیے گئے ہیں۔

خلیل الرب کی یہ کتاب صرف ان لوگوں کے لیے فکر و عمل کی حامل نہیں ہے جنھیں تاریخ کے موضوع سے دلچسپی ہے بلکہ ان اصحاب کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہے جو اس موضوع سے تھوڑا بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ یہ کتاب ہر سطح کے تعلیمی تربیتی اداروں اور ثانوی سطح کے معلمین کے لیے بھی نہایت مفید اور کارآمد ہے کیوں کہ ان کو تاریخ پڑھاتے وقت جن دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے ان کے تعلق سے خلیل الرب نے ایسے مواد جمع کردیے ہیں جن سے استفادہ کرکے جدید اصول درسیات پر کاربند رہا جاسکتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے اردو کی درسی ضرورت کے تحت تاریخ کے موضوع پر اتنی کارآمد اور اہم کتاب شائع کی۔

کلیات میکش اکبر آبادی

مرتب: پروفیسر فضل امام
صفحات: 390، قیمت: 180 روپے، سنہ اشاعت: 2017
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، بیت الراضیہ، G-5/A
ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

میکش اکبر آبادی ہمارے قدیم شعرا کی صفِ اوّل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے روایتی شاعری کے احترام میں اپنی دانست میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ اُن کے کلام میں اگر ایک طرف حُسن وعشق کی چاشنی نظر آتی ہے تو دوسری طرف ہجر و وصال کے افسانے بھی۔ انھوں نے اپنی تمام شاعری میں پاکیزہ جذبوں کو فراموش نہیں ہونے دیا۔ وہ اگر رومان پرور فضاؤں میں نغمہ سرا ہیں تو ہجر و وصال کا مرثیہ بھی اُن کی قلمی کاوشوں میں شامل ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں شعور وآگہی کے ایسے افسانے خلق کیے ہیں کہ بے ساختہ انھیں داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کا اہم سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے بزرگ شعرا، ادبا اور حکما سے کسبِ فیض کرنے میں قطعی جھجک محسوس نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی شاعری کے دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے کلام میں ایسا تنوع نظر آتا ہے جس کے تتبع کے لیے ذہن آمادہ ہو جاتا ہے۔ اُن کا یہی اظہار و انفراد انھیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ اپنے دور کی فضائے شعروادب میں اُن کا طوطی بولتا تھا۔ وہ ایسے دلکش اور موزوں اشعار قلم بند کرتے تھے کہ ایک زمانہ اُن کی کہنہ مشقی کا قائل تھا۔ فلسفۂ جمالیات ہو یا فلسفۂ عشق، کیفیات کا بیان ہو یا محاکات کا اور غمِ زیست ہو یا غمِ ہستی ہر جگہ انھوں نے اپنے نمایاں رنگ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میکش اکبر آبادی ایک صوفی شاعر تھے لیکن اُن کا تصور روایتی نہیں تھا، حالانکہ اُن کے کلام میں روایتی شاعری کے نمونے جا بجا نظر آتے ہیں۔ انھوں نے نعت، منقبت، غزل اور نظم وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے اُن کی شعری توانائیاں ہر صنفِ سخن میں اپنے جلوۂ صد رنگ کے ساتھ موجود ہیں۔

پیشِ نظر کتاب 'کلیاتِ میکش اکبر آبادی' جہاں اُن کی شاعری پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے اور اُن کے کلام سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے، وہیں علم وفن کے کئی دریچے وا ہوتے نظر آتے ہیں۔ کتاب کے مرتب پروفیسر فضل امام نے اُن کی شاعری کا بہت عمدہ محاکمہ کیا ہے۔

جب ہم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع کلیاتِ میکش اکبر آبادی کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ میکش اکبر آبادی واقعی روایتی شاعری میں یدطولیٰ رکھتے ہیں اُن کے درج ذیل اشعار دیکھیے:

تم دل ہو تمنا کا تم دل کی تمنا ہو
تم کیف ہو دُنیا کا تم کیف کی دُنیا ہو

تم دل کی مُسرت ہو تم نور ہو آنکھوں کا
تم زینتِ خلوت ہو تم انجمن آرا ہو

مانا کہ شانِ حسن ہیں بے التفاتیاں
تیری طرف نہ دیکھ رہا ہوں میں جب تو دیکھ

اگر وحشت نہیں میری سی تجھ کو بھی تو پھر کیا ہے
مری آنکھوں میں کیوں ہر دم تری تصویر پھرتی ہے

وہ غزل کو تصوف اور تصوف کو غزل کا لباس پہنانے کے ہُنر سے واقف تھے اپنی کشادہ ذہنی اور وسیع المشربی کے باوصف حسن وعشق کے معاملات اور رازِ دروں پر گہری نظر رکھتے تھے اور اپنی بصیرت آمیز شاعری سے عشقِ حقیقی کی جملہ کیفیات کی ترجمانی میں انھیں مہارت حاصل تھی۔

میکش اپنے ایک شعری مجموعے 'حرفِ تمنا' کے حرفِ اوّل میں اپنے عہد کے ادبی رجحانات سے متعلق رقمطراز ہیں:

''میرے سامنے ادب کے کئی رجحانات اُبھرے اور مٹے ہیں، سیاست اور تہذیب نے کئی پلٹے کھائے ہیں۔ میں نے اُن سب کا مطالعہ کیا ہے ایک تماشائی کی طرح نہیں، بلکہ ایک فریق کی طرح اور اُس میں مجھے جو بھی بہتر معلوم ہوا اُسے اپنے ذہن وشعور میں سمونے کی کوشش کی ہے۔''

میکش کے خیالات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد میں موجزن ہونے والی ادبی لہروں سے آشنا تھے اور انھیں سلیقے سے اپنے کلام میں برتنے پر قادر بھی۔ درج ذیل اشعار میری بات کی ضرور تائید کریں گے۔ انھوں نے خاتمۂ زمینداری سے متعلق کہا:

قوانین سرکار بدلے گئے — کسانوں کے غمخوار بدلے گئے
ہوئیں ختم ایسے زمینداریاں — کہ جیسے زمیندار بدلے گئے
یہ جہاں بھی تو ہے اس کی آخری منزل بھی تو — بانیٔ محفل بھی تو ہے خاتمِ محفل بھی تو

قحطِ بنگال پر میکش نے اس طرح تبصرہ کیا ہے:

کیا خبر تھی کہ تری آنکھ کا بدمست خُمار — بن کے افلاس ترے جسم پہ چھا جائے گا
کیا خبر تھی کہ تری جاں کا محافظ تجھ کو — مثلِ یوسف سرِ بازار ہی بکوائے گا

یقین کیا جانا چاہیے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دوسری کتابوں کی طرح کلیاتِ میکش اکبر آبادی کا بھی استقبال کیا جائے گا اور کو ہمارے قدیم شعرا کی ایک بڑی نسل کو متاثر کرنے والے روایتی شاعر کے خیالات سے آگہی کا ذریعہ بنے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159
E-mail:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تنقید و تحقیق

تنقید و تفہیم

مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

صفحات 152، قیمت: 93 روپے

پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: اشفاق احمد عمر، ریسرچ اسکالر جے این یو، نئی دہلی

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا نام محتاج تعارف نہیں انھیں اردو ادب میں بحیثیت محقق، ناقد، شاعر و ادیب ہر نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ اردو ادب کے دامن کو وسیع سے وسیع تر بنانے اور ہر دن اس میں نئے گل بوٹے ٹانکنے میں موصوف کا نام قابل ذکر ہے۔ اب تک ان کی الگ الگ مضامین پر سو سے زائد کتابیں آ چکی ہیں۔ ساتھ ہی ہندوستان اور بیرون ممالک کے رسائل و جرائد میں ان کے مضامین بھی پڑھنے کو ملتے ہیں جو ان کے فعال ہونے اور وسیع مطالعہ کا ثبوط فراہم کرتے ہیں۔

'تنقید و تفہیم' میں ڈاکٹر مناظر نے الگ الگ اوقات میں لکھے گئے اہم مضامین کو اکٹھا کر دیا ہے۔ کتاب میں شامل مضامین کچھ اس طرح ہیں: اردو اکیسویں صدی کے پیش منظر میں، اکیسویں صدی میں اردو تنقید، اردو املا کا غلط استعمال: اکیسویں صدی کا چیلنج، ادب کے حوالے سے ہم جنس پرستی: اکیسویں صدی کے تناظر میں، باہر کی بستیوں میں اردو رسم الخط کے مسائل، ثقافت اور تہذیب کی تفہیم، پابند نظم میں ہیئتی تجربے، اردو میں طنز و مزاح نگاری، اردو ادب اور قومی یک جہتی، آزادی کے بعد (ڈراما کے حوالے سے)، اردو افسانے میں عصری حسیت، اکیسویں صدی کے تناظر میں میر کی مثنویاں، ذوق اور غالب کے قصیدے کی انفرادیت، ابوالکلام آزاد اور تقسیم ہند کا کرب، 'آگ کا دریا' میں قرۃ العین حیدر کی تخلیقیت شناسی، گوپی چند نارنگ اور اکریوین اور اکریواں کی وضاحت، وزیر آغا: مصنف، متن اور قاری کا رشتہ، تنقید کا نیا منظر نامہ اور نظام صدیقی، مجاز کی شاعری میں امکانات کی نئی اپج، 'گیتانجلی' کا ایک اور منظوم اردو ترجمہ وغیرہ کتاب کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

کتاب کا ہر مضمون اپنے موضوع کا حق ادا کرتا ہے اور ان کے وسیع مطالعے کا ثبوط فراہم کرتا ہے۔ کتاب میں شامل 'ذوق اور غالب کے قصیدے کی انفرادیت' مضمون پڑھنے کے بعد ذوق اور غالب کے کلام کی کئی پرتیں کھل کر سامنے آتی ہیں جو عموماً قاری کی دسترس سے باہر کی چیز ہے۔ لیکن اس مضمون کو پڑھ کر وہ تمام تفہیم آسان ہو جاتی ہے جو کبھی کبھار ہم سمجھ نہیں پاتے۔ اسی طرح ایک مضمون 'اکیسویں صدی کے تناظر میں میر کی مثنویاں' کو پڑھنے کے بعد میر کی تخلیقی صلاحیت اور مصنف کی شدھ بد اور کلام میر کو دور حاظر کے تمام تر واقعات و حادثات سے جوڑ کر دیکھنے کا جو اچھوتا انداز مصنف نے دلیلوں کے ساتھ پیش کیا ہے وہ قابل داد بھی ہے اور لائق ستائش بھی ہے۔ کچھ مضامین ایسے بھی پڑھنے کو ملتے ہیں جن میں کئی محققوں، ادیبوں، ناقدوں اور دانشوروں کے خیالات نقل کیے گئے ہیں اس سے مصنف کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ ہر مضمون اپنی جگہ اپنے موضوع کا مکمل احاطہ کرتا ہے اور قاری کو آسان اور سلیس زبان میں وہ ساری Information فراہم کرتا ہے جو ریسرچ اسکالر کو اپنی تحقیق کے دوران اور طلبہ و طالبات کو امتحان کے درمیان میں کام آتیں ہیں۔ موصوف نے اپنی بساط بھر کچھ تحقیقی معلومات بھی پیش کی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ کتاب میں پروف ریڈنگ کی غلطیاں نہ کے برابر ہیں۔ زبان آسان اور انداز تحریر ایسی ہے جو لوگوں کو آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔ اپنی باتوں کو سمجھانے اور قاری تک پہنچانے کے لیے کنجلک اور مشکل طریقے نہ کے برابر استعمال میں لائے گئے ہیں۔ کتاب کی قیمت بھی کم ہے اور کاغذ بھی اچھا لگایا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ہر خاص و عام کے لیے ممد و معاون ثابت ہوگی۔

جدید شاعری کے ارتقا میں غیر مسلم شعرا کا حصہ

مصنف: ڈاکٹر یوسف صابر

صفحات: 204، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: عکس ادب پبلی کیشن، اورنگ آباد

مبصر: ڈاکٹر معصوم شرقی، آر ایل بی لین 743194، (شمالی کولکاتا)

ڈاکٹر یوسف صابر اردو زبان و ادب کے بے لوث خادم ہیں۔ وہ ایک بالغ نظر محقق اور شاعر و ادیب کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ پیش نظر کتاب مقالۂ تحقیقی ہے، جس پر ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد (مہاراشٹر) نے مصنف کو پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی ہے۔ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں 'پس منظر' کے تحت اردو زبان کا آغاز و ارتقا اور اس کے پس منظر میں اردو شاعری کے ارتقائی مراحل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تمام غیر مسلم شعرا کا تعارف اور ان کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے نیز غیر مسلم صوفیوں اور سنتوں کی شاعری کا تذکرہ مع نمونہ کلام شامل ہے۔

باب دوم میں جدید شاعری کے آغاز پر اظہار خیال کے ساتھ غیر مسلم شعرا کا ذکر، 1857 کے دور کی سیاسی صورت حال اور انجمن پنجاب کی تحریک سے وابستہ غیر مسلم شعراء، جدید نظم نگاری کی ابتدا اور اسے فروغ دینے والے غیر مسلم شعرا کا کلام مع تعارف پیش کیا گیا ہے۔

باب سوم میں آزادی سے قبل غیر مسلم شعرا کے احوال، ان کی شاعری بالخصوص حب الوطنی شاعری، نیچرل شاعری، سیاسی اور تاریخی شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے۔ باب چہارم میں ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اس تحریک میں غیر مسلم شعرا نے بھی حصہ لیا تھا۔ اس تحریک سے وابستہ غیر مسلم شعرا کے کلام کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

باب پنجم میں اردو ادب میں رومانوی ادب کی تاریخ بڑے خوبصورت انداز میں حوالے کے ساتھ پیش کی گئی ہے اور اردو کے غیر مسلم رومانوی شعرا کی سخن گوئی کا ذکر مع نمونہ کلام شامل ہے۔ رومانیت پسند منتخب اہم مسلم شعرا کی فہرست کے ساتھ رومانوی شاعری کے منتخب غیر مسلم اہم شعرا کی فہرست میں چکبست، فراق، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، آنند نرائن ملا، پریم وار برٹنی، گوپی ناتھ امن اور بی ایس جین جوہر شامل ہیں۔ شعرا کے کلام کا تجزیہ اور مختصر انتخاب کلام بھی ہے۔ نظموں کا انتخاب قابل داد ہے۔ فاضل محقق نے آنند نرائن ملا کی مقبول نظم 'ٹھنڈی کافی' اور پریم وار برٹنی کی نظم 'تم نے لکھا ہے' کو شامل انتخاب کر کے بڑا اچھا کام کیا ہے۔

باب ششم میں بڑے سلیقے سے آزادی کے بعد غیر مسلم شعرا کا تعارف اور ان کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کا ماحصل یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی آبیاری میں مسلم شعرا کے ساتھ ساتھ غیر مسلم شعرا نے بھی شانہ بہ شانہ حصہ لیا ہے۔ اسے اردو کے غیر مسلم شعرا کا خوبصورت انتخاب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر یوسف صابر نے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

سفر خامہ

مرتب: شاہدالاسلام
صفحات: 196، قیمت: 140 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
مبصر: ڈاکٹر آصف، شعبۂ اردو، گوتم بدھ یونیورسٹی، گریٹر نوئیڈا، یوپی

شاہدالاسلام کی حیثیت بطور صحافی مسلم ہے۔ ان کی صحافتی زندگی دو دہائیوں پر محیط ہے، تقریباً ایک دہائی سے ہندستان ایکسپریس کی ادارتی ذمے داری بحسن خوبی نبھا رہے ہیں۔ پیش نظر کتاب 'سفر خامہ' شاہدالاسلام کی اولین کوشش ہے جس میں فاضل مرتب کی صحافیانہ بصیرت سے قطع نظر ان کی سخن فہمی اور تنقیدی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، اور موضوع کتاب ارشد کمال کے شعری وجدان اور نثری کمالات کا فنی تجزیہ بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ حقانی القاسمی نے مرتب کتاب اور موضوع کتاب کا محاکمہ کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات نکالی ہے وہ لکھتے ہیں۔ سفر خامہ کی خوبی یہ ہے کہ اس سے تفاوت عمر کے باوجود دو ادبی شخصیتوں کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ جہاں موضوع کتاب ارشد کمال کے شعری و نثری امتیازات سے آشنائی ہوتی ہے وہیں مرتب کتاب شاہدالاسلام کی تنقید سے آشنائی کی صورت بھی نکل آتی ہے زیر نظر کتاب ایک ایسے ادیب کی شعری و نثری کاوشوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش ہے، جن کی ادبی دانشوری کو گوشہ نشینی کی نذر ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ارشد کمال کا شعری وجدان روایتی نہیں ہے وہ حدیث لب و رخسار کے بجائے عصری حسیت کو شعری پیکر دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں کے الفاظ و تراکیب کا در و بست بہت رچا اور گٹھا ہوا ہے۔ کلاسیکی و روایتی لفظیات کو جدید معنیاتی پیکر عطا کرنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔ شاعری کے ساتھ اردو نثر سے بھی شغف ہے۔ افسانے میں بھی طبع آزمائی کی، تنقیدی مضامین و فکائی کالم لکھے جس کے مزاح کی نشتریت آج بھی قارئین کو گدگداتی ہے۔

زیر مطالعہ کتاب ارشد کمال کے تب و تاب سخن کا آئینہ ہے۔ جن کے شعری محاسن کے امتیازی وصف پر فاضل مضمون نگاروں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے ان کے شعری تصورات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کڑی کا پہلا مضمون 'فرحت بخش نمی کا احساس' نورالہدیٰ کا ہے اس مضمون میں انھوں نے ارشد کمال کے شعری منطقے کو دریافت کیا اور یہ کہنے کی جرأت کی کہ ارشد کمال کی شاعری کا اساسی موضوع آج کا تنہا آدمی ہے، جو دنیا کے ہنگاموں میں اپنی ذات، اپنی خودی سے الگ نوحہ خواں ہے۔ جہاں سماجی ہم رنگی نے اپنے معنی کھو دیے ہیں اخلاقی و روایتی قدریں ٹوٹ پھوٹ چکی ہیں۔ 'معنویت کی تہہ در تہہ شعلگی میں' عشرت ظفر نے ارشد کمال کی شاعری کی معنیاتی و استعاراتی جہات کی پرتیں کھولیں ہیں۔ 'فصیل ذہن' سے 'شہر دل' تک کا شعری سفر میں پروفیسر قمر جہاں نے ارشد کمال کے شعری موضوعات کا محاکمہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عصر حاضر کا انسان میٹروپولیٹن شہروں کی ذہنی کوفت اور بے چینی سے اوب گیا ہے وہ اس حبس اور فضائی گھٹن میں کچھ لمحہ شہر وقت سے باہر قیام کرنا چاہتا ہے۔ فنی اعتبار سے ارشد کمال اپنے اظہار کی ترسیل کے لیے کلاسیکی لفظیات کو نئے معنیاتی ابعاد سے آشنا کرتے ہیں جوان کے شعری مزاج کا آئینہ دار ہے۔ 'ارشد کمال کی نوائے سخن' سعید اختر اعظمی نے ارشد کمال کے تخلیق پرور ذہن سے گفتگو کی ہے۔ رمز و کنائے کے انداز میں فاضل مضمون نگار نے ان کے شعری لفظیات و موضوعات کو زیر بحث بنایا کہ ارشد کا شعری نظام فطرت میں وقوع پذیر ہونے والے فینومینن کا حوالہ ہے۔ 'ٹھاٹھ کی شاعری' میں مزاح نگار یوسف ناظم نے ارشد کمال کی شاعری کا اجمالی طور پر جائزہ لیا اور اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ ارشد کمال کا تخلیقی وژن جامعیت و مقصدیت کا حامل ہے۔ 'ایک بامعنی شعری تصنیف' میں مقبول شاعر عبدالاحد ساز نے ارشد کمال کے شعری مجموعے 'دھوپ کے پودے' پر تبصراتی انداز بیان میں کہا کہ ان کی غزلوں میں عصری سماج کی ژولیدگی اور الجھنوں کے ساتھ سیاسی کنائے کا اظہار بھرپور ہے۔ 'ایک فطری شاعر کا کلام' میں عالم خورشید نے ارشد کمال کے شعری اظہار سے بحث کی ہے کہ اس تیز رفتار دنیا میں انسان خود سے بھی بے خبر ہے۔ 'تفکر کی آنچ نے تخلیقی جوہر کو نکھارا ہے' اس مضمون میں منظر اعجاز نے ارشد کمال کی شاعری کو کھوئے ہوئے کی آرزوؤں کی تلاش پر مبنی بتایا، اور شاعر ایسے امکانات اور سنگ کیمیا کی جستجو میں سرگرداں ہے جو عظمت انسان کو پھر سے بحال کردے۔

انتخاب کلام میں مرتب کتاب نے موضوع کتاب کی بیس غزلوں اور چھ نظموں کو منتخب کیا ہے۔ یہ مختصر انتخاب ارشد کمال کی تخلیقی کائنات کا بھرپور عکاس و نمائندہ ہے۔ کیونکہ ارشد کمال کی شاعری حدیث دلبراں کی محض داستان نہیں ہے بلکہ غم روزگار کا المیہ بھی ہے۔ ارشد کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بنتے بگڑتے شہری نظام زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری اس کا بین ثبوت ہیں۔ جن میں قصہ شجر سایہ دار کا، خدشہ، دھوپ چھاؤں کے درمیان، ٹریجڈی قابل ذکر ہیں۔

فاضل مرتب نے اپنے موضوع کے شعری محاسن کے ساتھ نثر کے فنی کمالات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ارشد کمال کی کالم نویسی کی فنی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ فوری اور بے ساختہ تحریر کا نتیجہ ہیں، لیکن ارشد نے اپنی بے باکی اور بے خوفی کی بنا پر فن کالم نگاری کو اوج کمال بخشا اور خواب غفلت میں پڑی ہوئی اردو صحافت کو توانائی و تقویت بہم پہنچائی۔ افسانہ 'سیاہی و سفیدی' میں ارشد کمال خود کردار کی حیثیت سے اپنے کو پیش کرتے ہیں۔ کرپشن کے اس چکرویو میں کیسے ایک ایمان دار آفیسر وکٹم بنتا ہے یہ پورا افسانہ ایسے ہی آنکھوں دیکھے کھیل پر مبنی ہے۔ افسانے کی قرأت کہانی کو حقیقت سے قریب تر کرتی ہے۔ ارشد نے جعفر ساہنی کی نظمیہ شاعری پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ جعفر نے اپنی شاعری کے لیے سطحی اور ہنگامی موضوعات سے دامن بچایا ہے اور تخلیق میں قابل لحاظ تنوع پیدا کرنے کے لیے نت نئے پیرایہ اظہار وضع کیے تاکہ قاری کے لیے اکتاہٹ اور گرانی کا سبب نہ بنے۔ ظفر گورکھپوری کی تخلیقی کائنات کو قاری کے لیے فرحت بخش اور سکون قلب کا سامان بتایا۔ ظفر گورکھپوری کا یہ کمال ہے کہ تصنع سے پاک غیر رسمی اور گھریلو شعری آہنگ کو اظہار کے پیراہن میں سمو کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس بے ساختگی سے ذی حس قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

زیر نظر کتاب میں فاضل مرتب نے بڑی لگن سے ارشد کمال کی شعری و نثری خدمات کا تنقیدی محاکمہ کیا ہے۔ مرتب نے موضوع کتاب پر دو مضامیں لکھے ایک 'روداد سفر' کے عنوان سے جس میں انھوں نے ارشد کمال کے شعری و نثری امتیازات کو معروضیت کے ساتھ قارئین کے حوالے کر دیا۔ دوسرا مضمون 'ارشد کمال کی کالم نویسی' ہے جس میں مرتب نے ارشد کمال کی کالم نگاری کا تجزیہ کیا ہے۔ آخر میں حقانی القاسمی کے اس اقتباس پر اپنی بات ختم کروں گا کیونکہ اس کے بعد کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔
''شاہدالاسلام نے ایک گوشہ نشیں فن کار کے شخصی اور تخلیقی ابعاد سے قارئین کو روبرو کرانے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ یہ کتاب صرف قرطاس تحسین نہیں ہے بلکہ ارشد کمال کے حوالے سے حاشیائی فن کاروں کے حق میں حرف احتجاج بھی ہے۔''

شیرازۂ افکار

مصنفہ: تمنا شاہین

صفحات: 168، قیمت: 150 روپے

ناشر: ایم آر پبلی کیشنز، کوچہ چالان، دہلی

مبصرہ: ڈاکٹر زیبا ناز، نئی بستی، باڑہ شاہ صفا، مرادآباد 244001

مواد کے اعتبار سے کتاب کا عنوان 'شیرازۂ افکار' بہت موزوں ہے۔ کیونکہ کتاب متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین متعدد سمیناروں میں پڑھے اور رسائل میں شائع کرائے جا چکے ہیں۔ مع کتابیات کل 168 صفحات پر مشتمل پندرہ مضامین کی یہ کتاب دیدہ زیب اور طباعت کے اعتبار سے بہترین ہے۔

پیشِ نظر کتاب میں 'بنارس: ماضی وحال کے آئینے میں (سیاسی وسماجی منظر نامہ) ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری، تحقیق اور اس کی اہمیت، شعرا۔ علامہ اقبال، ٹیگور اور اقبال کا تقابلی مطالعہ، فیض، مجاز، سعید فریدی، بختیار نواز وغیرہ کے فن اور رجحان پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ علاوہ ازیں کرشن چندر، انور سجاد (گائے) یعقوب یاور (دل من: ایک المیہ) رحمٰن عباس اور نسیم بن آسی وغیرہ کے علاوہ حنیف نقوی (محقق) کے متعلق تمنا شاہین نے اپنے ذاتی مشاہدات وتجربات پر مبنی ایک جامع مضمون بھی شاملِ کتاب کیا یہ مضمون حنیف صاحب کی شخصیت سے وابستہ ہے۔ کتابوں سے مواد ماخوذ نہیں کیا گیا اور نہ ہی کوئی دیگر بات کہی گئی ہے۔

سرزمینِ بنارس اپنی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات کی بنا پر ممتاز مقام رکھتی ہے۔ یہاں کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ بنارس کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کو پیش کرنے کے لیے تمنا شاہین نے بہت پر مغز مقالہ رقم کیا ہے۔ یہ بہت محنت اور تحقیق کا غماز ہے۔ بنارس کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری پر قلمبند کیے گئے مضمون میں ڈرامہ کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ڈراموں کی اہم خصوصیات سے روشناس کرایا گیا ہے۔

'علامہ اقبال کا اصلاحی نقطۂ نظر'، 'ٹیگور اور اقبال کا تقابلی مطالعہ' مضامین میں ان کے گہرے مطالعے اور علم وادب سے لگاؤ کی نشاندہی ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے ہندوستانیوں میں جذبۂ ایثار ومحبت پیدا کرنے انھیں قعرِ مذلت سے باہر لانے غفلت اور زبوں حالی کو دور کرنے کی کوشش کی تو ٹیگور نے بھی اپنے علم وکمالات کو ہندوستان والوں کے نام وقف کر دیا تھا۔ یہ دونوں ہم عہد باکمال فنکار مادرِ ہند کے ایسے جیالے تھے جن کی رگوں میں دوڑنے والا خون اور احساس کی نبضیں اپنے ہم وطنوں کے نام تھیں۔ لہٰذا دونوں کا تقابلی مطالعہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ ایک جانب اقبال ہندوواسیوں کو ذمے داری کا احساس دلاتے غفلت اور پستی سے نکالنے کی کوشش کرتے تو دوسری جانب ٹیگور لوگوں میں عشق کا عرفان پیدا کر کے انھیں جینے کا حوصلہ عطا کرتے۔ تمنا شاہین نے دونوں کے فکر وفن پر بہت خوب اظہارِ خیال کیا ہے۔

'فیض کی ترقی پسندی' عنوان کے تحت ان کی مختصر مگر جامع سوانح عمری کے ساتھ ماضی حال اور مستقبل کا بہترین تصور پیش کیا ہے۔

انور سجاد کی علامتی افسانہ نگاری اپنے فن کے تئیں گہرائی وگیرائی کے ساتھ تجربات ومشاہدات کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ افسانہ 'گائے' میں گائے کو مختلف علامتوں کے تحت پیش کیا ہے۔ تمنا شاہین بہترین ماہرِ نفسیات بھی ہیں انھوں نے افسانے کے ہر امکانی پہلو، معنی ومفاہیم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

آج کے قلم کاروں میں جو بے باکی، آزادی اور بلا تامل اپنے جذبات کو برہنگی کے ساتھ بیابن کردینے کا جو مذاق عام ہو رہا ہے اس نے ادب کی پاکیزگی کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔ تمنا شاہین نے باوقار اور تہذیب کے پاسدار ادب کی حمایت کرتے ہوئے یعقوب یاور کے اندازِ بیان کو سراہا ہے۔

'دل من' میں یعقوب یاور نے عورتوں کی نفسیات کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ یہ پورا ناول صنفِ نازک کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ مرد کردار بھی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں پلاٹ اور زبان وبیان کے لحاظ سے بھی یہ ایک کامیاب ناول ہے۔ رحمٰن عباس کی ناول نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے جرأت مندانہ اندازِ تحریر اور ہمت وحوصلے کی ستائش کی ہے۔

تمنا شاہین کا طرزِ تحریر عمدہ ہے۔ اندازِ بیان بہت سنجیدہ اور پر وقار ہے۔ الفاظ کے استعمال میں ایک قسم کا سلیقہ اور ربط ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کسی بھی شخص کے متعلق مبالغہ آرائی یا ہتک آمیز انداز اختیار نہیں کیا۔ ان تمام مضامین سے مذکورہ ادبی ہستیوں کا تمنا شاہین کی نظر میں کیا مقام ومرتبہ ہے۔ اس سے آگاہی کے لیے مختصر مگر جامع ان مضامین کا مطالعہ ضروری ہے۔ اپنی افادیت اور دیدہ زیبی کے پیشِ نظر اس تصنیف وترتیب کو یقیناً ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوگی۔

فکشن

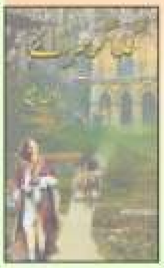

گداگر سرائے

مصنف: انیس رفیع

صفحات: 286، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: جمال اختر، D 238، چوتھی منزل، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی 25

گداگر سرائے انیس رفیع کے افسانوی مجموعے کا نام ہے جو حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے اس نام سے مجموعے میں ایک افسانہ بھی شامل ہے۔ انیس رفیع ادبی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں اس سے پہلے ان کے دو افسانوی مجموعے 'اب وہ اترنے والا ہے' اور 'کرفیو سخت ہے' شائع ہو کر ادبی دنیا میں قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ انیس رفیع معاشرتی محرومیوں اور ناکامیوں کو اشاروں اور علامتوں میں جذب کرنے کے ہنر سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان کے افسانوں میں جمعیت اور فرد کا معاشرے سے برتاؤ بطور خاص منعکس ہوتا ہے۔ انھوں نے ترقی پسندوں کی یک رخی حقیقت نگاری سے پرہیز کیا ہے تو جدیدیت کی ابہام پسندی اور تجریدیت سے بھی ممکن حد تک دامن بچایا ہے بلکہ عصر حاضر کے سیاسی اور سماجی نظام کو تہہ در تہہ سمجھنے اور جدید فنی لوازم کے ساتھ حاصل شدہ بصیرت کو قاری تک پہنچانے کا جتن کیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے تمثیلوں، تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کو اس طرح برتا ہے کہ وہ فن کار کی ذہنی اپج معلوم نہ ہوں بلکہ فن پارے ہی سے نکل کر اور باہم مربوط ہو کر ایک وحدت تشکیل دیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'گداگر سرائے' میں کل 28 افسانے شامل ہیں جن کو مصنف نے اس اعلان کے ساتھ کہ ''یہ افسانے ترسیل کی ناکامی، علامتوں کا زوال، تجریدیت، لایعنیت، مابعد جدیدیت کی تھیوریز پر بحث ومباحثے سے گذرتے ہوئے گداگر سرائے تک آپہنچے ہیں'' مجموعے کا پہلا افسانہ 'الہ دین لیپ اور عطر کی پھُئی' ہے۔ جس میں گاؤں اور شہر کی زندگیوں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ آج گاؤں چھوڑ کر شہروں میں رہنے والا مزدور اور عام انسان خوشی کے موقعوں پر کن حالات سے دوچار ہوتا ہے اس کے کرب کو پیش

کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج جب کہ انسانی زندگی کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے اس حد تک جوڑ دیا گیا ہے کہ ہم ان کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرتے ہیں۔ انسانی زندگی میں سائنس اور انٹرنیٹ کے حد سے زیادہ استعمال سے نئی نسل پر جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں ان کی طرف توجہ دلانے کے لیے ایک افسانہ 'ڈیجیٹل لائف' ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک نوعمر بچہ کس طرح اپنے والدین اور مہمانوں سے بیزار ہو کر ویڈیو گیم میں محو رہتا ہے یہاں تک کہ اسے کھانے پینے تک کا احساس نہیں رہتا۔ 'گداگر سرائے' اس مجموعے کا بہترین افسانہ ہے جس میں دور حاضر کے ایک اہم مسئلے یعنی بازاریت اور صارفیت کی آگ میں غریبوں اور مزدوروں کو کس طرح جھونکا جا رہا ہے اسے تمثیلی پیرائے میں بیان کرنے کی بخوبی کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستان ایک کثیر الجہت ملک ہے اور اس کی خوبی بھی یہی ہے کہ یہ کثرت میں وحدت کا بہترین نمونہ پیش کرتا آیا ہے۔ اس کے مختلف خطوں میں مختلف رنگ و نسل اور زبان بولنے والے لوگ بستے ہیں اور ان کے رسم و رواج بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ انھیں رسموں میں بعض ایسی رسمیں ہیں جنھیں ایک خطے میں معیوب سمجھا جاتا ہے تو دوسری جگہوں پر ان کو سماج کا ایک اہم حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ انیس رفیع نے اپنے افسانہ 'لا ہے لا ہے رفتہ رفتہ' میں ایک رسم 'بیہو ناچ' کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ تمثیلی پیرایۂ بیان کی جہاں اور ساری خوبیاں ہیں وہیں اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے مصنف قابل گرفت باتوں کو بھی بآسانی کہہ جاتا ہے اور اس پر کوئی آنچ بھی نہیں آتی۔ 'دوسرا علی بابا' اس مجموعے کا ایک ایسا افسانہ ہے جسے سیدھے لفظوں میں پیش کیا جاتا تو شاید یہ افسانہ بھی اس فہرست میں شامل ہو جاتا جن کے مصنفین پر مقدمے درج کیے گئے۔ بھگ جگنی، بوتلیں، قبائلی، ایک سنا ہوا واقعہ، افسانوں میں معاشرتی زندگی کے تضادات اور ناہمواریوں کو اپنی فکر کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ان میں موجودہ معاشی اور سیاسی نظام کی خباثتوں پر گہرا طنز بھی شامل ہے۔ 'مورکھ کالیداس' اس مجموعے کے بہترین افسانوں میں سے ہے جس میں موجودہ ادبی دنیا میں فن کاروں کا مشہور ہونے کا لالچ انھیں کن کن ہتھکنڈوں کو اپنانے پر مجبور کر رہا ہے اس کو دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے، بہت پہلے جاوید دانش نے اپنے ڈرامہ 'بڑا شاعر چھوٹا آدمی' میں اسی موضوع کو بخوبی پیش کیا تھا۔ کہا لیک جھونے، پوتول دی، معزول، اب یہاں گدھ نہیں اترتے، ہائی وے، مسٹر ڈاگ، لوہے کی مٹھی، مولا دادا آئیں گے، شہر گل، شاہ دروازہ، ان تمام افسانوں میں تشبیہی اور تمثیلی اسلوب کی انفرادیت اور انسانی وجود کو لاحق بہت سے سنجیدہ اور پیچیدہ سوالات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو زیر تبصرہ کتاب 'گداگر سرائے' اردو افسانے میں قابل قدر اضافہ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کرے گی اور شائقین اسے خرید کر اپنی لائبریریوں کو زینت بخشیں گے۔ دیگر کتابوں کی طرح اس میں بھی پروف ریڈنگ کی ہلکی پھلکی غلطیاں ہیں جنھیں ہم اس کی خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے درگذر کر سکتے ہیں۔

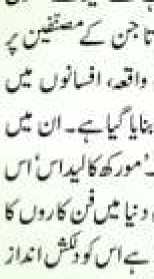

تخم خون (ناول)

مصنف: صغیر رحمانی

صفحات: 352، قیمت: 300، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصرہ: رئیس فاطمہ، شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

ایک زمانہ تھا جب پریم چند اور ان کے معاصرین نے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ ادب کو عوام کی آواز بننا چاہیے۔ ان بے آواز لوگوں کی آواز بننا چاہیے جن کی آوازیں ان کی بے حسی اور ان پر ہوئے مظالم کے درمیان دب کر رہ گئی ہیں۔ انھوں نے ایسے موضوعات کو ادب میں شامل کیا جن کے ذریعے غریبوں اور کمزور لوگوں کی دبی دبی چیخیں اور فریاد لوگوں کے گوش گذار ہو جائیں۔ وقت گزرتا رہا، ادب بھی مختلف رجحانات و نظریات سے روبرو ہوتا رہا لیکن یہ موضوعات ہمیشہ زیر بحث رہے۔

صغیر رحمانی کا ناول 'تخم خون' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ البتہ ایک منفرد انداز بیان کے ساتھ صغیر رحمانی کا یہ پہلا ناول ہے لیکن یہ ان کی پہلی تصنیف نہیں ہے انھوں نے اس سے قبل پانچ افسانوی مجموعے ہندی/اردو میں قلمبند کیے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ 'پرانے گھر کا چاند' (ہندی) 2000 میں منظر عام پر آیا پھر کے بعد دیگرے 'اشیش' (ہندی)، واپسی سے پہلے (اردو)، جہاد (اردو)، داڑھی (اردو) مشرف بہ اشاعت ہوئے ہیں۔ ناول 'تخم خون' میں سامنتوں کے خلاف اگروادیوں (دہشت گرد) کا مورچہ اور ان کے درمیان چمارٹولی کا تباہ ہونا۔ ایک کمزور کو مہرہ بنا کر اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا، یہ تمام چیزیں کہانی میں ایک عجیب سی کشمکش پیدا کر دیتی ہیں ساتھ ہی اس بات کی بھی نشان دہی کرتی ہیں کہ وقت کوئی بھی ہو اور حالات کیسے بھی ہوں بالآخر غریب طبقے کو ہی نشانہ بنایا جاتا ہے۔

ناول کا بنیادی موضوع 'دلت' ہے۔ اس ناول میں دلت ڈسکورس اور نکسل تحریک، معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے اسباب پر عصری حسیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کہانی بہار کے ایک ایسے گاؤں کی ہے جو اکیسویں صدی میں بھی جاگیردار طبقے (سامنتوں) کے مظالم کا شکار ہے۔ اس ناول میں مختلف طبقات کو پیش کیا گیا ہے۔ جن میں خاص چمار اور دسادھ ٹولی اور بھمن گاواں خاص ہیں۔

مصنف نے شیڈیول کاسٹ رزرویشن کے متعلق بھی کہانی میں ذکر کیا ہے ساتھ ہی یہ بھی دکھایا ہے کہ کیسے اس کا فائدہ پنڈت کا ناتیواری اٹھاتے ہیں۔ کہانی میں دو طبقہ ہے ایک خود کو مالک سمجھتا ہے تو دوسرا غلام، مالک طبقے کو اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ ان کے غلاموں کی کیا صورت حال ہے نہ ہی غلاموں کو کوئی فرق پڑتا ہے کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ مالک کو یہ حق ہے کہ چاہے ان کا استحصال کرے یا ان پر ظلم کرے۔ البتہ کچھ افراد ایسے ہیں جو آواز اٹھاتے ہیں لیکن ان کی آوازوں کا انجام پورے چمارٹولے کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ان چند افراد کی بغاوت ایک تحریک کی صورت اختیار کرتی ہے۔ البتہ 'بلاتی' جو کہانی کا مرکزی کردار ہے ایک سالم ذہن کی مالک ہے نہ اس میں غلامی کی بے حسی ہے اور نہ ہی وہ باغی ہے۔ مگر بہت ہی باحوصلہ ہے جو اپنی ہمت اور سمجھداری سے چمارٹولے کی مدد کرتی ہے اور ہر ممکنہ کوشش تک اپنے لوگوں کی حفاظت کرتی ہے۔

جہاں تک بات کردار کی ہے تو مصنف نے پورا انصاف کیا ہے۔ ان کی زبان ان کی فکر کی ہو بہو عکاسی کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نفسیاتی بیان اور دروں بینی پر مصنف کو عبور ہے۔ کہانی پڑھنے پر گاؤں کی پوری سماجیات آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ بہار کا گاؤں اور وہاں کے لوگ، ان میں طبقاتی فرق اور ان کے درمیان زبان کی تفریق اور پھر مختلف چیزوں کے علاقائی نام یہ تمام چیزیں مصنف کی باریک بینی کا پتہ دیتی ہیں ساتھ ہی کہانی کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہیں۔

اس طرح اس ناول میں ایک مخصوص علاقے میں جو طبقاتی آویزش ہے اس پر بھر پور روشنی پڑتی ہے بہت پہلے ہندی میں فنیشور ناتھ رینو کا ناول 'میلا آنچل' اس طرح کی

تصویر کشی کا ایک اچھا نمونہ بن کر مشعل راہ ثابت ہوا تھا۔

یہ ناول بھی اسی سمت میں ایک اچھا قدم ہے اور بہار کے دیہات کے طبقاتی نظام کی اچھی تصویر کشی کرتا ہے۔ ایک عام قاری جو بہار کے گاؤں کی زندگی سے متعارف نہیں ہے وہ اس ناول کے ذریعے باخبر تو ہوتا ہی ہے اسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ آزادی ملنے کے انہتر برس بعد بھی غریب اسی طرح غریب ہے اور امیر اسی طرح امیر، طبقاتی کشمکش آج بھی جاری ہے اور اقبال کا یہ شعر جتنا آج سے نوے برس پہلے درست تھا آج بھی ہے:

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم گر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ابلاغیات

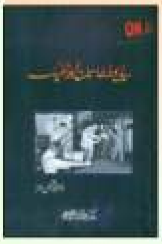

ریڈیوڈراما: تاریخ اور تکنیک

مرتب: ڈاکٹر محمد شکیل اختر
صفحات: 248، قیمت: 300 روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر شبیر عالم، ستیوتی کالج، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'ریڈیو ڈراما: تاریخ اور تکنیک' میں ڈاکٹر محمد شکیل نے ریڈیو ڈراما کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کتاب اس موضوع پر متعدد گراں قدر مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین کے انتخاب میں یہ بات ملحوظ خاطر رکھی گئی ہے کہ ریڈیو ڈراما کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ ہو جائے۔ خود مرتب نے کئی ایک اپنے مضامین کتاب میں شامل کیے ہیں تاکہ موضوع کے اہم حصے تشنہ نہ رہ جائیں۔ کتاب کا مقدمہ اپنے آپ میں ریڈیو ڈراما کے حوالے سے بڑا جامع اور اہم ہے۔ اس میں مرتب نے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مختصر مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ مقدمہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ریڈیو ڈراما سے متعلق مرتب کی معلومات وسیع ہے اور نظر گہری ہے۔ مقدمہ میں ریڈیو ڈراما کی تاریخ پر تو نظر ڈالی ہی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ اس کے فن اور تکنیک سے بھی بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کے مابین فرق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

مقدمہ اور کتاب میں شامل مختلف مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ریڈیو ڈراما مستقل ایک فن ہے اور اس میں بڑی گہرائیاں ہیں۔ بقول مرتب: 'ریڈیو نشریات کی تاریخ میں ریڈیو اصناف کا الگ الگ جائزہ یا تجزیہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔'

اردو میں 'ریڈیو ڈراما' کے حوالے سے یہ کتاب گراں قدر بھی ہے، منفرد بھی اور اہمیت کی حامل بھی۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے بڑی مفید ہے جو 'ریڈیو ڈراما' لکھنے اور پیش کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس کے مطالعے کے بعد وہ ریڈیو ڈراما کی تکنیک سے بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ سامعین کے لیے بھی پیش نظر کتاب فائدہ سے خالی نہیں، اس لیے کہ ریڈیو ڈراما کی اہمیت، مقبولیت اور اس کی نزاکت سے آشنا ہو کر ریڈیو ڈراموں سے زیادہ لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور ڈراموں پر اپنی آزادانہ رائے پیش کر سکتے ہیں۔ کتاب پڑھنے کے بعد یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ریڈیو ڈراما بڑا مالا مال رہا ہے اور اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد شکیل اختر نے ریڈیو ڈراما کا بڑی باریکی کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور اس کے لیے ایک مستقل مضمون لکھ کر پیش نظر کتاب میں شامل کیا ہے۔ ان کا مضمون 'ریڈیو ڈراما پروڈکشن' بھی کافی معلوماتی ہے۔ ریڈیائی ڈراما کی تکنیک سے بحث ریوتی سرن شرما نے اپنے مضمون 'ریڈیائی ڈراما اور اس کی تکنیک' میں بڑی تفصیل کے ساتھ کی ہے۔ اویس احمد ادیب کے مضمون 'ریڈیائی ڈراما کا گہرا فنی جائزہ' فنی نقطۂ نظر سے اہم ہے۔ اردو ریڈیائی ڈراما کے حوالے سے احمد جلیس اور اقبال مجید کے مضامین بڑے معلوماتی ہیں۔ عمیق حنفی کا مضمون 'تمثیل بردوش فضا' ایک اچھا اور منفرد انداز کا مضمون ہے۔ میرزا ادیب کا مضمون 'پاکستان میں ریڈیو ڈراما' پاکستان کے ریڈیائی ڈراموں کی صورت حال کو اجاگر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہاں ریڈیائی ڈراموں کو کتنی مقبولیت حاصل ہے، اور وہاں ریڈیو ڈراما کے میدان میں کس طرح کا کام ہو رہا ہے۔ آغا ناصر کا مضمون 'ریڈیو ڈراما میں مکالمہ نگاری' اس اعتبار سے بڑا اہم ہے کہ اس میں مکالمہ نگاری کے فن سے بحث کی گئی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ریڈیائی ڈراموں میں مکالموں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ریڈیائی ڈراموں میں مرئی مناظر نہیں ہوتے۔ مکالمے سامعین کے ذہن میں مناظر پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا مکالمہ نگار کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے انداز میں مکالمے لکھیں جو سامعین کو اچھے بھی لگیں اور ان کے ذہن میں تصویر بھی بنتی چلی جائے گویا سب کچھ اس کے سامنے ہو رہا ہے۔ اس پہلو کا تفصیل کے ساتھ مرزا ظفر الحسن کا مضمون 'نشری ڈراما اور اداکاری' احاطہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سبھی مضامین اپنے اپنے اعتبار سے اہم ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اپنے موضوع پر اہم اور بڑی معلوماتی ہے، لیکن مضامین میں تکرار کھٹکتی ہے 'اردو میں ریڈیائی ڈراموں کا آغاز' اور 'ہندوستان میں اردو ریڈیو کا ارتقا' ایک ہی پہلو ہے۔ اسی طرح کی یکسانیت 'ریڈیو ڈراما اور اس کی تکنیک'، 'ریڈیو ڈرامے اور ان کا فنی تجزیہ' اور 'ریڈیو ڈرامے کا فن' میں نظر آتی ہے۔ رفعت سروش کا مضمون 'ریڈیو ڈراما ایک جائزہ' ہے۔ بالکل اسی عنوان سے ڈاکٹر شکیل اختر کا بھی مضمون ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب میں انھی باتوں کو دہرایا گیا ہے، بلکہ مضمون نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے مضامین لکھے ہیں اور عمدہ مواد پیش کیا ہے، غالباً اسی لیے مرتب نے ان مضامین کو کتاب میں شامل اشاعت کیا ہے۔ اردو زبان میں اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس طرح کی کتابیں اردو میں بہت کمیاب ہیں۔

شعری مجموعہ

سازرنگ وبو

شاعر: ارشد اعظمی
صفحات: 328، قیمت: 300 روپے
ناشر: رہبر فاؤنڈیشن خالص پور، اعظم گڑھ یوپی
مبصر: سعید اختر اعظمی

حشر سامانی کی قسم محشر کھانے لگے تو یقیناً رم آہو کی ہر گام شرمندگی لازم ہے۔ جس کے پُرنور عارض پہ خورشید قربان جائے اور چشم اسرار طلسمات کا خزینہ ہو تو پھر اس کی رفتار کا کیا عالم ہوگا۔ ارشد اعظمی اس رمز سے واقف ہیں کہ سنبل اس کی زلفوں سے سایہ مستعار لیتی ہے اور نرگس ہر لحظہ منتظر دید رہتی ہے۔ اس کے لب جاں بخش کی ندرت سے غنچوں کو تبسم ملتا ہے تو نکہت گل بھی اسی کی مرہون منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حسن کو مغرور اور عشق کو مجبور قرار دینے سے گریز نہیں کرتے۔ فوج میں ملازم ارشد اعظمی سرحدی جوانوں کو خدمت ملک و وطن پہ مہمیز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس نے تمھیں اپنی آغوش میں پروان چڑھایا ہے اُس کی عظمت پہ آنچ آئے تو کفن بردوش ہو جانا لازمی ہے۔ تصور کے دریچوں سے وادی رومان میں جھانکتے ہوئے شب کے سناٹے، موسم بہاراں کی آمد، گلوں کی رعنائی اور نشہ آمیز سرشاری انھیں جہان نو میں دھکیل دیتی ہے۔ پھر وہ ہوتے ہیں اور عالم کیف وسرور۔ عشق

کا خمار سر چڑھ کر بولے تو بھلا کون ہے جو اس کے سحر سے خود کو آزاد کرا سکتا ہے۔

'ساز رنگ و بو' ارشد اعظمی کا اولین سخن بیانیہ ہے جس میں روایتی رنگ و آہنگ اپنے تمام تر معتبر حوالوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ اشعار دیکھیے

یہ داغ داغ اجالے جو آج بکھرے ہیں　　سحر نہیں ہے یہ ظلمات کے کرشمے ہیں
یوں داستان نو کی تکمیل ہو رہی ہے　　کچھ تیرے تذکروں سے، کچھ میری داستاں سے
گوشے چمن کے اب بھی ہیں تاریکیوں میں گم　　آتی ہے چاندنی بھی جلو میں دھواں لیے
جو تو نہ آیا تو مجھ کو کوئی ملال نہیں　　ترا خیال مرے دل میں بار بار آیا
کون رسوائے زمانہ ہو محبت کرکے　　اب محبت ہوس خام تک آ پہنچی ہے

لفظوں کے تضاد سے منظر کشی سہل نہیں۔ ارشد اعظمی کا یہ تجربہ تنوع اور جہات دیگر کی آئینہ داری کرتا ہے۔

وصل کی بات اک بہانہ ہے　　ہجر ہی ہجر کا فسانہ ہے
اقرار تو ارشد انھیں کرنا ہی پڑے گا　　مایوس نہیں ہیں ابھی انکار سے ہم بھی
سوال یہ ہے کہ الفت بھی کیا ضروری ہے　　جواب یہ ہے کہ ہے، داخل نصاب تو ہے
الاماں دوپہر کی یہ گرمی　　دھوپ بھی جا کے چھاؤں میں سوئی
تذکرہ غیروں کا تھا لیکن زبان یار پر　　آج میرا نام بھی بے اختیار آ ہی گیا
حسن ہے رنگینیوں کے ایک مجموعے کا نام　　عشق تو اپنے لہو میں ڈوب کر بھی سادہ ہے

یہاں وصل و ہجر، اقرار و انکار، سوال و جواب، دھوپ چھاؤں، اپنا پرایا اور سادگی و رنگینی کا ارتباط حسن تخیل کا اظہاریہ بن گیا ہے۔ جانے کب وہ لمحہ جاں گسل آیا جب محبوب کی برہمی کا دورانیہ طویل ہو گیا۔ ایسے میں عالم یاس کا نتیجہ کچھ اس طرح سامنے آیا۔

تو ہی اس بزم میں تنہا نہ خفا ہے مجھ سے　　اب تو سایہ بھی مرا روٹھ گیا ہے مجھ سے
ہاتھ اٹھاتا ہوں تو جھک جاتے ہیں شانے میرے　　کتنا بیزار مرا دست دعا ہے مجھ سے

اندرونی خلفشار اور ہیجان میں بھی کہیں نہ کہیں اسی اکیلے پن کی کارفرمائی ہے جس کے سبب وہ ایسا سوچنے پہ مجبور ہو گئے ہیں۔ حالات حاضرہ نے اس پر سونے پہ سہاگے کا کام کیا ہے۔

دوائے دردِ دل مانگے جو کوئی　　عدم کا راستہ اس کو دکھا دو
جو کوئی زندگی کی بھیک مانگے　　کچل کر اس کی ہستی کو مٹا دو
چلا دو ہل کسی دن جا کے مظلوموں کی بستی میں　　اسے آئین کہہ دو اور دستور روا کہہ دو

یہ رویہ منفی ہے جو کسی صورت درست نہیں، حالات سے جنگ کرنا اور اسے موافق بنانا ہماری ذمے داری ہے۔ مجموعہ میں ساقط الوزن اشعار کی کثرت، جا بہ جا بحور کی بے ربطی اور بعض غزلوں کے شعروں کی یکسانیت قاری کے لیے کوفت کا سبب بن جاتی ہے۔ مجموعہ کی اشاعت سے قبل استاد سخن سے اصلاح لے لی جاتی تو یہ کتاب اور صاحب کتاب دونوں کے حق میں بہتر ہوتا۔

انشائیہ

ظرافت آمیز

مصنف: ڈاکٹر الیاس صدیقی

صفحات: 168، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ڈاکٹر شاہینہ پروین صدیقی

مبصر: بی بی شفقت آرا

FA-14/E، تھرڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'ظرافت آمیز' جو ڈاکٹر الیاس صدیقی کی تحریر کردہ ہے اس کو پڑھ کر لگتا ہے کہ اللہ تعالی نے ان کو زبردست تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ انھوں نے نہ صرف نثر میں خاک چھانی ہے بلکہ شعر میں بھی اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر الیاس صدیقی کی کتاب ظرافت آمیز میں واقعی ان کی ظرافت آشکار ہوتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں ادبی مضامین کے علاوہ مزاحیہ مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔

'ظرافت آمیز' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب میں شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ 'شکر پارے' (انتخاب) کے باب میں ایک عنوان ہے 'مچھر اردو بولتے ہیں' کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عنوان جتنا پرکشش ہے تحریر بھی اتنی ہی اچھی ہے۔ کتاب میں ہے کہ 'مچھروں کی اردو سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ایک جگہ لکھا ہے "مچھروں کے منہ سے ایسی اچھی اردو سن کر جی خوش ہو گیا۔ یہ سوچ کر سینہ فخر سے اونچا ہو گیا کہ اردو کو اس روئے زمین سے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ انسانوں میں مٹتی ہوئی زبان کو قدرت نے اب مچھروں اور مکھیوں میں پھیلانا شروع کر دیا ہے" ایسے وقت میں جب خود اہل زبان اس کی بقا کے لیے خاطر خواہ کوشش نہیں کر رہے ہیں، وہاں پر انھوں نے کس مزاحیہ انداز میں ایک مچھر اور مکھی سے اردو کی بقا اور اس کی اشاعت کی امید لگائی ہے۔ کتاب کی زبان سلیس اور سہل ہے۔ موضوعات میں بھی کافی تنوع ہے۔ انتخاب و ترتیب میں ڈاکٹر شاہینہ پروین صدیقی کی محنت جھلک رہی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ 30 پر 'میرا بھارت مہان' صفحہ 42 پر 'ہم، آپ اور کوا' اچھی تحریریں ہیں۔ 'ہم کو ان سے شفا کی ہے امید' میں بھی صاحب کتاب نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا میں صرف دو قومیں ہی پائی جاتی ہیں، ایک مریض اور دوسرا ڈاکٹر۔ انھوں نے اس عنوان سے پوری دنیا کو یہ بتا دیا کہ اگر خود کو مریض سمجھنے میں کوئی جھجک محسوس کر رہے ہیں تو خود کو کسی ماہر ڈاکٹر سے جانچ کروا لیجیے۔ یہ بھی عجب بات ہے کہ بزرگوں کی نصیحتوں میں سے ایک نصیحت یہ بھی ہے کہ "ڈاکٹروں سے کبھی دوستی نہیں کرنا چاہیے" لیکن اگر آپ قوموں کی زندگی پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے۔ یہ رشتہ اس وقت تک نہیں ٹوٹتا ہے جب تک کہ دونوں میں سے کسی ایک کا رشتہ زندگی سے نہ ٹوٹ جائے۔

زیر تبصرہ کتاب ظرافت آمیز کے مصنف ڈاکٹر الیاس صدیقی نے شکر پارے (انتخاب) کے باب میں صفحہ نمبر 156 پر 'انتقال پر مسرت' میں حقائق کو جس حسن اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ موضوعات کا تنوع ڈاکٹر الیاس صدیقی صاحب کی بصیرت اور فکر روشن کا غماز ہے۔

معلومات عامہ

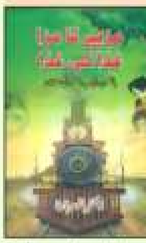

مزے کا مزا غذا کی غذا

مصنف: ڈاکٹر بانو سرتاج

صفحات: 161، قیمت: 300 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: تسنیم بانو، جی 10، ملکہ گنج دہلی 7

اردو ادب میں بانو سرتاج کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے شاعری، ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح اور مضمون نگاری وغیرہ کے میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس وقت درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ ان کی متعدد تصانیف شائع ہو کر اردو ادب میں شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ انھیں ادبی خدمات کے لیے ساہتیہ اکادمی انعام اور دیگر متعدد

انعامات سے نوازا بھی جا چکا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'مزے کا مزا غذا کی غذا' تین حصوں پر مشتمل ہے یہ کل سولہ (16) باتصویر، دلچسپ، تحقیقی اور معلوماتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلے حصے میں پانچ، دوسرے حصے میں چھ اور تیسرے حصے میں پانچ مقالے ہیں اور کتاب کے آخر میں بانو سرتاج کی مطبوعہ کتب کی فہرست بھی ہے۔

تحقیقی مقالہ 'گریٹ کارڈ: پوسٹ کارڈ' میں کارڈ کے شروعاتی سفر ہندوستان اور دنیا کے دیگر ممالک میں پوسٹ کارڈ کے ایجاد اور استعمال پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور کاغذ کے استعمال، کفایت شعاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پوسٹ کارڈ کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز معاشرے میں بیداری پیدا کرنے جیسے: منڈے میل، برتھ سرٹیفکیٹ، ٹریفک قاعدوں پر عمل، بلڈ ڈونیٹ کا پیغام، اچھی صحت اچھی زندگی کی ضمانت، بیت الخلا بنوانے پر زور اور نشے کی لت سے ہونے والے امراض وغیرہ سے متعلق پیغامات کارڈوں پر تحریر ہیں اور ان پیغامات سے وابستہ سولہ انواع کے پوسٹ کارڈوں کی تصاویر یں بھی ہیں۔ گریٹنگ کارڈ پر پیار کے پیغمبر: گریٹنگ کارڈ' عنوان سے تحقیقی اور معلوماتی مقالہ ہے اس میں گریٹنگ کارڈ کے آغاز اور عہد بہ عہد ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے شروعاتی کارڈ اور موجودہ دور کے کارڈوں کا موازنہ بھی کیا گیا ہے اور متعدد کارڈوں کی رنگین تصویریں بھی موجود ہیں۔ 'ننھا سفیر ڈاک ٹکٹ' میں ٹکٹ کی ابتدا وارتقا اور اس کی تاریخی اور سماجی اہمیت وافادیت پر تفصیل سے گفتگو کی گئی اور ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کے شوق پر ایک بہترین مقالہ 'فلیٹیلی: ڈاک جمع کرنے کا شوق' کے عنوان سے اطلاعاتی اور اہم موضوع پر بحث بھی موجود ہے کہ فلیٹیلی کی ابتدا کہاں ہوئی، ڈاک ٹکٹ کا شوق اور اس کے جمع کرنے کے مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ٹکٹ کے اقسام اور ان پر نقش تصویروں سے متعلق بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی اہم شخصیات کی سوانح اور خدمات پر مختصراً گفتگو بھی کی گئی ہے۔ Philately کے البم سے خوبصورت اور رنگین تصویریں بھی ہیں۔

حصہ دوم میں 'چھک چھک ریل گاڑی'، 'اونچا جھنڈا رہے ہمارا'، 'آہاہا آئس کریم'، 'بول ری کٹھ پتلی'، 'چلی چلی رے پتنگ' اور 'بچوں کی فیورٹ چاکلیٹ' نام کے مضامین شامل ہیں۔ مقالہ چھک چھک ریل گاڑی میں عالمی اور ملکی سطح پر ریل گاڑی کے آغاز وعہد بہ عہد تاریخی ارتقاء پر مفصل روشنی ڈالی گئی۔ ریلوے کی ڈاک اور موبائل سہولت تک کے دلچسپ سفر کا بیان بڑی خوبصورتی اور چابک دستی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ٹرین کے اقسام پسنجر، ایکسپریس، سپر فاسٹ، جنتا، دو انجنوں والی، مال گاڑی، میٹرو ریل اور کھلونا ریلوں وغیرہ کا ذکر بہت ہی تفصیل سے موجود ہے۔ نیز 38 خوبصورت انجنوں اور ریلوں کے اقسام کی تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔ 'جھنڈا اونچا رہے ہمارا' میں ہندوستانی جھنڈے کی مختلف صورتوں کو پیش کیا گیا ہے جھنڈے سے متعلق ہندوستانی آئین کے شرائط اور فرائض کا ذکر بھی ہے۔ 'آہاہا آئس کریم!' میں اس کے آغاز وارتقا پر بحث موجود ہے، اور آئس کریم نے کس طرح دیگر ممالک سے ہوتے ہوئے ہندوستان تک کا سفر طے کیا اور آئس کریم پر سدھا انوپم کی خوبصورت نظم 'آئس کریم کون کی کہانی' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ 'بول ری کٹھ پتلی!' کے ذریعے ملکی اور غیر ملکی سطح پر اس کی ابتداء وارتقاء کی تاریخ اور انواع پر نہایت تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ کون سے علاقے میں کس طرح کی کٹھ پتلی کا رواج عام تھا اور ان کا استعمال سماجی بیداری کے لیے کیسے کیا جاتا۔ 'چلی چلی رے پتنگ' میں پتنگ کی ابتدا، تاریخ اور اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور پتنگ کا سیاسی، سماجی اور سائنسی طور پر کیسے استعمال کیا جاتا ہے اس پر بھی بحث موجود ہے۔ نیز مقالہ 'بچوں کی فیورٹ، چاکلیٹ' میں اس کی ابتداء اور دلکش سفر کی روداد بیان کی گئی ہے کیسے بنتی ہے، کہاں پیدا ہوئی اور چاکلیٹ کا شہر ڈلفیا وغیرہ کا ذکر خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔

حصہ سوم میں 'رنگ نرالے سرکس کے' میں سرکس کے آغاز وارتقا، اور ملکوں ملکوں سے ہوتا ہوا ہندوستان آنے کے دلفریب اور دلکش تاریخی سفر کی کہانی پیش کی گئی ہے اور 'چھوٹی سی گڑیا کی کہانی' میں بھی گڑیا کا تاریخی پس منظر اور ان کے خوبصورت اور نہایت ہی دلفریب اقسام کو پیش کیا گیا ہے اور گڑیوں کی طرح طرح کی تصاویر بھی دیکھنے کو ملیں گی۔ اس میں شامل مقالہ 'وقت کا جہاز: گھڑی' اہمیت کا حامل ہے۔ گھڑی کا وجود کے تاریخی سفر کو دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے نیز 'دیا سلائی کہاں سے آئی؟' میں دیا سلائی کی بناوٹ اور ساخت پر تاریخی ذکر موجود ہے۔

لیکن اس تصنیف میں لغزش بھی ہے وہ یہ کہ اس میں شامل کئی مضامین کٹھ پتلی، پتنگ اور چاکلیٹ (صفحہ نمبر 100 سے لے کر 124 تک) دوبار شائع ہو گئے ہیں، اور متعدد جگہ ٹائپ کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔

بلاشبہ یہ تصنیف اردو ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اس میں شامل تصاویر بہت مشکل سے جمع کی گئی ہیں۔ یہ تصنیف اردو قارئین کے درمیان قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

سماجیات

ہندوستان میں سماجی تبدیلی اور سماجی مسائل

مصنفہ: ڈاکٹر عذرا عابدی

صفحات: 255، قیمت: 250 روپے

ناشر: آئی بی ایس بک اسٹور پرائیوٹ لمیٹڈ

مبصر: طلعت جمال

روڈ نمبر 2، گلی نمبر 4، کریم گنج، گیا (بہار)

سماجیات جیسے حساس موضوعات، ہر زمانے میں زیر بحث رہے ہیں لیکن عالم کاری کے اس دور میں اس کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے، جب پوری دنیا ایک گاؤں کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہو، جہاں سماجی مسائل اور سماجی تبدیلیاں واضح طور پر دکھائی دیتی ہوں۔ ڈاکٹر عذرا عابدی نے اردو قارئین کے لیے ہندوستان میں سماجی تبدیلی اور سماجی مسائل جیسے اہم نکات پر نہ صرف تفصیلی گفتگو کی ہے بلکہ اسے اردو میں شائع کر کے ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ سماجیات کے طلبا کے لیے یہ کتاب معاون و مددگار ثابت ہوگی۔ اس موضوع پر یوں تو انگریزی زبان میں اس موضوع پر گنی چنی کتابیں ہی ملیں گی۔

زیر تبصرہ کتاب 'ہندوستان میں سماجی تبدیلی اور سماجی مسائل' ڈاکٹر عذرا عابدی کی سماجیات پر بہترین تصنیف ہے۔ اس سے قبل ان کی مشہور زمانہ تصنیف سماج اور سماجیات 2003 میں منظر عام پر آکر شہرت حاصل کر چکی ہے۔ زیر نظر کتاب 255 صفحات اور 16 ابواب پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ ہر باب کی کئی ذیلی سرخیاں ہیں۔ اس کتاب کو منظر عام پر لانے کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ وطالبات عصر حاضر میں سماجی تبدیلی اور سماجی مسائل کی مختلف اصطلاحات کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ سماجی تبدیلی، سماجی تبدیلی کا ساختیاتی عمل، سماجی تبدیلی کا ثقافتی عمل، سماجی تبدیلی کے ریاست کا کردار، سماجی تبدیلی میں سماجی قانون سازی کا کردار، تعلیم اور سماجی تبدیلی، ترسیل عامہ اور سماجی تبدیلی، سماجی تحریکیں اور سماجی

تبدیلی، سماجی ضبط، ہندوستان میں سماجی مسائل، سماجی انحراف، ہندوستان میں جرم و تشدد اور اس کی شکلیں اور ہندوستان میں سماجی عدم مساوات اور سماجی اخراج کا مسئلہ، ہندوستان کے ثقافتی تنوع کے درپیش مسائل، عالمگیریت اور نرم کاری/ اور ماحولیات سے جڑے سماجی مسائل ہیں۔

آج کے تناظر میں ہندوستان کو جو سماجی مسائل درپیش ہیں اس پر اچھی گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً: ہندوستان میں جرم کا مسئلہ جرم کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ہر سال تقریباً سولہ لاکھ ایسے جرم کیے جاتے ہیں جو تعزیرات ہند کے تحت قابل گرفت و سزا ہوتے ہیں۔ ان جرائم میں چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، قتل، اغوا، دھوکہ دھڑی، خانگی تشدد اور مار پیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے برعکس ہر سال ہونے والے ایسے 35 لاکھ جرائم کا تخمینہ ہے جو مقامی اور خصوصی قوانین کے ذیل میں آتے ہیں۔ ان جرائم میں جوا، جہیز کا لین دین، نشہ بندی، نشیلی دواؤں کا استعمال، جسم فروشی وغیرہ شامل ہیں، جس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہیں۔

اس کتاب کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ سماجی مسائل جو عصری ہندوستان کے حوالے سے اہم ہیں، ایسے مسائل کو عام قاری تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً: ناخواندگی، بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ، بلیک منی، جسم فروشی، دہشت گردی، جہیز کا مسئلہ، شراب نوشی، غربت، بے روزگاری، بدعنوانی جیسے اہم مسائل کے اسباب و علل پر نہ صرف روشنی پڑتی ہے بلکہ اس کے تدارک پر بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب سماجی درس و تدریس کے لیے ایک اچھی کوشش ہے، جس سے نہ صرف اساتذہ بلکہ طلبہ بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں سماجی عدم مساوات اور سماجی اخراج کے کئی اہم نکات پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں عدم مساوات کے اسباب و علل کیا ہیں، جس سے جمہوری ملک کی فضا مسموم ہوتی جا رہی ہے۔

کتاب کے اخیر میں عالمگیریت اور نرم کاری کے ساتھ ساتھ ماحولیات کے بڑے مسائل اور خدشات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ایک خاص بات اس کتاب کی یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں سماجی مسائل اور اس کی صورت حال کا نہایت مبسوط جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سماجیات کے موضوع پر اردو قارئین کے لیے یہ ایک اہم کتاب ہے جس میں مصنفہ نے عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ کتاب کی قیمت مناسب رکھی گئی ہے اور ایسے طلبہ جو مسابقتی امتحان کی تیاری کر رہے ہیں ان کے لیے بھی یہ کتاب مددگار ثابت ہوگی۔

رسائل و جرائد

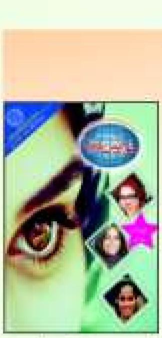

خواتین دنیا

ایڈیٹر: سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
صفحات: 64، قیمت: 10 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: مہ ناز سجاد،

عالمی یوم خواتین (8 مارچ) کی مناسبت سے قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے اپنے دیگر موقر ادبی جرائد کے ساتھ ماہنامہ 'خواتین دنیا' کا اجرا کرکے ایک بہت اہم ضرورت اور خدمت کو انجام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ خواتین کے جذبات و احساسات اور علمی و تخلیقی کاوشوں کو منظر عام پر لانے کا ایک موزوں اور مناسب پلیٹ فارم ثابت ہوگا۔

ہمارے عہد میں اردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں خصوصاً ہندی اور انگریزی میں خواتین کی نمائندگی کی غرض سے بے شمار رسائل و جرائد نکل رہے ہیں جو اپنی ظاہری چمک دمک اور تزئین و آرائش کے سبب دیکھنے والے کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گلیمر اور نمائش جن کے نام پر یہ رسالے اکثر گھروں میں مل رہے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک زمانے سے ہمارے ذہنوں میں عورت کا جو ایک غیر حقیقی یعنی خیالی اور رومانی بلکہ جنسی تصور بنا ہوا ہے، اس کو بدلنے میں ان رسائل کا بہت کم حصہ ہے۔ شاید ان کے مقاصد میں یہ شامل نہیں ہے کہ وہ معاشرہ عورت کی صحیح شبیہ سازی کریں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی میڈیا کے زیر اثر ہمارے رسائل و جرائد بھی عورت کے وجود کو محض جسم سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے داخلی وجود، ذہنی زندگی، روحانی اور نفسیاتی کیفیات سے بہت کم سروکار رکھتے ہیں۔ آج عورت جو بیشتر ایک جنس بازار بن چکی ہے ضرورت ہے کہ اسے اس کا صحیح، مناسب اور جائز مقام ملے۔ ہمارے مرد اساس معاشرے میں عورت نہ صرف مشرق بلکہ مغرب میں بھی ظلم و ستم کی شکار ہے۔ گرچہ مظلومیت اور استبداد کی حد تک خواتین میں ذات، نسل اور رنگ و نسل کی بنیاد پر فرق کرنا غلط ہے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم خواتین میں تعلیم کی کمی کے سبب ضعیف الاعتقادی، توہم پرستی اور احساس کمتری اتنی زیادہ ہے کہ ان پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

تمام تر صنعتی ترقی اور علمی و سائنسی فتوحات کے باوجود عورت ہر جگہ مرد کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ خود مختاریت محض ایک خوبصورت نعرہ ہے جو روح سے خالی ہونے کے سبب بے اثر ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ قدرت کے بنائے ہوئے نظام کائنات کی استواری، توازن حسن اور پائیدار کا انحصار عورت مرد کے باہمی تعاون و اشتراک اور جہد مسلسل پر ہے۔ قدرت نے دونوں میں تقریباً یکساں صلاحیتیں ودیعت کی ہیں جو مرد کی منفی فکر، جذباتی انتہاپسندی اور احساس برتری کے سبب معاشرے میں بروئے کار نہیں آ رہی ہیں، یقیناً خواتین کا بھی قصور ہے کہ وہ تابع مہمل بن کر زندہ رہنا پسند کرتی ہیں اور اپنی ہستی کا اثبات کرنے کے لیے زندگی کی راہوں میں جن شدائد سے گزرنا لازمی ہے اس سے گھبرا جاتی ہیں، شاید اپنی اسی تن آسانی کے سبب بآسانی صیدزبوں بن جانا ان کا مقدر ہو گیا ہے۔ رسالہ 'خواتین دنیا' سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں، خصوصاً اس کا اداریہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ عورت اور اس کی ہمہ جہت زندگی اور وجود کے تعلق سے مدیر کا ذہن صاف ہے، اس عزم کا بھی سراغ ملتا ہے کہ یہ رسالہ سطحی اور سرسری تحریروں کے بجائے کارآمد، سنجیدہ اور تعمیری افکار کا نمائندہ ہوگا جس میں خواتین اور ان کے بہترین اذہان اپنے مقالات و افکار اور عہد و تخلیقات سے اپنی انفرادی ہستی اور وجود کا احساس دلائیں گے اور نئے زمانے میں عورتوں کی تجارت کے ہر منصوبے کو شکست دینے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

'خواتین دنیا' کا موجودہ شمارہ اپنی ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے بھی پرکشش ہے تاہم مشمولات کے لحاظ سے اسے اپنی سمت و رفتار کا تعین سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا خصوصاً فکری مضامین چاہے طبع زاد ہوں یا ترجمہ ان کا تناسب زیادہ ہو تو بہتر ہوگا متعدد تحریریں مطالعے کی دعوت دیتی ہیں۔ خصوصاً شاعری کا حصہ جس طرح کے نمناک تخیل سے لبریز ہے، اس سے ہمارے خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ بہترین تخلیقی ذہن

کی حامل خواتین زمانے کی ستم ظریفی پر کس قدر متاسف ہیں اگر وضاحت وصراحت کے ساتھ احتجاج رقم نہیں کرسکیں تو کم از کم سخنوری کے پردے میں اپنی حالت زار یقیناً بیان کرسکتی ہیں۔

اس بروقت اور تعمیری پیش کش کے لیے کونسل اور اس کے فعال ومتحرک ڈائرکٹر کو بہت بہت مبارکباد!

مختصر تبصرے

ہوا سے کہو

شاعر: احمد عارف/صفحات: 100

ملنے کا پتہ: افسانہ منزل، سقاف روضہ بیجاپور

احمد عارف، نیا نام ہے۔ان کی آزاد نظموں کا مجموعہ بھی نئے موضوعات کو سامنے رکھ کر کی گئی تخلیق ہے۔ احمد عارف کی نظر میں یہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ میرے خیال میں لوگ افسانچے بھی اسی طرح شائع کروارہے ہیں۔ایسی نظمیں بہت کم صفحات میں شائع ہوسکتی ہیں۔شاعر کو زیادہ سے زیادہ مواد دینا چاہیے۔کم لکھنے کی بیماری عام ہوتی جارہی ہے۔پھر بھی کتاب تو پڑھی جاسکتی ہے۔آپ کو کچھ بھی مل جائے تو دوسروں کو بتائیے ہمیں بھی بتائیے۔

دائرہ

مصنف: اشراق حمزہ پوری

صفحات: 144، قیمت: 150 روپے

اشراق حمزہ پوری کی کتاب دائرہ اردو میں مختلف صنفوں میں کہی گئی ان کی منظومات کا انتخاب ہے۔ شیر گھاٹی بہت پہلے سے علم وادب کا مرکز رہا ہے۔ اسے دبستان عظیم آباد کا ہی ایک باب کہا گیا ہے۔ اشراق بھی اپنے نانا حضرت قوس حمزہ پوری کی طرح ادب میں اپنا نام کرنا چاہتے ہیں۔ اشراق کی شاعری پر گرفت بہت مضبوط ہے۔ تاریخ گوئی ایک مشکل فن ہے۔اس میں بھی انھوں نے کمال دکھائے ہیں۔ مردہ فن میں جان ڈالنے کی اہمیت ہے۔ یہ فن اب ختم ہوتا جارہا ہے۔ابھی حال ہی میں منصور عمر کا انتقال ہوا ہے،انہوں نے تاریخ گوئی میں بڑا نام کیا ہے۔

آنچ مہکتے لفظوں کی

شجاع الدین شاہد

صفحات: 304 روپے، قیمت: 200 روپے

شجاع الدین شاہد بحیثیت شاعر کافی عرصے سے جانے جاتے ہیں۔ بچوں کے لیے انھوں نے خوب لکھا ہے۔ آپ کی غزلیں نامور گلوکاروں نے گائی ہیں۔ رسالے اور اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔

آنچ مہکتے لفظوں کی ان کا تازہ مجموعہ کلام ہے۔ جھوٹی تسلیوں، لوٹی ہوئی بستی، ہجرت کا ارادہ اور سچ بولنے کی سزا وغیرہ کو دیکھنے کے بعد شاہد چپ نہیں رہتے اسے شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کی شاعری صاف ستھری ہے۔ ملمع بازی سے پرے ہے۔ بات وہ کہتے ہیں جو لوگوں کو بھی اچھی لگتی ہے۔ بدلتی دنیا کے لیے ایک شعر بہت خوب ہیں۔

زمیں سے اگنے لگیں ہیں عمارتیں اب کے
اناج اگلی صدی آسماں سے اترے گا

کہنہ مشق ہونے کا بہترین ثبوت ان کے کلام میں ہے۔ان کی شاعری میں احساس کی ندرت، جدت کی دلآویز مسکراہٹیں ہیں جو پڑھنے والے کو مسحور کردیتی ہیں۔

بے ربط سانسوں کا سفر

شاعر: نقیب اکبر

قیمت: 150 روپے

نقیب اکبر کا شمار کلکتہ کے بزرگ شعراء میں ہوتا ہے۔ جدید شاعری کے دلدادہ ہیں۔ طنزیہ لہجے میں شاعری کرتے ہیں اور اس میں نام کیا ہے جنھیں دو لفظ بولنے کا سلیقہ نہیں وہ آج محفل کے سردار بنے بیٹھے ہیں، مخجر لے کے جو لوگ آئے ان میں ان کے دوست بھی تھے۔اس طرح کی احتجاجی شاعری کرنے والے شاعر کو چین کہاں، آرام کہاں، چاروں طرف بکھرے ہوئے ایسے واقعات سے انھیں بے چینی ہوتی ہے۔اسی کو اپنی شاعری میں شامل کرتے ہیں۔ان کی شاعری کا مسلک اور مقصد حیات بھی یہی ہے اور اسی میدان کے وہ شہسوار ہیں۔ پڑھنے اور سنانے کے اشعار کافی ہیں۔شاعر نے اپنا اسلوب بنالیا ہے۔میدان شاعری میں ان کا مقام بن چکا ہے۔

پہلا سفر

شاعر: نصیر افسر

قیمت: 200 روپے

نصیر افسر کا لگاؤ اردو سے ہے۔ یہ بڑی بات ہے کیونکہ وہ اکاؤنٹس کے افسر رہ چکے ہیں۔ ہاں اس عہدے پر بڑی ایمانداری سے زندگی بسر کرنے کی وجہ سے شاعری میں بھی وہ وصف شامل ہوگیا ہے۔ اپنے بیٹوں، اپنی ماں، اپنے رشتہ داروں کے تعلقات پر ان کے کہے گئے شعر میں ایمانداری بہت ہے۔ اپنے دل میں ان کے لیے محبت رکھ کر شعر کہتے ہیں اور یہی انداز انھوں نے دنیا کو دیکھنے کیے لیے بھی رکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے شاعر کچھ کم گو ہے۔ انھیں مشق جاری رکھنی چاہیے جس سے کلام میں اور زیادہ پختگی آئے گی۔

تمنائے رب

شاعر: نصر اللہ نصر

قیمت: 130 روپے

ہم نے غزلوں کے مجموعے پڑھے ہیں۔ ایسے مجموعے خوب شائع ہوتے ہیں مگر وہ کتاب جس میں حمد ہی حمد ہو بہت کم چھپتی ہیں۔ نصر صاحب موجودہ دور کے ہونے کے باوجود اپنی شاعری کو اللہ اور ان کی خوبیوں کو بیان کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کی ہے۔ اس کام کی انھیں جزا بھی ملے گی۔ شعری دنیا میں بھی نام ہوگا۔ میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کو مختلف طریقوں سے بیان کرنے پر بھی انھوں شاعری میں کہیں بھی آنچ آنے نہیں دی۔ شاعری میں Repeatation تو ہے مگر ہر شعر میں ان کا اپنا رنگ ہے۔ تمام کلام میں عشق الٰہی کا درد چھپا ہے۔ غزل کا فارم بھی استعمال کیا ہے مگر غزل کے رنگ کو حاوی ہونے نہیں دیا ہے۔

مبصر: نسیم سحر

1008، گھری پارہ، اردو اسکول نمبر 62 کے پیچھے، بھیونڈی، تھانے

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

اردو میں قانونی اصطلاحات کی ضرورت: پروفیسر طاہر محمود

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کئی جہات پر کام کر رہی ہے جس کے نتائج بھی خوش آئند ہیں۔ قانونیات سے متعلق بھی کونسل نے کئی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ عدلیہ، پولیس محکمہ اور دیگر سرکاری اداروں میں بھلے ہی رسم الخط تو نہیں لیکن اردو زبان استعمال میں لائی جاتی ہے۔ اردو قانونی اصطلاحات نہ ہونے کے سبب دقتیں آرہی ہیں۔ ان پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے قومی اردو کونسل ایک ورکشاپ کا انعقاد کرنا چاہتی ہے تاکہ اردو قانونی اصطلاحات جلد از جلد کتابی صورت میں آسکے۔ یہ باتیں پینل کے چیئرپرسن ماہر قانون پروفیسر طاہر محمود نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ لیگل پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید جانکاری دیتے ہوئے کہا کہ گزشتہ پینل کی میٹنگ میں ہندوستان میں اردو کی دستوری اور قانونی حیثیت کے عنوان سے سیمینار کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی جس پر عمل کرتے ہوئے آئندہ ماہ دہلی میں دوروزہ قومی سیمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔ اس سے قبل کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام ممبران کا اس میٹنگ میں استقبال کیا اور میٹنگ کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس موقع پر دیگر ممبران نے بھی کئی نئی تجاویز پیش کیں جس پر غور و خوض کرنے کی بات کہی گئی۔

اس پینل کے تحت کونسل اردو زبان میں قانون اور آئین سے متعلق کتابوں کی اشاعت کرتی ہے تاکہ اردو داں حلقہ قانونی نکات اور باریکیوں سے واقف ہوسکے۔ اس موقع پر پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم کی دو اہم کتاب 'وقف قانون' اور' خواتین سے متعلق جنسی و دیگر جرائم' منظر عام پر آچکی ہیں، جبکہ خواتین کے اختیارکاری اور صنفی مساوات کو منظوری دی گئی ہے۔

قومی اردو کونسل میں لیگل پینل میٹنگ کا انعقاد

اس میٹنگ میں پروفیسر طاہر محمود کے علاوہ پروفیسر خواجہ عبدالمنتقم، جناب احتشام عابدی، ڈاکٹر افضل قادری، ڈاکٹر محمد ظفر محفوظ نعمانی، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر محمد فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محترمہ ذیشان فاطمہ اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 22 مارچ 2017

اردو میڈیم طلبہ کا بھی مستقبل روشن ہے: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دہلی: آج جنوبی ہندوستان کی بیشتر ریاستوں میں اردو میڈیم اسکول سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کی بڑی تعداد میڈیکل سائنس، انجینئرنگ، انفارمیشن ٹکنالوجی، کمپیوٹر سائنس اور سائنس کے دیگر شعبوں میں بہتر کارکردگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس لیے دوسرے اسٹریم سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اور طالبات کی طرح اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے کا بھی مستقبل روشن ہے۔ اس رجحان کو زیادہ وسعت اور فروغ دینے کے لیے قومی اردو کونسل سائنسی علوم وفنون کی کتابیں اردو قارئین کے لیے تیار کر رہی ہے، جس سے اردو میڈیم میں پڑھنے والے طلبہ و طالبات کو مزید تقویت مل سکے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت ہند NEET کے تحت ہونے والے امتحان کے لیے سوالنامہ اردو میں تیار کرانے کے حق میں ہے، جو اردو حلقے کے لیے ایک خوش آئند بات ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ زبان وادب کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ہم سائنسی علوم وفنون کو ترجیحی طور پر اپنے اشاعتی منصوبوں میں شامل کریں گے۔ کونسل پچھلے ایک سال میں سائنسی علوم سے متعلق لگ بھگ درجن بھر سے زائد کتابیں شائع کر چکی ہے۔

اس میٹنگ کی صدارت معروف سائنس داں پروفیسر احتشام حسنین (شیخ الجامعہ ہمدرد یونیورسٹی، دہلی) نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ گزشتہ ایک سال کی مدت میں اس پینل کی کارکردگی قابل ستائش رہی ہے۔ کام کرنے کی اگر یہی رفتار رہی تو کونسل اپنے اہداف کو پانے میں کامیاب رہے گی۔ انھوں نے پروفیسر ارتضیٰ کریم کی دلجمعی کے ساتھ کام کرنے کی بھرپور تعریف کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ پچھلی میٹنگ میں جو مسودے منظور کیے گئے تھے، ان میں سے تقریباً سارے مسودے اشاعت کے قریب ہیں۔ آج کی میٹنگ میں کئی نئے پروپوزل کو بھی منظوری دی گئی۔ اس موقع پر دیگر ممبران نے بھی کئی اہم مشورے دیے۔

قومی اردو کونسل میں نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ

اس میٹنگ میں ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی، ڈاکٹر رفیع الدین ناصر، ڈاکٹر شائق احمد یحییٰ، ڈاکٹر تسنیم فاطمہ، کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محترمہ ذیشان فاطمہ، شہناز اختر اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 اپریل 2017

سیمانچل میں قومی کتاب میلے کا انعقاد

کشن گنج: ریاست بہار میں دوسری مرتبہ اور سیمانچل کے علاقہ میں پہلی مرتبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا 22واں قومی کتاب میلہ آئندہ اکتوبر مہینہ میں کشن گنج میں منعقد ہوگا۔ یہ جانکاری این سی پی یو ایل کے ذمے داران توحید ایجوکیشن ٹرسٹ کے احاطے میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے دی۔ اس موقعے پر دہلی آئے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذمے داران میں ریسرچ آفیسر شہنواز محمد خرم اور این سی پی یو ایل کے تعلیمی افسر فیروز عالم کے علاوہ توحید ایجوکیشن ٹرسٹ کے چیئرمین مولانا مطیع الرحمٰن مدنی، ہیومن چین کے صدر انجینئر اسلم علیگ موجود تھے۔ کتاب میلہ کشن گنج شہر کے تاریخی میدان روئی دھاسہ میں منعقد ہوگا۔ ریسرچ آفیسر شہنواز خرم نے کہا کہ کتاب میلے میں سیمانچل کے مختلف اضلاع جیسے کشن گنج، ارریہ، پورنیہ، کٹیہا اور پڑوسی ریاست مغربی بنگال کے اتر دیناجپور ضلع کے تمام تعلیمی اداروں کو شامل کیا جائے گا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' کولکاتا، 14 اپریل 2017

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

پروفیسر خورشید فارق میموریل لیکچر

نئی دہلی: عربی زبان اپنی غیر معمولی خصوصیات کی بنیاد پر حددرجہ مقبول عام وخاص ہے، ہندوستان میں بھی اس کی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ عربی زبان و ادب کے فروغ میں ملک کے مختلف علاقوں کا بڑا نمایاں کردار ہے، ان میں سرزمین گجرات کی بھی عربی زبان و ادب میں بھی بیش بہا خدمات ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ عربی کے سابق صدر اور آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس کے صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے کیا۔ وہ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند کے مالی تعاون سے منعقدہ دسواں پروفیسر خورشید فارق میموریل لیکچر کا تعارف کرارہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ گجرات کی یونیورسٹی میں بڑودہ یونیورسٹی کے علاوہ کسی یونیورسٹی میں عربی کا شعبہ نہیں ہے، جبکہ گجرات کا ماضی عربی زبان وادب کی خدمات کے حوالے سے تابناک رہا ہے۔ اس موقعے پر جامعہ علوم القرآن جمبوسر بھروچ گجرات کے مہتمم اور رابطہ ادب اسلامی گجرات کے صدر معروف عالم دین مفتی احمد دیولوی نے نہایت پر مغز خطبہ پیش کیا۔ اپنے خطبہ میں انھوں نے گجرات کے علمائے متقدمین کی عربی زبان و ادب میں خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے موجودہ صورت حال پر بھی روشنی ڈالی۔ لیکچر کی صدارت دارالمصنفین شبلی اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے کی۔ نظامت شعبہ کے استاذ ڈاکٹر نعیم الحسن نے کی، جبکہ صدر شعبہ پروفیسر ولی اختر نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ کلمات تشکر شعبہ کے استاذ ڈاکٹر مجیب اختر نے پیش کیے۔ اس موقعے پر آل انڈیا ایسوسی ایشن عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس (رجسٹرڈ) کی جانب سے عربی زبان وادب میں بیش بہا خدمات کے اعتراف میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ہاتھوں پروفیسر

کفیل احمد قاسمی، پروفیسر عارفہ یمین، پروفیسر شفیع شیخ، پروفیسر شبیر احمد اور پروفیسر حسان خان کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

سیمنار کی افتتاحی نشست میں ڈاکٹر عبدالماجد قاضی، ڈاکٹر محمود مرزا، ڈاکٹر آفتاب احمد، ڈاکٹر غلام مرسلین، ڈاکٹر صہیب عالم اور ڈاکٹر فخر عالم نے مقالات پڑھے۔ اس نشست کی نظامت ڈاکٹر نسیم اختر نے کی جبکہ صدارت پروفیسر زبیر احمد فاروقی، پروفیسر حبیب اللہ خان اور پروفیسر علیم اشرف نے مشترکہ طور پر کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 مارچ 2017

اردو پنجابی کے لسانی وتہذیبی رشتے

نئی دہلی: دیال سنگھ ایوننگ کالج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے دو روزہ بین الاقوامی سیمنار کا آغاز ہوا۔

سیمنار کے افتتاحی جلسے کی صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی جبکہ کلیدی خطبہ پروفیسر ناشر نقوی نے پیش کیا۔ جلسے میں ایس منجیت سنگھ، صدر گرودوارا پربندھن کمیٹی مہمان خصوصی اور پروفیسر راویل سنگھ صدر شعبہ پنجابی دہلی یونیورسٹی نے مہمان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ پروفیسر ناشر نقوی نے اردو اور پنجابی کے لسانی وتہذیبی رشتوں کے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کے لسانی ارتقا اور تہذیبی تنوع میں پنجابی زبان کا اہم رول رہا ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو پنجابی کے رشتے کو مزید مستحکم کرنے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں ہمیں اردو پنجابی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے اس طرح کے مزید پروگرام منعقد کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ساجد حسین نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ پنجابی زبان کو سمجھے بغیر اردو زبان وادب کی تاریخ کو نہیں سمجھا جاسکتا۔

پہلے جلسے کی صدارت ڈاکٹر دھرم سنگھ نے کی، جبکہ مقالہ پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر ترنم ریاض، ظفر مراد آبادی، ڈاکٹر جوندر بندرا، ڈاکٹر ہرزیندر کور، ڈاکٹر افروز تاج اور ڈاکٹر محمد عبداللہ شامل تھے۔ آخری جلسے کی صدارت پروفیسر زماں آزردہ اور پروفیسر روندر روی نے کی، جبکہ ڈاکٹر ندیم احمد ندیم، ڈاکٹر کمل جیت کور، نمرتا راکیش، ڈاکٹر پرتھوی راج تھاپار اور ڈاکٹر پریا شرما نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مارچ 2017

کلیم عاجز: شخصیت اور فن پر منعقدہ سیمینار کا منظر

غالب میموریل لیکچر کا انعقاد

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں سالانہ غالب میموریل لیکچر کا انعقاد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ہوا۔ صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے مہمان خصوصی پروفیسر نریندر موہن کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ پروفیسر نریندر موہن کی شاعری، فکشن تنقید اور ڈرامانگاری خاص میدان ہے، یہ ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ پروفیسر نریندر موہن نے اردو اور ہندی کہانیوں پر تقسیم ہند کے اثرات کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ تقسیم اور آزادی دونوں ایک ہی دن ملے تھے، یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آزادی کے جشن کے ساتھ ساتھ تقسیم کا دکھ درد بھی جھیلنا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ تقسیم پر متعدد کہانیاں لکھی گئیں۔ تقسیم ہند پر صرف منٹو کی 18 کہانیاں ہیں۔ منٹو کی تقسیم ہند سے متعلق کہانیاں عالمی تاریخی کہانیوں میں نمایاں اور اہم مقام رکھتی ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ، یزید، کھول دو اور ٹیٹوال کا کتا کا خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے انھوں نے منٹو کے دکھ اور اس وقت کے خونچکاں حالات کا ذکر کیا۔ کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی اور اشفاق احمد وغیرہ کی کہانیوں پر انھوں نے مختصر طور پر روشنی ڈالی اور ہندی کہانیوں پر تقسیم ہند کے اثرات کو مفصل طور پر بیان کیا۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر موہن نے کہا کہ سب سے پہلے ضروری ہے کہ جو نفرت ہمارے درمیان پیدا ہوگئی ہے اسے دور کیا جائے اور بھائی چارہ اور محبت و اخوت کو عام کیا جائے، جب ہی ہم ایک خوش حال اور ترقی پسند ملک کی تعمیر میں اپنا رول ادا کرسکتے ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر فاروق بخشی نے مختصر طور پر تقسیم ہند کے بعد جس طرح کا ماحول دونوں ممالک میں پیدا ہوا یا پیدا کیا گیا اس کو بیان کیا۔ نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 مارچ 2017

دولت رام کالج میں کل ہند مشاعرہ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور پوئٹری سوسائٹی کے مشترکہ تعاون سے دولت رام کالج دہلی یونیورسٹی کے سد بھاؤنا آڈیٹوریم میں ایک عظیم الشان کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر وسیم بریلوی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رحمان مصور نے انجام دیے۔ ابوظہبی سے معروف شاعر ظہورالاسلام جاوید نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ کالج کی پرنسپل ڈاکٹر سویتا رائے نے تمام مہمانان کا استقبال گل پوشی سے کیا۔ اس موقعے پر سویتا رائے نے کہا کہ اس کالج میں شعبہ اردو نہیں ہے لیکن ہمیں اردو زبان سے محبت ہے اسی لیے ہم نے مشاعرے کا انعقاد کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان اور شاعری دلوں کو جوڑنے اور آپسی بھائی چارے کو فروغ دینے کا کام کرتی ہے۔ یہ زبان صحیح معنوں میں گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے۔ ہمارے یہاں پہلی بار مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے مجھے امید ہے کہ اس مشاعرے سے ایک نئی روایت کی شروعات ہوگی۔ مشاعرہ کنوینر ڈاکٹر جیوتی شرما نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس طرح کے مشاعرے ہر سال اسی جوش وخروش کے ساتھ منعقد کیے جائیں۔ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم کا بھی شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے مشاعرے کے لیے مالی تعاون دے کر حوصلہ افزائی کی۔ جن شعرا نے مشاعرے میں شرکت کی ان کے نام حسب ذیل ہیں: پروفیسر وسیم بریلوی، ظہورالاسلام جاوید، ملک زادہ جاوید، شعیب رضا فاطمی، تنویر غازی، ممبئی، احمد علوی، اکمل بلرام پوری، نشتر امروہوی، ڈاکٹر رحمان مصور، اسلم راشد، انور کمال مدھوبنی، چاندنی شبنم، خوشبو سکینہ سوہنل۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 26 مارچ 2017

اردو صحافت کی موجودہ صورتِ حال

رامپور: کیئر ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے اشتراک سے یک روزہ اردو سیمینار بعنوان 'اردو صحافت کی موجودہ صورت حال' منعقد کیا گیا، جس کی صدارت ڈاکٹر حسن احمد نظامی سابق چیئرمین فخرالدین علی احمد کمیٹی حکومت اتر پردیش نے کی جبکہ مہمان خصوصی سینئر صحافی معصوم مرادآبادی ایڈیٹر روزنامہ جدید خبر تھے۔ مہمانان ذی وقار کے طور پر ثروت عثمانی ڈائرکٹر آکاشوانی رامپور، پرویز کامل ماحی نمائندہ راشٹریہ سہارا، محمد زبیر شمسی صدر گلوبل ویلفیئر سوسائٹی، اسرار احمد منیجر سمبائیوسس پبلک اسکول نے شرکت کی۔ افتتاحی خطبہ ڈاکٹر احمد قریشی نے پیش کیا۔ مہمان خصوصی معصوم مرادآبادی نے اپنے خطاب میں کہا کہ صحافت کے معیار کو کم کرنے میں ہم اپنا قصور مانتے ہیں کیونکہ ہم اردو زبان کے ساتھ وہ حق ادا نہیں کرسکے جو ہمیں پوری ایمانداری اور اخلاقیات کے ساتھ ادا کرنا چاہیے تھا۔ انھوں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اترپردیش میں ایک بھی اردو میڈیم اسکول نہیں ہے جبکہ مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور کیرالہ میں اردو میڈیم اسکولوں کی بڑی تعداد ہے۔ صحافی پرویز کامل ماحی نے صاف طور پر کہا کہ اردو کو ترقی دیے بغیر اردو صحافت کی موجودہ صورت حال پر تبصرہ کرنا بیکار ہے۔ اس موقعے پر محمد فرقان سنبھلی، ڈاکٹر اطہر مسعود خاں، ثروت عثمانی، ڈاکٹر سمیع الدین خاں، سید سہیل میاں، ڈاکٹر آصف علی، آنسہ فرح شبیر، مظاہر حسین، عابدہ صدیقی، غزالہ بی اور ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے مقالات پیش کیے۔ صدارتی خطبہ میں ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و ادب حکومت ہند کی ستائش کی۔ سیمینار کے کنوینر فیصل شاہ خاں نے تمام مہمانان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 مارچ 2017

کلیم عاجز: شخصیت اور فن

پٹنه: ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کی زندگی میں جو تڑپ، درد، کڑھن اور خلش ہے وہ پیغمبروں والی صفت ہے، انھوں نے اپنے طریقۂ زندگی اور شعر وسخن کے ذریعہ ملک وملت کی فکری آبیاری کی، وہ اپنے کلام اور طرز سخن کی وجہ سے کبھی بھلائے نہیں جائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار ندوۃ العلما لکھنؤ کے شعبۂ عربی کے صدر مولانا نذر الحفیظ ندوی نے کی وہ اردو اکادمی میں النور سوشل کیئر فاؤنڈیشن لکھنؤ کے زیر اہتمام اور اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے یک روزہ سیمینار بعنوان 'کلیم احمد عاجز شخصیت اور فن' کی صدارت کررہے تھے

انھوں نے کہا کہ کلیم عاجز کی شاعری میں جو درد و غم اور سوز و گداز پایا جاتا ہے وہ کہیں دوسری جگہ نہیں ملتا۔ مولانا شاہ تقی الدین فردوسی ندوی نے کلیم عاجز سے اپنے خاندانی مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ جتنے عظیم شاعر تھے اتنے ہی عظیم انسان بھی تھے۔

اس سے قبل النور سوشل کیئر فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری مولانا نجیب الرحمٰن ململی ندوی نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ کلیم احمد عاجز ایک عظیم اور باکمال شخصیت کے مالک تھے۔ اس موقعے پر امتیاز احمد کریمی ڈائریکٹر اردو ڈائریکٹوریٹ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ کلیم عاجز آسمان شعر و سخن کے ماہتاب تھے، وہ شعلہ کو پھول میں لپیٹ کر پیش کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کے کلام میں میر کا انداز ضرور پایا جاتا ہے لیکن میر کی پیروی نہیں ہے۔ مشتاق احمد نوری سکریٹری بہار اردو اکادمی پٹنہ نے کہا کہ کلیم عاجز ایک بیباک اور صداقت پسند شاعر تھے۔ ڈاکٹر کلیم عاجز کے فرزند اور ماہر امراض قلب ڈاکٹر وسیم احمد صاحب نے اس موقعے پر اپنے والد صاحب کی گھریلو اور خاندانی زندگی پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔

افتتاحی سیشن کے بعد مقالے کا سیشن شروع ہوا جس میں تقریباً ایک درجن مقالے پڑھے گئے اور کلیم عاجز کی شخصیت اور فکر و فن کے حوالے سے مختلف جہتوں سے روشنی ڈالی گئی۔ افتتاحی سیشن کی نظامت مولانا سرور عالم ندوی نے کی جبکہ تکنیکی سیشن کی نظامت نورالسلام ندوی نے انجام دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 مارچ 2017

قدیم عربی شاعری میں غزل المذکر

لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شعبہ عربی، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ نے 'محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی میموریل لیکچر سیریز' کے تحت دوسرے توسیعی خطبہ کا انعقاد کیا جس میں عربی زبان و ادب کے عالمی شہرت یافتہ اسکالر اور متعدد ایوارڈ یافتہ شیخ نذر الحفیظ ازہری، عمید

کلیۃ اللغۃ العربیہ، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے طلبا کو 'قدیم عربی شاعری میں غزل المذکر' کے عنوان سے خطاب کیا۔ خطبہ میں شیخ نے قدیم عربی شاعری کی ادبی اور فنی خصوصیات اور اس کے موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ عالم عربی کا معاشرہ چوتھی صدی ہجری میں تہذیب و تمدن اور ثقافت کے اعتبار سے بڑا ترقی یافتہ تھا مصر، شام اور عراق سے لے کر اسپین تک عربی شاعری کا ہر طرف چرچا تھا۔ اس دور کے ایک عربی ادیب و مورخ ابو منصور ثعالبی (متوفی 429 ہجری) نے پانچ سو سے زائد عرب ادبا و شعرا کے شاعری کے نمونے اپنی بے نظیر کتاب 'یتیمۃ الدہر' میں پیش کیے اور ادبی و فنی اعتبار سے ان کے بارے میں اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے۔ شیخ نے اپنے لیکچر میں اردو شعرا کے کلام کی روشنی میں معاشرہ کی خوبیوں اور خامیوں کو بھی اجاگر کیا۔ ثعالبی نے ان شعرا کے جو نمونے پیش کیے ہیں ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل المذکر کو عام طور پر عربی شاعری میں جگہ دی گئی تھی۔ بویہی اور سلجوقی سلطنتوں کے قیام نے اس موضوع کو اور زیادہ پھیلانے میں مدد دی۔ عزالدولہ اور عضد الدولہ کے درمیان حسین غلاموں کے سلسلے میں جو معرکہ آرائی ہوئی اس سے سبھی واقف ہیں۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے رجسٹرار ایس کے شکلا اور ڈپٹی رجسٹرار ڈاکٹر بھاؤنا مشرا بھی موجود تھے۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ عربی پروفیسر مسعود عالم فلاحی نے کی اور نظامت سمیہ نوراللہ (ایم اے عربی) نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مارچ 2017

جاں نثار اختر کی رومانی اور انقلابی شاعری

لکھنؤ: جاں نثار اختر نے شاعری کو زندگی بنا کر گزارا اور

پیش کیا وہی اجنبیت، وہی نرمی، وہی معصومانہ حیرت۔ وہ نہ اپنی ذہانت کو نیلام کرنے پر راضی ہوئے، نہ علم کو بوجھ بنانے پر آمادہ ہو سکے اور احساس کے ایک چبھتے ہوئے نشتر کو زندگی بھر گلے لگائے رہنے کے سبب وہ سوائے اپنے اس بے نام درد کے دنیا کی کسی اور سامان راحت کو خاطر میں نہ لائے۔ ان خیالات کا اظہار ووکیشنل انڈسٹریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، لکھنؤ کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'جاں نثار اختر کی رومانی اور انقلابی شاعری' کے موضوع پر جے شنکر پرساد ہال، قیصر باغ پر منعقد سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے پدم شری پروفیسر آصفہ زمانی نے کیا۔

سیمینار کی ابتدا میں مہمانوں کا استقبال سوسائٹی کے جنرل سکریٹری عبدالنعیم نے کیا اور نہایت تفصیل کے ساتھ سوسائٹی کے اغراض و مقاصد پیش کیے اور استقبالیہ خطبہ بھی پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ڈاکٹر مسیح الدین خاں نے انجام دی۔ مہمان خصوصی رضوان احمد (سابق ڈی جی پی) نے جاں نثار اختر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں انھیں ترقی پسند تحریک کی سب سے قد آور شخصیت سمجھتا ہوں، کیونکہ ترقی پسندی کے بنیادی عناصر کے تقاضے غزل پوری نہیں کر سکتی تھی، اس کے لیے نظم کی وسعت چاہیے تھی اور اختر کی گرفت نظم پر بہت مضبوط تھی۔

دیگر مہمان ذی وقار قاضی احمد رضا، خزانچی انٹیگرل یونیورسٹی، نعمان اعظمی، چودھری آل عمر قریشی اور رفیع احمد نے بالترتیب جاں نثار اختر کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اختر کی خدمات اردو شاعری کے حوالے سے ترقی پسند تحریک اور اردو ادب کے لیے بے پناہ ہیں جس کا اندازہ ان کی کلیات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اختر کی شاعری کو مرثیے کی رزمیہ کی بازگشت سے تعبیر کیا۔ ضیاء اللہ صدیقی نے کہا کہ ان کی غزلوں میں ایک مقدس کرب ہے جو خوابوں کو پلکوں پر سجانے کے لیے بے چین ہے کیونکہ ان کے بغیر زندگی ادھوری ہے وہ ان خوابوں کو نشہ آور دوا کے طور پر استعمال نہیں کرتے لیکن وہ مانتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی ساری رنگینی، ساری سرمستی اور جنوں تو انھی خوابوں کے دم سے ہے۔ اس کے علاوہ صحافی غفران نسیم، ڈاکٹر مجاہد الاسلام، ڈاکٹر غفران ساجد نے اپنے اپنے پرمغز مقالے پیش کیے۔ آخر میں مہمانان کرام کا شکریہ سوسائٹی کے سکریٹری اور کنوینر پروگرام عبدالنعیم نے ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 مارچ 2017

قومی کونسل و بزم صدف انٹرنیشنل کے اشتراک سے قومی سمینار

کولکاتا: اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے اپنی مٹھاس

سے دنیا کے لوگوں کو اپنا اسیر بنایا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج نہ صرف ایشیائی ملکوں بلکہ دنیا بھر میں اردو زبان کو فروغ مل رہا ہے اور ایسے لوگ اس زبان کو سیکھ رہے ہیں جن کا اس زبان سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ اسی مقبولیت کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو تحریک کو بین الاقوامی سطح پر آگے لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔

کولکاتا کی عالیہ یونیورسٹی میں قومی کونسل و بزم صدف انٹرنیشنل کے اشتراک سے منعقد سیمینار میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے یہ باتیں کہیں۔ حکومت ہند کے ماتحت کام کر رہے محکمہ نے اردو کے فروغ کے لیے بین الاقوامی سطح پر کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جس کے تحت کونسل اپنے پروگراموں میں ہندوستان کے علاوہ غیرملکی ادیبوں کو مدعو کر رہی ہے تاکہ دنیا میں ہو رہے اردو کاز کو اردو داں طبقے کے سامنے لایا جاسکے۔ قومی کونسل کے مطابق ملکی و غیرملکی اردو ادیبوں کو ساتھ لانے کی کوشش نے اردو کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ قومی کونسل کو امریکہ، کناڈا، برطانیہ و یو اے ای سے بھی اردو کانفرنس کے انعقاد کی درخواست کی گئی ہے۔ اردو ادب کے فروغ کے لیے کونسل کے تحت ہو رہے کاموں کو اہم بتاتے ہوئے ارتضی کریم نے اردو ادیبوں وطلبا کو سنجیدگی سے کام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے اردو داں طبقے میں بے روزگاری کے لیے اردو کو ذمہ دار بتائے جانے کے بجائے اپنے کاموں کو سنجیدہ بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔

قومی کونسل کے پروگرام میں مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر کی جانب سے اردو سیکھنے کے بیان کو اہم بتاتے ہوئے پروفیسر ارتضی کریم نے ان شخصیتوں کی جانب سے زبان سیکھنے کی خواہش کو اہم بتایا۔ ان کے مطابق اردو زبان سیکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے لیے کونسل نے مخصوص کلاس شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کے مطابق زبان سیکھنے کی کوشش اس زبان کے تئیں پھیلی غلط فہمیوں کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 30 مارچ 2017

سائنسی علوم و تکنالوجی کے ہند-فارسی ماخذ

حیدرآباد: ہندوستان کے طول و عرض میں فارسی علوم کی زبان رہی ہے۔ اس میں بطور خاص طب، نجوم، نباتیات، حیوانیات اور ان جیسے موضوعات کے ساتھ ساتھ بے شمار ریونیو ریکارڈس بھی ملتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز اسکالر پروفیسر چندر شیکھر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی نے کیا۔ وہ شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے منعقدہ سہ روزہ بین الاقوامی سمینار 'سائنسی علوم و تکنالوجی کے ہند-فارسی ماخذ (دکن کے فارسی ادب کے خصوصی حوالے سے)' میں کلیدی خطبہ دے رہے تھے۔ ڈاکٹر شکیل احمد، پرو وائس چانسلر نے صدارت کی۔ پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ پروفیسر عرفان حبیب کے اٹلس (Atlas) میں ریونیو کے نقطۂ نظر سے مختلف علاقوں کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ان فصلوں میں اضافہ کرنے کے طریقے، آفات سماوی، کیڑوں، چڑیوں وغیرہ سے ہونے والے نقصان اور ان سے محفوظ رہنے کے طریقوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مغلوں کے دور میں شیرازی حکما نے ابو سینا کی القانون اور عربی میں موجود طب اسلامی پر توجہ دی اور اپنے تجربوں کی روشنی میں انھیں آگے بڑھایا۔ طب شفاع محمود اور دیگر کتب میں فریزو اور دیگر اسکالرس نے اسے نوٹ کیا ہے۔ پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ بیاض خوشبوئی جس کا نسخہ برٹش لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں مختلف عطروں کی تیاری کے طریقے درج ہیں۔ قیمتی پتھروں جیسے زمرد، یاقوت، مروارید، لعل وغیرہ کا ذکر جواہر ہمایونی اور دوسری کتابوں میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد، پرووائس چانسلر نے صدارتی خطاب میں کہا کہ فارسی ابتدا ہی سے علوم کی زبان رہی ہے۔ اس میں مختلف زبانوں سے کیے گئے ترجمے افراط میں ملتے ہیں۔ ہندوستان میں بطور خاص سنسکرت میں موجود کتابوں کے فارسی ترجمے کیے گئے۔ پدم شری پروفیسر محمد عبدالوحید، سابق ڈائرکٹر، سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، حیدرآباد نے اپنے خطاب میں کہا کہ 1724 سے 1824 تک کے دور میں تقریباً ایک کروڑ نسخے ملتے ہیں جو روزمرہ کی زندگی، سائنس، تکنالوجی اور دیگر موضوعات پر لکھے گئے۔ انھوں نے بطور خاص ابن بیطار کی ادویہ سازی اور اس پر اس کی تحقیق پر توجہ دلائی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 22 مارچ 2017

اردو زبان و ادب کے فروغ میں روہیل کھنڈ کا کردار

بجنور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے معروف سماجی تنظیم الخدمت سوسائٹی بجنور کے زیر اہتمام یک روزہ سمینار کا انعقاد بعنوان 'اردو زبان و ادب کے فروغ میں روہیلکھنڈ کا کردار' نئی بستی واقع وردھمان منڈپ میں کیا گیا جس میں کئی معروف محققین نے اپنے مقالے پیش کیے۔ معروف اردو شاعر و ادیب شکیل بجنوری کی صدارت اور انگلش لیکچرار آصف غیور کی نظامت میں منعقدہ سمینار کا افتتاح شکیل بجنوری، بزرگ شاعر بینا بجنوری، ڈاکٹر دوشی بھاردواج اور شام نامہ چنگاری کے ایڈیٹر ڈاکٹر سوریہ منی رگھونشی نے مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے کیا۔ ڈاکٹر سوریہ منی رگھونشی نے اپنے خطاب میں ہندی، اردو کو دو حقیقی بہنیں بتاتے ہوئے تمام زبانوں کا احترام کرنے پر زور دیا۔ پروگرام کے مشیر قاری عبدالحنان نے زبان اردو کی شیرینی سے متعلق کئی دلچسپ مثالیں پیش کیں۔ اس موقعے پر سول بار ایسوسی ایشن کے صدر خورشید محسن زیدی، ڈاکٹر داؤد ملتانی اور ماسٹر سعادت حسین وغیرہ نے اردو کے ارتقا سے متعلق کئی مفید مشوروں سے نوازا۔ سمینار میں ڈاکٹر ظل ہما، ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ، ڈاکٹر سبطین سیدہ، ڈاکٹر پرویز عادل ماحی و ڈاکٹر شیخ نگینوی، ڈاکٹر شاداب تبسم وغیرہ نے مقالے پڑھے۔ الخدمت سوسائٹی کی صدر سیما صدیقی اور سکریٹری حنا صدیقی نے تمام مہمانوں کا استقبال اور شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مارچ 2017

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

ملک میں اعلیٰ تعلیم اور اسکول کی تعلیمی سطح کو بہتر بنانے کے لیے وسیع تبدیلی کی جائے گی: جاوڈیکر

نئی دھلی: فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر پرکاش جاوڈیکر نے کہا کہ حکومت ملک میں اعلیٰ تعلیم کے

ساتھ ساتھ اسکول کی تعلیمی سطح کو بہتر بنانے کے لیے بھی بڑے پیمانے پر اقدامات کر رہی ہے۔ مسٹر جاوڈیکر نے لوک سبھا میں نیشنل ٹیکنالوجی، سائنس تعلیم اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (ترمیمی) بل پر بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جب تک اسکول کی تعلیم کی سطح میں بہتری نہیں آئے گی تب تک کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تحقیق و ریسرچ کو بہتر نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت ملک میں تعلیم کو معیار پر مشتمل، تحقیق اور روزگار سے جوڑنے والا بنانے کی سمت میں آگے بڑھ رہی ہے۔ تعلیمی اداروں میں تحقیق اور ریسرچ کو فروغ دینے کے لیے فنڈز کی کمی نہیں ہونے دی جائے گی۔ اس کے لیے قومی فائننگ اسکیم کا آغاز کیا گیا ہے۔ تحقیق اور ریسرچ کے لیے 20 ہزار کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں۔ مسٹر جاوڈیکر کے جواب کے بعد ایوان میں آندھرا پردیش کے تروپتی اور اڑیسہ کے بھرام پور واقع انڈین انسٹی ٹیوٹ آف شوگر کین ریسرچ (آئی آئی ایس آر) کو قومی سطح کا درجہ دینے والے اس بل کو صوتی ووٹوں سے منظور کرلیا گیا۔

مسٹر جاوڈیکر نے کہا کہ مودی حکومت نے اپنی تین سال کی مدت میں بنیادی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک کے تعلیمی اداروں کو فروغ دینے کے لیے متعدد کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ حکومت نے اس دوران دو آئی آئی ایس آر، چھ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (آئی آئی ٹی)، سات انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ (آئی آئی ایم) بنائے ہیں۔ اس کے علاوہ چھ نئے نوودے اسکول اور 104 کیندریہ ودیالیہ (کے وی) بھی بنائے گئے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 مارچ 2017

میڈیکل انٹرنس امتحان اب اردو میں بھی!

نئی دھلی: امیدوار اب آئندہ سال سے میڈیکل انٹرنس امتحان این ای ای ٹی (نیٹ) اردو میں بھی دے سکتے ہیں۔ سپریم کورٹ نے اس معاملے پر سماعت کرتے ہوئے مرکز اور سی بی ایس ای کو اردو کو شامل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگرچہ سی بی ایس ای اور مرکزی حکومت نے سماعت کے دوران صاف کردیا کہ انھیں اردو کو شامل کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس بار نیٹ میں اردو کو شامل نہیں کیا جاسکتا۔ نیٹ امتحانات میں اردو شامل کیے جانے کی لڑائی لڑ رہی ایس آئی او کو اس وقت بڑی زبردست کامیابی حاصل ہوئی جب عدالت عظمیٰ نے اس کی عرضی پر فیصلہ دیتے ہوئے آئندہ سال سے نیٹ میں اردو زبان کو شامل کیے جانے کی بات کہی۔ موصولہ تفصیلات کے مطابق عدالت عظمیٰ نے اردو کو بھی نیٹ امتحانات میں شامل کیے جانے سے متعلق عرضی پر سماعت کرتے ہوئے بڑا فیصلہ دیا۔ اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈین (ایس آئی او) کے ذریعے داخل کی گئی عرضی پر جسٹس دیپک مشرا، جسٹس اے ایم خانولکر اور جسٹس ایم ایم شانتا گوڈروالی تین رکنی بینچ نے یہ فیصلہ دیا کہ آئندہ سال سے طلبہ اردو میں بھی نیٹ کے امتحانات دے سکتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اپریل 2017

دھلی:

مفت اردو کوچنگ سینٹر

نئی دھلی: معاشرے میں اردو رسم الخط کو عام کرنے اور نئی نسلوں کو اردو زبان سے منسلک کرنے کی غرض سے تہذیب ہند سوسائٹی نے پہل کرتے ہوئے گلی نمبر 8 مین روڈ نئی کردم پوری میں مفت اردو کوچنگ سینٹر کا آغاز کیا، جس کا افتتاح اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے فیتا کاٹ کر کیا۔

اس سینٹر میں اردو کی مکمل تعلیم مفت دی جائے گی، جس میں عمر کی کوئی قید نہیں ہوگی۔ سینٹر انچارج و تہذیب ہند سوسائٹی کے صدر ماسٹر نثار احمد نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ چونکہ ہمارے معاشرے سے اردو کا گراف تیزی کے ساتھ گر رہا ہے اور نوجوان طبقہ اس جانب سنجیدہ نہیں ہے جس کے لیے میں ہمیشہ فکرمند رہتا تھا آخرکار میں نے یہ عزم کیا کہ کیوں نہ اردو کا ایک سنٹر قائم کیا جائے جس کے ذریعے لوگوں میں اردو کے تئیں بیداری لائی جائے تاکہ نئی نسلوں میں اردو کا چلن عام ہو۔ ریاض احمد نے کہا کہ ہم اردو زبان کی زبوں حالی کا رونا تو روتے ہیں لیکن ترویج و اشاعت کے لیے کوئی ٹھوس لائحہ عمل تیار نہیں کرتے اور حد تو اس وقت ہوجاتی ہے کہ اردو کی روٹی کھانے والے ہی اپنے بچوں کو اردو سے دور رکھتے ہیں اس لیے ہمیں پہلے اس بیماری کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مارچ 2017

اردو صحافت: مواقع اور چیلنجز

نئی دھلی: ہندوستان میں اردو زبان اور صحافت کا مستقبل روشن ہے۔ پوری دنیا میں اردو کا ایک بڑا بازار ہے۔ دہی سے ڈھاکہ تک لوگ اپنی تہذیب اور زبان کے تحفظ کے

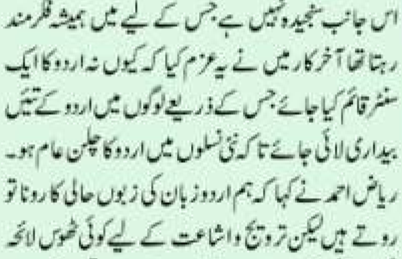

لیے کوشاں ہیں۔ گزشتہ 15-10 برسوں میں اردو اخبارات میں ایک خاص جوش وخروش دیکھنے کو مل رہا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف صحافی قربان علی نے شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے منعقد پہلا مشیر الحق میموریل لیکچر 'پروفیسر مشیر الحق حیات وخدمات' کا منظر

منعقدہ توسیعی خطبہ بعنوان 'اردو صحافت: مواقع اور چیلنجز' میں کیا۔ قربان علی نے اس بات پر زور دیا کہ اگر پروفیشنل طریقے سے کوئی اردو میڈیا ہاؤس قائم کیا جائے تو یہ مقبول ترین ثابت ہوگا جس میں تفریح کے ساتھ ہندوستانی تہذیب وثقافت کو بھرپور انداز سے پیش کیا جائے۔ اس طرح کے میڈیا ہاؤس کی اشد ضرورت ہے۔ قربان علی نے مزید کہا کہ صحافت میں بے شمار مواقع ہیں مگر ٹیلی ویژن اور ریڈیو میں تلفظ کا درست ہونا ضروری ہے۔ ہندی چینلوں اور اخبارات میں اچھے صحافیوں کی اشد ضرورت ہے۔ صدر شعبۂ تاریخ وثقافت پروفیسر رضوان قیصر نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ میں صحافت کو تاریخی تناظر اور موجودہ منظرنامے میں دیکھتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت کا زبان و ادب کے شعبوں کے ساتھ ہی تاریخ سے بھی رشتہ ہونا چاہیے اور تاریخ کے طلبا کو زبان و ادب سے واقف ہونا چاہیے۔ اردو میں تاریخ وسماجیات کی کتابیں ناپید ہوتی جارہی ہیں جو لمحۂ فکریہ ہے جو لمحۂ فکریہ ہے۔ مہمانوں کا استقبالیہ شعبہ کے صدر پروفیسر شبیر رسول نے کیا جبکہ نظامت توسیعی خطبہ کے کنوینر ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔ شرکا کا شکریہ ڈاکٹر عمران احمد نے ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 مارچ 2017

پروفیسر مشیر الحق: حیات وخدمات

نئی دهلی: ''پروفیسر مشیر الحق کی فکر و تحقیق کا اہم موضوع اسلامی فکر کی تشکیل جدید تھا۔ ان کا شمار دور جدید کے اجتہادی فکر رکھنے والے اہم مفکرین میں ہوتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر سالم قدوائی نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے منعقد 'پہلا مشیر الحق میموریل لیکچر بعنوان 'پروفیسر مشیر الحق: حیات وخدمات' میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ وہ مسلمانوں کی امتیازی شناخت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور وہ اس بات میں پختہ یقین رکھتے تھے کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے او اس کا حق روشن خیال علما کرام کو ہی ملنا چاہیے۔

پروگرام کی صدارت پروفیسر طلعت احمد، وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی کلمات میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز کو 'مشیر الحق میموریل لیکچر' کے آغاز پر مبارکباد دی اور امید ظاہر کی کہ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔ مہمان خصوصی پروفیسر فرقان قمر، سکریٹری جنرل، اے آئی یو، نے پروفیسر مشیر الحق کی بعض اہم اور نادر خوبیوں سے سامعین کو متعارف کرایا۔ پروفیسر محمد اسحٰق، صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز نے پروفیسر مشیر الحق کی علمی خدمات کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ 'شعبہ اسلامک اسٹڈیز' موصوف کی ہی زندہ یادگار ہے۔ پروگرام کے کنوینر پروفیسر اقتدار محمد خان نے پروفیسر مشیر الحق سے اپنے شاگردانہ مراسم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر محمد اسحاق، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروگرام میں پروفیسر مشیر الحق کے خانوادے کے اہم افراد کے علاوہ اسکالرز طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 مارچ 2017

طریقہ تدریس برائے اساتذہ عربی زبان

نئی دهلی: کسی زبان کی تدریس کا سب سے زیادہ موثر اور نہایت کامیاب طریقۂ تدریس وہ ہے، جس میں نطق صحیح اور مخارج حروف کے ساتھ عملی مشق بھی کرائی جائے۔ عربی زبان کی تدریس کئی پہلوؤں سے اہمیت رکھتی ہے جن میں لسانی، تہذیبی، دینی اور تعلیمی پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی، ریاض میں لسانیات کے پروفیسر ڈاکٹر مطیر بن حسین المالکی نے کیا۔ وہ شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کی جانب سے دہلی یونیورسٹی کی آرٹ فیکلٹی کے کانفرنس ہال میں 'طریقۂ تدریس برائے اساتذۂ عربی زبان' کے موضوع پر جاری سات روزہ ورکشاپ میں شریک عربی زبان کے اساتذہ سے خطاب کررہے تھے۔ ڈاکٹر مالکی نے پاور پوائنٹ پرزینٹیشن کے ذریعے عملی مشق کرائی اور عربی زبان کی صوتیات اور نطق صحیح ومخارج حروف کو سمجھاتے ہوئے طریقہ ہائے تدریس پر روشنی ڈالی۔ قابل ذکر ہے کہ اس سات روزہ ورکشاپ میں لکھنؤ یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری، گور بانگا یونیورسٹی مغربی بنگال، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جھارکھنڈ یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ وریسرچ اسکالرس نے شرکت کی۔ ورکشاپ کے کنوینر اور شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ولی اختر نے ورکشاپ کو عربی زبان کے اساتذہ کے لیے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 اپریل 2017

آندھرا پردیش

ڈراما 'چوراہا' کی پیش کش

حیدرآباد: آج کے دور میں تھیٹر نئی تبدیلیوں سے ہمکنار ہورہا ہے اور تھیٹر کا روایتی تصور اب تبدیل ہورہا ہے۔ تھیٹر اب محض بند کمرے یا آڈیٹوریم کے حصار سے نکل کر کھلے آسمان کے نیچے ہونے لگا ہے۔ پوری دنیا میں اب Space کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔ اس صورت حال میں اوپن ایئر تھیٹر ایک اہم متبادل کے طور پر ابھرا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز تھیٹر شخصیت اور فلم اداکار ایم کے رینا نے یونیورسٹی کیمپس میں حال ہی میں بنائی گئی تمثیل گاہ (Amphiteatre) کا افتتاح کرنے کے بعد 'ہماری تہذیب وثقافت اور فنون لطیفہ' کے زیر عنوان خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور دیگر ذمہ داران کو اس حسین قدری تمثیل گاہ کے لیے دلی مبارکباد دی اور کہا کہ یہاں زیادہ سے زیادہ پروگراموں کا انعقاد ہوتے رہنا چاہیے۔ وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈراما 'چوراہا' کی پر اثر پیشکش پر مرکز مطالعات اردو ثقافت کو مبارکباد دی اور کہا کہ اس ڈرامے کے مصنف اور ہدایت کار انیس اعظمی نے ایک نہایت اہم موضوع پر یہ ڈراما تحریر کیا ہے۔ انھوں نے اداکاروں کی بہترین اداکاری کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی کے ان طلبہ وطالبات نے میری توقع سے کہیں زیادہ بہتر اداکاری کے جوہر دکھائے اور ناظرین نے بھی دل کھول کر انھیں داد وتحسین سے نوازا اور اپنے باذوق ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ چالیس منٹ کے دورانیہ پر مشتمل ڈرامے 'چوراہا' پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے ہدایت کار انیس اعظمی نے بتایا کہ اس کا پلاٹ ایک جھونپڑپٹی کے گرد گھومتا ہے۔ اس جھونپڑپٹی کے درمیان ایک چوراہا ہے۔ عموماً شام کے وقت اس چوراہے پر بستی کے مکین جمع ہوتے ہیں

بیدل بین الاقوامی سمینار کا منظر

اوران کے درمیان کھٹی میٹھی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں ان اداکاروں نے اس غریب بستی کے دل کی دھڑکنوں کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی جو کھٹی، میٹھی، کڑوی، غرض انسانی زندگی کے ہر ذائقے سے بھرپور ہے۔ اس ڈرامے میں دانش اقبال، اعجاز احمد، رقیہ نبی، فرحت ثمرین، نغمہ تبسم، محمد فیصل، امان اللہ، محمد عدنان، توفیق ندیم، عالیہ کوثر، وشنو پریا، شبنم شمشاد، محمد رضوان نے اپنی اداکاری سے ناظرین کو مسحور کردیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 30 مارچ 2017

اتر پردیش:

بیدل بین الاقوامی سمینار

لکھنؤ: لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے زیر اہتمام و بیدل انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کے تعاون سے چوتھے بیدل بین الاقوامی سمینار کا انعقاد لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں کیا گیا جو ہندوستانی طرز زبان میں فارسی کے عظیم شاعر مرزا عبدالقادر بیدل اور رائے رایان آنند رام مخلص کی شاعری کے موضوع پر مبنی تھا۔ چار روزہ بین الاقوامی سمینار کا افتتاح اتر پردیش کے گورنر شری رام نائک نے کیا۔ افتتاحی خطبہ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر چندر شیکھر نے دیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر تاجکستان کے سفیر مذرو شریف جلالوف نے شرکت کی۔ مہمان ذی وقار کے طور پر افغانستان کے بھارت میں دو بار سفیر رہ چکے ڈاکٹر سید مخدوم رھین، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر خواجہ محمد شاہد اور اتر پردیش کے سابق کارگزار وزیر اعلی ڈاکٹر عمار رضوی موجود تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پرفیسر ایس پی سنگھ نے اس بین الاقوامی سمینار کی صدارت کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ارشد القادری نے کی۔ مہمانوں کو خطاب کرتے ہوئے اتر پردیش کے گورنر رام نائک نے کہا کہ زبان کا کام جوڑنے کا ہوتا ہے۔ زبان کو جوڑنے کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے انھوں نے واسدھیو کٹمبکم یانی پوری دنیا کے ایک خاندان ہونے کے احساس پر زور دیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر خواجہ محمد شاہد نے کہا کہ بیدل نے زندگی کے ہر شعبے پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ فلسفہ اور فکر کا نمونہ ہے۔ پروفیسر قمر غفار نے پروگرام کا مقصد اجاگر کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر خواجہ محمد شاہد نے کہا کہ غالب نے بھی بیدل کی عظمت کو مانا ہے۔ اتر پردیش کے سابق کارگزار وزیر اعلی ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ پروگرام میں آئے مہمانوں کے ملک افغانستان، تاجکستان اور ایران کی ثقافت، پکوان اور ادب سے ہمارے ملک کا گہرا تعلق رہا ہے۔ پروگرام میں خصوصی طور پر پروفیسر عارف ایوبی، پروفیسر قمر غفار، ڈاکٹر غلام نبی احمد، ڈاکٹر ارشد القادری، ڈاکٹر سرفراز احمد خان، ڈاکٹر مظاہرہ حسین، پروفیسر عمر کمال الدین، پروفیسر خان عاطف، پروفیسر حسن عباس، سمیت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 29 مارچ 2017

سماج کی تعمیر و تشکیل میں زبان وادب کا کردار

میرٹھ: ہر ادب خواہ کسی بھی زبان کا ہو اتحاد اور آپسی

بھائی چارے کو فروغ دیتا ہے۔ اس سمینار کا مقصد اس مشترکہ زمین کی تلاش ہے جو مختلف تہذیبوں، عقیدوں اور فرقوں کے درمیان موجود ہے۔ اس کی تلاش ملک اور انسانیت کی ترقی کے لیے ضروری ہے اور تدریسی درسگاہوں کے قیام کا اولین مقصد بھی یہی ہونا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار شیخ الجامعہ (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ) پروفیسر این کے تنیجا نے کیا۔ وہ شعبہ اردو کے ذریعہ 30-31 مارچ کو حکومت اتر پردیش کے اشتراک سے دوروزہ کثیر لسانی (اردو، ہندی، انگریزی اور سنسکرت) قومی سمینار بعنوان 'سماج کی تعمیر و تشکیل میں زبان واب کا کردار' سے بطور مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ سمینار کی افتتاحی تقریب سہ پہر شعبہ اردو کے پریم چند سمینار ہال میں منعقد ہوئی جس کی صدارت یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر این کے تنیجا نے کی۔ مہمان ذی وقار کے طور پر یونیورسٹی کی ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر وائی وملا جبکہ خصوصی مقررین کے طور پر پروفیسر خالد محمود، سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ڈاکٹر پردیپ جین، مظفر نگر (ہندی)، پروفیسر منور ماتر کھا، سابق صدر شعبہ انگریزی، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور پروفیسر سادھنا سہائے، پرنسپل، اسماعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج، (سنسکرت) نے شرکت کی۔ بعد ازاں شیخ الجامعہ نے مہمانوں کے ساتھ مل کر شمع روشن کی۔ پروفیسر وائی وملا نے کہا کہ زبان وادب کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو انسان بنانے کا کام کرتا ہے۔ پرفیسر منور ماتر کھا نے کہا کہ علوم وفنون کے ذریعے ترقی کے آسمان سر کیے جاسکتے ہیں۔ بہت سی مادی آسائشیں بھی حاصل کی جاسکتی ہیں، لیکن زبان وادب کے بغیر اتحاد اور انسانی قدریں حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ پروفیسر سادھنا سہائے نے کہا کہ سائنس کے ذریعے صرف مشینیں بنائی جاسکتی ہیں جو یقیناً انسان کے کاموں میں اس کی مدد کرسکتی ہیں، لیکن اچھا معاشرہ، اچھا سماج اور اچھا انسان بنانے کے لیے صرف زبان وادب کا مطالعہ ہی ضروری ہے۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ سماج یا معاشرہ اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ اجتماعی زندگی میں ہر فرد کو ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 اپریل 2017

مغربی اتر پردیش میں اردو فکشن نگاری

نگینہ: شہروں کی تخلیقی موت بڑا المیہ ہے۔ مادیت اور صارفیت نے ہم سے ساری تہذیبی اور اخلاقی قدریں چھین لی ہیں۔ تخلیقی سطح پر شہر مر رہے ہیں اس لیے شہروں

کی ادبی ثقافت و روایات کو زندہ رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ ان خیالات کا اظہار نامور ادیب و صحافی حقانی القاسمی نے ضلع بجنور کے نگینہ میں منعقد ایک روزہ قومی سیمینار بعنوان مغربی اتر پردیش میں اردو فکشن نگاری، کے عنوان پر خطاب کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر اردو ادب کی پانچ نامور شخصیات کو مختلف ناموں سے منسوب قومی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا جس میں پروفیسر جاوید اختر کو سرسید ایوارڈ، حقانی القاسمی کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ایوارڈ دیا گیا۔ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر پروفیسر خالد علوی نے کہا کہ افسانہ نگاری ناخن پر سورہ اخلاص لکھنے کے مانند ہے۔ فکشن نے ہمیشہ معاشرہ کو آئینہ دکھایا ہے اور اس کی اصلاح کے لیے تحریک کا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر دہلی نے خواتین فکشن نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ سماج میں فروغ پائی اصلاحی تحریکات میں خواتین فکشن نگاروں نے اپنے ناول، کہانی اور افسانے سے جو تعاون دیا اس کو سلام کیے بغیر اردو فکشن کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ بجنور اس سلسلے کا مینارہ نور ہے۔ حقانی القاسمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا جہاں تک مغربی اتر پردیش میں فکشن نگاری کا تعلق ہے اس کی عظمت کے ثبوت کے لیے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے نام ہی کافی ہیں۔ انھوں نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ آج کی نئی نسل ان دونوں بزرگوں کی تخلیقی روایت کو فروغ دینے میں سرگرم ہے جو کہ قابل ستائش ہے۔ ہمیں ان فنکاروں کی بھی قدر کرنی چاہیے۔

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ روہیل کھنڈ کا بجنور ضلع اس معنی میں اہمیت کا حامل ہے یہاں کے فکشن نگاروں سے ناول اور افسانہ کا آغاز ہوتا ہے۔ خطہ روہیل کھنڈ سے قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، سجاد حیدر یلدرم، نذر سجاد، سلطان حیدر جوش اور قاضی عبدالغفار جیسے فکشن نگار وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی صدارت اور ڈاکٹر شیخ نگینوی کی نظامت میں منعقدہ ایک روزہ قومی سیمینار میں کئی اہم مقالے پڑھے گئے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 4 اپریل 2017

منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ

بارہ بنکی: انگریزی حکومت کی پالیسیوں اور اس وقت کے سماجی حالات پر تنقید کرنے والے اخبار اودھ پنچ نے ہندوستان کی صحافت میں طنز کی مضبوط بنیاد ڈالی۔ مقررین نے ان خیالات کا اظہار رابطہ سیوا اسنستھان کے زیر اہتمام اتر پردیش اردو اکادمی کے تعاون سے منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں کیا۔ محکمہ صحت کے سبکدوش انفارمیشن افسر ڈاکٹر ایس ایم حیدر نے اس موقعے پر کہا کہ منشی سجاد حسین کے اخبار اودھ پنچ میں ہمارے معاشرے کو دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا۔ اتراکھنڈ گورنر کے سابق او ایس ڈی ٹو پریس سلمان علی خاں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اودھ پنچ نہ صرف اردو کا عظیم طنزیہ اخبار تھا بلکہ پہلی بار اردو میں مزاح کا آغاز بھی اسی اخبار سے ہوا۔ پٹیل میلا پی جی کالج کی صدر شعبہ اردو ڈاکٹر صفت الزہرہ زیدی نے اس موقعے پر کہا کہ منشی سجاد حسین نے معاشرے کی برائیوں پر بہترین انداز میں طنز کیا۔ جواہر لعل نہرو میموریل پی جی سابق صدر شعبہ اردو ڈاکٹر احسن بیگ نے اس موقعے پر کہا کہ منشی سجاد حسین نے اودھ پنچ کے لیے ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کیں جنھوں نے اردو علم اور ادب کو عرش پر پہنچایا۔ سیمینار کی نظامت مولانا اسرار وارثی نے کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 28 مارچ 2017

بہار

پٹنہ میں جشن اردو

پٹنہ: وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے کہا ہے کہ اردو انقلاب کی زبان ہے اور اردو کے بغیر کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ ہم بول چال کی زبان میں اردو کا استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں

افسوس ہے کہ بچپن میں ہمیں اردو سکھانے والا کوئی نہیں ملا۔ دوسری سرکاری زبان ہونے کے ناطے اردو کا فروغ ہمارا فرض منصبی ہے۔ نتیش کمار نے یہ باتیں جشن اردو کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ 2014 کے جنوری میں ہم نے جشن اردو کا پہلی بار انعقاد کیا تھا، اس لیے ہم اردو ڈائریکٹوریٹ سے کہیں گے کہ وہ ہر سال بڑے پیمانے پر جشن اردو کا انعقاد کریں۔

وزیراعلیٰ نے کہا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو کسی مذہب کی زبان نہیں ہے۔ یہ زبان ہندو، مسلم اور سکھوں کی زبان ہے۔ اس زبان میں سرکاری کام کاج ہونا چاہیے۔ اردو میں عرضیاں داخل کی جائیں، اس کا جواب بھی اردو میں دیا جائے۔ اس کے علاوہ زمین وغیرہ کے رجسٹریشن میں بھی اگر اردو میں کوئی دستاویز پیش کرتا ہے تو اس کا رجسٹریشن بھی ہونا چاہیے۔ سرکاری آرڈیننس اور اشتہارات اردو میں دیے جارہے ہیں۔ ہم چاہیں گے کہ ضلع گزٹ بھی اردو میں شائع کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اردو ہر اسکول میں پڑھائی جائے۔ میرا مقصد اردو سکھانا ہے۔ اردو اساتذہ کی بحالی زیادہ سے زیادہ ہو، اس کی کوشش کی جارہی ہے۔ اردو کو فروغ دینا ہمارا فرض ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے جو بھی کام کیا جارہا ہے وہ اردو پر کوئی مہربانی نہیں ہے بلکہ دوسری سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے یہ ہمارا فرض بنتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ 400 اردو مترجم، اسسٹنٹ مترجم وغیرہ کی بحالی کا انتظام کیا جارہا ہے۔ بہار کے ہر بلاک، سب ڈویژن اور ضلع سطح پر اردو ٹرانسلیٹر بحال کیے جائیں۔

وزیراعلیٰ نے کہا کہ اردو اور ہندی میں کوئی مخالفت نہیں ہے بلکہ یہ زبانیں ایک دوسرے کو تعاون دیتی ہیں اور ایک دوسرے کو مضبوط بناتی ہیں۔ اس موقعے پر وزیراعلیٰ نے اعلان کیا کہ اردو کے مشہور شاعر کلیم عاجز کے نام پر ایک ایوارڈ تشکیل دیا جائے گا۔ اس موقعے پر تقریب سے خطاب کرتے ہوئے نائب وزیراعلیٰ جناب تیجسوی یادو نے کہا کہ اردو بہت ہی میٹھی زبان ہے اور یہ محبت میں اضافہ کرتی ہے، لوگوں کے دلوں میں مٹھاس گھولتی ہے۔ اس زبان کو ہندو، مسلم اور سکھوں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ ہندی اور اردو دونوں سگی بہنیں ہیں۔ انھوں

نے کہا کہ اس زبان کے ذریعے ہم اپنی کلچر، اپنی ثقافت اور گنگا جمنی تہذیب کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ اس موقعے پر وزیر خزانہ عبدالباری صدیقی نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وزیراعلیٰ نے اقلیتی فلاح کا بجٹ اس بار 105 فیصد بڑھا دیا ہے اور ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اردو اور اقلیتی طبقے کے فروغ کے لیے مزید ضرورت پڑی تو اور بھی رقم دی جائے گی۔ انھوں نے جشن اردو کے انعقاد پر وزیراعلیٰ سمیت راج بھاشا، اردو ڈائرکٹوریٹ کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کے دوران اردو ادیبوں کو ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ شکریہ کی تجویز اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز کریمی نے رکھی۔ تقریب میں اقلیتی فلاح کے وزیر عبدالغفور، سنی وقف بورڈ کے چیئرمین ارشاداللہ، حج کمیٹی کے چیئرمین حاجی الیاس احمد، اردو ایڈوائزری کمیٹی کے چیئرمین شفیع مشہدی، قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ابوالکلام قاسمی نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض شگفتہ یاسمین نے خوبصورتی کے ساتھ انجام دیے۔

ڈائرکٹر اردو امتیاز احمد کریمی نے جشن اردو کے افتتاحی پروگرام میں کل ہند مشاعرہ کو شامل کرکے محبانِ اردو ذوق وشوق کو توانائی بخشی۔ پروگرام کے آغاز میں بہار گیت کے خالق ایم آر چشتی نے اپنی آواز میں بہار گیت پیش کرکے سماں باندھا۔ وہیں کل ہند مشاعرے میں عالمی شہرت یافتہ شعرائے کرام نے جشن اردو کے حُسن کو دوبالا کردیا۔ گلزار دہلوی، ماجد دیوبندی، سلطان اختر، طاہر فراز، جوہر کانپوری، شبینہ ادیب، سنیل کمار تنگ، شفیع مشہدی، ابھئے کمار بے باک، عالم خورشید، نزہت انجم، رخسار بلرام پوری، قاسم خورشید اور شنکر کیموری جیسے شعراء نے اپنی شاعری سے لوگوں کو خوب محظوظ کیا۔ منصور عثمانی نے عمدہ نظامت کی۔

جشن اردو کے دوسرے دن کے اجلاس کافی اہمیت کے حامل رہے۔ اردو کے فروغ کے تعلق سے الگ الگ موضوعات پر منعقد اجلاس میں عظیم دانشوروں اور سرکردہ شخصیتوں نے سیر حاصل گفتگو کی۔ سب سے پہلے 'اردو ہے جس کا نام' کے موضوع کے تحت اردو زبان کے فروغ کے امکانات پر غور وخوض کیا گیا۔ '' ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' کے موضوع کے تحت بہار کے چند مقتدر شعرا وادبا کی خدمات اور ان کی شخصیات کا جائزہ لیا گیا۔ '' زندگی زندہ دلی کا نام ہے'' کے موضوع کے تحت بین الاقوامی سطح کے طنز ومزاح نگاروں، کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔

اردو زبان کے فروغ وامکانات کے موضوع کے تحت منعقد ہونے والے سیمینار کی صدارت این سی پی یو ایل کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کی۔ جبکہ موضوع کی پیش کش معروف اردو افسانہ نگار وادیب غضنفر کے ذریعہ کی گئی۔ اس اجلاس میں ممتاز دانشور اور صحافی روزنامہ قومی تنظیم کے چیف ایڈیٹر ایس ایم اشرف فرید، میجر بلبیر سنگھ مرید، ڈاکٹر ریحان غنی، احمد جاوید، ڈاکٹر سید شہباز، محفوظ عالم اور ڈاکٹر زرنگار یاسمین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے حکومت کی سطح پر جذبات سے فیصلے نہیں لیے جاتے ہیں بلکہ اعداد وشمار کی بنیاد پر پالیسیاں طے کی جاتی ہیں۔ انھوں نے متعدد اعداد وشمار کے حوالے سے کہا کہ جشن اردو کے دوران جو بھی مشورے سامنے آئے ہیں اس پر عمل درآمد کے لیے اردو ڈائرکٹوریٹ کی سطح پر ایک کمیٹی کی تشکیل کی جائے۔ نظامت معروف افسانہ نگار فخرالدین عارفی نے کی۔

سیمینار کے دوسرے سیشن کے موضوع 'ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم' کی صدارت معروف افسانہ نگار اور سابق صدر شعبہ اردو، مگدھ یونیورسٹی پروفیسر علیم اللہ حالی نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ابوبکر رضوی، (راسخ عظیم آبادی)، معصوم عزیز کاظمی، (امداد امام اثر) ڈاکٹر جمیل اختر (عبدالمغنی)، ڈاکٹر محسن رضا رضوی (رشیدۃ النساء) ڈاکٹر سید رضا حیدر (جمیل مظہری) ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (جمیلہ خدابخش)، پروفیسر مولا بخش (اختر رضوی)، پروفیسر علی احمد فاطمی (مظہر امام)، پروفیسر ابوالکلام قاسمی (وہاب اشرفی) نے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے صدارتی کلمات میں تمام پڑھے گئے مقالات کی افادیت پر اختصار سے روشنی ڈالی۔ نظامت کی ذمہ داری یعقوب اشرفی نے بحسن وخوبی نبھائی۔

سیمینار کے تیسرے سیشن کے موضوع کے مطابق مختلف طنز ومزاح نگار اور طنز ومزاح پر مبنی نگارشات کے حوالے سے مقالے پڑھے گئے۔ اس سیشن کی صدارت مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر ظفر کمالی، ڈاکٹر مشتاق صدف، پروفیسر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر سید احمد قادری، حقانی القاسمی اور پروفیسر کوثر مظہری نے مقالے پڑھے۔ جبکہ معروف طنز ومزاح نگار اسد رضا اور شہرۂ آفاق مزاح نگار نصرت ظہیر نے اپنا انشائیہ پیش کرکے پوری محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ اس موقع پر اردو مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین شفیع مشہدی اور معروف افسانہ نگار پروفیسر عبدالصمد نے اس سیشن کے سلسلے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک اچھی شروعات قرار دیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر اسلم جاوداں نے انجام دیے۔ جشن اردو کا اختتامی اجلاس بھی کافی یادگار رہا۔ تام الٹر کے گروپ نے 'غالب نئی دلّی میں' کے عنوان سے جو ڈرامہ پیش کیا وہ ناظرین کے دلوں پر تادیر راج کرتا رہے گے۔ معروف گلوکارہ پینا ز مسانی کی مسحور کن آواز نے 'شامِ غزل' میں جو جلوہ بکھیرا اس سے ناظرین خوب محظوظ ہوئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 مارچ اور پریس ریلیز اردو ڈائرکٹوریٹ، پٹنہ، 28 مارچ 2017

بہار اردو اکادمی میں منعقدہ دوروزہ 'عالمی اردو کانفرنس' کا منظر

عالمی اردو کانفرنس

پٹنہ: بہار کی سرزمین پر منعقد 'عالمی اردو کانفرنس' میں شرکت کرکے میں فخر محسوس کر رہا ہوں، اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ اس میں ہماری وراثت اور مکمل تہذیب پوشیدہ ہے۔ اردو نے ملک کی آزادی کے وقت 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دے کر ہندوستانیوں کو متحد کیا اور قومی یکجہتی کا پیغام دیا۔ ان خیالات کا اظہار بہار اردو اکادمی میں منعقدہ دوروزہ عالمی اردو کانفرنس کے افتتاح کے موقعے پر گورنر عالیجناب رام ناتھ کووند نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب کو چار چاند لگانے میں کسی ایک مذہب کے قلمکاروں کا رول نہیں بلکہ ہندو، مسلم، سکھ سبھوں نے اس زبان کو مالا مال کیا ہے۔ یہ ایسی زبان ہے جو پوری دنیا میں محبت کا پیغام دیتی ہے۔ گورنر نے کہا کہ بہار کی بھی

یونیورسٹیوں میں اردو کا شعبہ کام کر رہا ہے، بچے یہ میٹھی زبان پڑھ رہے ہیں۔ اساتذہ سے اپیل ہے کہ وہ طلبا و طالبات کی ایسی ٹیم تیار کریں جو مستقبل میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کریں۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے اقلیتی فلاح کے وزیر ڈاکٹر عبدالغفور نے کہا کہ اردو کی تعلیم دینے والے اداروں کو فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے ہر فرد کو آگے بڑھنے اور اردو کی ترقی کے لیے کام کرنے پر زور دیا۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے گورنر سے اردو لکچرر کی تقرری اور خدا بخش لائبریری میں ڈائرکٹر کی بحالی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں موجود سامعین کی کثیر تعداد بتا رہی ہے کہ اردو نہیں مر سکتی، ہاں اگر کہیں اردو کو کوئی پریشانی ہو رہی ہے تو اس کے ذمے دار خود اردو والے ہیں۔ انھوں نے کہا یہ اردو اہل زبان سے وابستہ ہے، اس لیے آپ خود اردو کو لے کر آگے بڑھیں۔ خطبہ استقبالیہ میں بہار اردو اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے کہا کہ ملک اور بیرون ملک سے آئے مہمانان کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں، خاص کر محترم گورنر کی آمد کو باعث فخر اور تاریخی قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ آج جس موضوع (اردو زبان و ادب: ہند اور بیرون ہند) پر یہ دو روزہ کانفرنس شروع ہوئی ہے، وہ انتہائی حساس ہے۔ آج اردو کو جتنی محبت باہر مل رہی ہے، اتنا پیار ہم اس زبان کو نہیں دے پا رہے ہیں۔

اظہار تشکر پروفیسر اعجاز علی ارشد سابق وائس چانسلر مولانا مظہر الحق یونیورسٹی نے کیا۔ انھوں نے محترم گورنر، معزز مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ افتتاحی اجلاس میں جاوید دانش کناڈا، وفا یزداں منش تہران، شہاب الدین احمد قطر، مہتاب قدر جدہ کے علاوہ مقالہ نگاران، دانشوران اور کثیر تعداد میں ادب نواز سامعین موجود تھے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 22 مارچ 2017

اردو ادب میں فیض احمد فیض کی خدمات

چھپرہ: اردو زبان کئی زمانے سے ترقی کرتی ہوئی یہاں پہنچی ہے۔ اس کا انحصار دو تین شاعروں پر نہیں ہو سکتا۔ ہمارا سب سے بڑا شاعر میر ہے۔ میر نہیں ہوتے تو فیض تو در کنار اقبال بھی نہیں ہوتے۔ فیض کی وجہ سے ہی ترقی پسند تحریک زندہ اور پائندہ ہے۔ جب بھی اردو ادب کی تاریخ لکھی جائے گی تو فیض احمد فیض کا نام سنہرے لفظوں میں لکھا جائے گا۔ یہ باتیں بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر نسیم احمد نے جے پی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد یک روزہ قومی سیمینار میں اپنے صدارتی خطبے میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ فیض احمد فیض کی ابتدا کے چند برسوں میں رومانیت غالب تھی اور بعد میں سیاسی نہج اختیار کر لی۔ شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر نبی احمد نے خطاب کرتے ہوئے کہا فیض نے نسخہ ہائے وفا کے ذریعہ درس وفا دینے کی کوشش کی ہے۔ اس موقعے پر شعبہ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر عبدالمالک نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس کے علاوہ راجندر کالج کے سابق پرنسپل و شعبہ انگریزی کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر ایس ایم رفیق اعظم، بی کے اوجھا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سیمینار کے دوسرے مرحلہ میں ریسرچ اسکالروں نے فیض احمد فیض کی شخصیت اور فکر و فن پر اپنے مقالے پیش کیے۔ مقالہ پیش کرنے والوں میں زینب ناز، ذاکر حسین، نثار احمد، محمد رجب عالم غوثی، سید معصوم رضا، پرویز عالم شمسی، ابوارشد جمانی شامل ہیں۔ پروگرام کے درمیان میں راجندر سنگھ بیدی فکر و فن نامی سووینئر کا اجرا کیا گیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مظہر کبریا نے انجام دیے۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 28 مارچ 2017

فروغ اردو سمینار

چھپرہ: اردو محبت اور رابطہ کی زبان ہے۔ اسے کسی قوم کے ساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کی نشو و نما میں غیر مسلم شعرا و ادبا کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتی ہیں۔ یہ باتیں جے پی یونیورسٹی کے محکمہ سیاسیات کے اتچ او ڈی ڈاکٹر لال بو بو یادو نے ضلع سطحی فروغ اردو سمینار کو خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے اردو کو قومی زبان قرار دیتے ہوئے اس کی آزادی کی لڑائی میں اردو کے رول پر روشنی ڈالی وہیں موجودہ زمانے میں دیگر زبانوں میں اردو کی شمولیت اور استعمال کے حوالے سے کہا کہ اردو کا فروغ ہو رہا ہے صرف قاری اور رسم الخط کے استعمال کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ سمینار کے مہمان خصوصی سارن کے ڈی ایم ہر ہیر پرساد نے اپنے افتتاحی خطاب میں اردو کو شیریں اور شائستہ زبان بتاتے ہوئے اس کے فروغ میں حکومت بہار کی کاوشوں کا ذکر کیا۔ مہمانوں کا استقبال ضلع اردو سیل کے افسر انچارج محمد عمیر نے کیا۔ انجمن اردو ترقی ضلع سارن کے سکریٹری حاجی وزیر احمد نے اردو کے استعمال پر زور دیتے ہوئے تمام دفاتر میں اردو میں درخواست دینے کی عوام سے اپیل کی۔ اس موقعے پر اسکولی طلبا و طالبات کے ذریعے اردو کی فروغ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سمینار کے اخیر میں مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان اعزازی کی حیثیت سے ایڈیشنل کلکٹر ارون کمار، ایڈیشنل کلکٹر تعلقات عامہ سیل راجیش کمار، ڈی ڈی سی سنیل کمار موجود تھے۔ اخیر میں ضلع اردو زبان سیکشن کے انچارج افسر محمد عمیر نے اظہار تشکر پیش کی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی، 24 مارچ 2017

مہاراشٹر:

قمر حیات 38 سال سے مفت اردو سکھا رہے ہیں

ناگپور: اردو سے محبت کا دعویٰ کرنے والے تو بہت ہیں لیکن اس محبت کا ثبوت دینے والے کم ہیں۔ اس خبر کے ذریعے ہم قارئین کو 71 سالہ اس شخص کے بارے میں بتائیں گے جو اردو کی طرف راغب ہونے والوں کو گذشتہ

38 سال سے مفت میں اردو سکھانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ناگپور کے جعفر نگر سے تعلق رکھنے والے محمد قمر حیات کے شاگردوں میں 20 سال کے نوجوان بھی ہیں اور 65 سال کے معمر افراد بھی۔ انھیں اردو کی محبت اور چاشنی قمر حیات کی طرف کھینچ لائی اور قمر حیات بھی اپنی مادری زبان سے سچی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے انھیں اردو سکھا رہے ہیں۔ قمر حیات اب تک 12 سو سے زائد لوگوں کو اردو کی تعلیم دے چکے ہیں اور اب بھی یہ سفر جاری ہے۔ اردو کو ہر خاص و عام تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھانے والے قمر حیات کی درسگاہ کا وقت شام 6 بجے کا ہے اور قابل ذکر ہے کہ وور بھ ساہتیہ یونین نے اس قابل ستائش کام کے لیے انھیں ایک کمرہ مفت میں دستیاب کرایا ہے۔ 1971 میں پونے سے قمر حیات نے ڈی ایڈ کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد وہ 1972 میں ناگپور آگئے۔ یہاں اقواری کی ایک اردو اسکول میں بطور استاد مقرر ہوئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ 2003 تک چلا۔ یہاں سے ریٹائر ہوئے تو اردو کے لیے کچھ کرنے کی ٹھانی۔ اسی سوچ کے ساتھ انھوں نے نیا سفر شروع کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ریاست کے سابق وزیر اعلیٰ دیشمکھ بھی ان سے اردو سیکھ چکے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، کے ڈی مہا گاؤنکر

1981 میں قمر حیات کے پاس اردو سیکھنے آئے تھے اور اس وقت وہ 85 سال کے تھے۔ اردو سے محبت اور اسے خاص و عام تک پہنچانے کے قمر حیات کے حوصلے و جذبے کو دیکھتے ہوئے ان کے اہل خانہ نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کی اور اس کا ساتھ دیا۔ 1979 میں قمر حیات کے پہلے بیچ میں 180 طالب علم آئے تھے۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک طلبا کے ناموں سے 27 سے 28 رجسٹر بھر چکے ہیں۔ ان کا پورا ریکارڈ اب بھی سنبھال کر رکھا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، 14 مارچ 2017

مغربی بنگال:

سلی گوڑی میں ادبی پروگرام کا انعقاد

سلی گوڑی: اردو زبان و ادب کے فروغ میں مغربی

بنگال اردو اکادمی کے زیر اہتمام ایک سیمینار دین بندھو منچ سلی گوڑی میں کیا گیا جس میں اردو اکادمی کے وائس چیئر مین پروفیسر سید منال شاہ قادری اور کافی تعداد میں اسکالرز، پروفیسرز، مدارس کے اساتذہ موجود تھے، سیمینار کا افتتاح اردو اکادمی کے وائس چیئر مین اور اسٹیج پر موجود تمام معزز حضرات نے مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے کیا۔ خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے اردو اکادمی کے وائس چیئر مین منال شاہ قادری نے کہا کہ تمام زبانیں بہت پیاری ہیں اور اردو تو بہت ہی پیاری زبان ہے، یہ کسی خاص مذہب کی نہیں، بلکہ سب کی زبان ہے۔

ایس او فاؤنڈیشن اسلام پور کے سربراہ مولانا جمیل اختر اشرفی نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ راجاؤں، مہاراجاؤں کے محلوں ہی میں نہیں بلکہ درویشوں، فاقہ کشوں کے بوسیدہ اور خستہ حال جھونپڑوں میں بھی یہ زبان مختلف چیلنجوں کے ساتھ بولی جاتی ہے، نیز اپنی حلاوت و چاشنی سلاست و پاکیزگی کے سبب ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا چکی ہے۔ اخیر میں اشرفی صاحب نے مغربی بنگال اردو اکادمی کی کارکردگی پر اپنی مسرت کا اظہار کیا اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 اپریل 2017

اعزاز و اکرام:

ڈاکٹر شمیم نکہت اردو فکشن ایوارڈ

لکھنؤ: شعاع فاطمہ ایجوکیشنل ٹرسٹ اینڈ سوسائٹی کی جانب سے لکھنؤ یونیورسٹی کے مالویہ ہال میں 'ڈاکٹر شمیم نکہت اردو فکشن ایوارڈ' کی تقسیم کے سلسلے میں ہونے والی تقریب سے بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے گورنر رام نائک نے کہا کہ جس طرح تاریخ لکھنا تو آسان ہوتا ہے لیکن تاریخ رقم کرنا بہت مشکل ہے، اسی طرح سچ لکھنا آسان لیکن فکشن لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گورنر نے کہا کہ میں نے اپنی زندگی کے تجربات، جو کہ مبنی برحقیقت ہیں 'چریویتی! چریویتی' نامی کتاب میں لکھے ہیں، لیکن میرے لیے یہ بہت مشکل کام تھا۔ گورنر نے اردو زبان سے لگاؤ اور اردو کے لیے کیے گئے اپنے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان ہونے کا پورا حق ملنا چاہیے۔ انھوں نے رام نومی کے موقعے پر ہونے والی اردو کی اس تقریب کو سراہتے ہوئے کہا کہ زبان کوئی بھی ہو وہ دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر عباس رضا نیر کی نظامت میں ہونے والی اس تقریب میں گورنر رام نائک کے ہاتھوں 'ڈاکٹر شمیم نکہت اردو فکشن ایوارڈ' سال 2015 بھوپال سے آئے اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار اقبال مجید کو پیش کیا گیا، جبکہ 2016 اور 2017 کا ایوارڈ بالترتیب کولکاتا سے آئے سید محمد اشرف اور شری نگر کی ڈاکٹر ترنم ریاض کو پیش کیا گیا، جو نشان یادگار، سند توصیفی اور نقد انعام پر مشتمل تھا۔

سوسائٹی کے روح رواں پروفیسر شارب ردولوی نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یوں اردو میں بہت سے ایوارڈ دیے جاتے ہیں لیکن اردو فکشن کے لیے یہ پہلا ایوارڈ ہے۔ انھوں نے شعاع فاطمہ ایجوکیشنل ٹرسٹ اینڈ سوسائٹی کی تعلیمی سرگرمیوں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ہی تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ اردو کے معروف نقاد، ادیب و شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے 'فکشن کی سچائیاں' موضوع پر کلیدی خطبہ پیش کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس پی سنگھ نے اپنے خطاب کے دوران بتایا کہ شعبۂ اردو کی عمارت کو مزید دو منزل اور بنایا جائے گا اس کے علاوہ شعبۂ اردو کے آڈیٹوریم کو ایئر کنڈیشنڈ کیے جانے کا بھی منصوبہ ہے۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم نکہت بھلے ہی آج ہمارے بیچ نہیں ہیں لیکن ان کی خدمات انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ٹرسٹ کے صدر سید وقار رضوی اور جرمنی سے آئے ڈاکٹر عارف نقوی نے بھی اپنے خیالات ظاہر کیے۔ ٹرسٹ کی نائب صدر ڈاکٹر یاسمین انجم نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 اپریل 2017

پروفیسر مظفر شہ میری

ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر نامزد

حیدرآباد: پروفیسر مظفر شہ میری کو حکومت آندھرا پردیش نے ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کرنول کا وائس چانسلر مقرر کیا ہے۔ وہ کارگزار وائس چانسلر پروفیسر وائی نرسملو کی جگہ لیں گے۔

پروفیسر مظفر شہ میری اس وقت حیدرآباد کی سینٹرل یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں صدر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کو اردو زبان و ادب اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے 2016 میں قائم کیا گیا تھا۔ اس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق جن کے نام پر یہ یونیورسٹی قائم کی گئی ہے ایک ماہر تعلیم تھے۔ انھوں نے کرنول ضلع میں پہلا کالج عثمانیہ کالج کے نام سے قائم کیا تھا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر ان کی تقرری سے ریاست آندھرا پردیش میں اردو کو فروغ حاصل ہوگا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 مارچ 2017

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

میرٹھ: میرٹھ میں ڈرامے کے فروغ کے لیے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کو 'صفدر ہاشمی ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ ایک شال، ایک نشان یادگار اور سند کی شکل میں یہ ایوارڈ سابق ایم ایل اے اور وزیر پربھو دیال بالمیکی، درپن کلا کیندر کے سرپرست ستیش شرما، ڈائرکٹر ونود کمار بے چین اور دیگر نے عطا کیا۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے گذشتہ دس

بارہ برسوں میں میرٹھ میں ڈرامے کے فروغ کے لیے کافی کام کیا۔ ان کی سرپرستی میں تقریباً دو درجن اہم ڈرامے پیش کیے جاچکے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 مارچ 2017

ڈاکٹر سید مبین زہرا

نئی دھلی: صنفی مسائل کے تئیں اب ذرائع ابلاغ میں حساسیت بڑھ رہی ہے۔ پہلے کے مقابلے اب حالات اچھے ہیں، اہم ایشوز پر نہ صرف بات ہورہی ہے بلکہ اب

بحث کی گنجائش بھی وسیع ہورہی ہے۔ یہ باتیں 8ویں لاڈلی میڈیا ایوارڈ 16-2015 کی منعقدہ تقریب میں پاپولیشن فرسٹ کی ڈائرکٹر ڈاکٹر اے ایل شارداننے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'صنفی مسائل' کا عنوان بہت وسیع ہے، بہت سارے مسائل ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر قضیہ پر بات ہو، امید افزا بات یہ ہے کہ اب ذرائع ابلاغ کے نمائندے صنفی مسائل کو بہت ہی توجہ کے ساتھ نہ صرف لکھ رہے ہیں بلکہ فالواپ بھی کررہے ہیں۔ اس موقعے پر ایشوز اور اس سے وابستہ مسائل کو آشکار کرنے والے 37 نمائندے ایوارڈ کے ساتھ سند توصیف سے نوازے گئے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر پلاننگ کمیشن کی سابق رکن سیدہ حمید موجود تھیں۔ اس موقعے پر 13 زبانوں کے ذرائع ابلاغ بہ شمول انگریزی اور ہندی کے نمائندوں کو ایوارڈ دیا گیا جس میں اردو زمرہ میں روزنامہ 'انقلاب' میں 'سرگوشیاں' کے تحت کالم لکھنے والی ڈاکٹر سید مبین زہرا کو ایوارڈ دیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مارچ 2017

غالب اکادمی میں اسناد تقسیم

نئی دھلی: غالب اکادمی نئی دہلی کی جانب سے مشہور افسانہ نگار رتن سنگھ، مشہور ادیب، صحافی و افسانہ نگار نند کشور وکرم اور تاریخ کے موضوع میں کتاب لکھنے والے وسیم احمد سعید کی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ان تینوں حضرات کی خدمت میں ایک مومنٹو، شال اور گیارہ گیارہ ہزار روپے کا چیک پیش کیا گیا۔

اس موقعے پر غالب اکادمی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ رتن سنگھ کی کہانیاں اپنے اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ نند کشور وکرم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا جو ماہنامہ 'آجکل' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے۔

سبکدوشی کے بعد اپنا رسالہ عالمی اردو ادب نکال رہے ہیں جس کے خصوصی نمبر بہت مقبول ہوئے، وسیم احمد سعید اردو کے روایتی طالب علم نہیں رہے۔ گھر کے ماحول سے انھیں تاریخ اور آثار قدیمہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے تاریخ پر کئی کتابیں لکھ کر اردو کے سرمائے میں اضافہ کیا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی، انھوں نے رتن سنگھ اور نند کشور وکرم کی ستائش کی۔ آخر میں ڈاکٹر سید فاروق نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 مارچ 2017

اجرا

کڑی دھوپ کا سفر

نئی دھلی: پروفیسر صغیر افراہیم اکیسویں صدی میں فکشن کے معتبر ناقد ہیں، خوشی کی بات یہ ہے کہ صغیر افراہیم تنقید نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اہم افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد پروفیسر صغیر افراہیم کے افسانوی مجموعہ 'کڑی دھوپ کا سفر' کی رسم اجرا کے موقعے پر صدر شعبہ پروفیسر ابن کنول نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ میں قاضی عبدالستار کی سرپرستی میں لکھنے والے طارق چھتاری، سید محمد اشرف، پیغام آفاقی، مظفر حسین سید وغیرہ ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں، انھی میں سے ایک اہم نام پروفیسر صغیر افراہیم کا بھی ہے۔ مہمان خصوصی عارف نقوی نے صغیر افراہیم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کا افسانہ 'انجان رشتے' بہت اہم اور مفید ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مارچ 2017

پروفیسر ایس زیڈ چغتائی کی سوانح حیات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکز برائے تحقیقات فارسی میں معروف شاعر اور ماہر طبعیات پروفیسر ایس زیڈ چغتائی کی سوانح حیات 'میمورس آف داتھری کو نٹینٹس' کا اجرا عمل میں آیا۔

رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے کہا کہ چغتائی کی سوانح حیات سے وہ کافی متاثر ہوئے ہیں۔ وائس چانسلر نے کہا کہ اے ایم یو کے مختلف وائس چانسلر صاحبان کے عہد کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ سوانح حیات کے مصنف پروفیسر ایس زیڈ چغتائی نے کہا کہ سوانح حیات لکھتے وقت انھوں نے اپنی توجہ اس امر کی جانب بھی مبذول رکھی کہ دیگر واقعات کے ساتھ اس میں امریکہ سمیت ان مغربی ممالک کے واقعات بھی شامل کیے جائیں جہاں انھوں نے اپنا وقت بسر کیا۔ پروفیسر چغتائی کی سوانح حیات پر ماس کمیونیکیشن شعبہ کے پروفیسر ایم شافع قدوائی، ممتاز نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے بھی تبصرہ کیا۔ مرکز برائے تحقیقات فارسی کی ڈائرکٹر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر سعدیہ چغتائی، محترمہ ثریا چغتائی و اسعد چغتائی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 مارچ 2017

'ہم بھی ہو آئے کراچی' اور 'ابابلیں شرما گئیں'

نئی دھلی: آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کی طرف سے ادب اطفال پر مذاکرہ اور دو کتابوں کا اجرا شعبہ کے صدر پروفیسر شہپر رسول کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

فاروق سید کے سفرنامے 'ہم بھی ہو آئے کراچی' اور رونق جمال کے افسانچوں کا مجموعہ 'اور ابابلیں شرما گئیں' کے اجرا کے موقعے پر پروفیسر غضنفر، فیروز بخت احمد، شکیل جمالی، آصف اعظمی، پروفیسر ندیم خان، ڈاکٹر وسیم راشد، طٰہٰ نسیم، محمد خلیل، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، چشمہ فاروقی، فاروق اعظم قاسمی وغیرہ موجود تھے۔ آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی کے صدر سراج عظیم نے دونوں کتابوں اور مصنفین کا تفصیلی تعارف پیش کیا اور سوسائٹی کے مستقبل کے منصوبوں پر روشنی ڈالی۔ ایم رحمٰن نے 'ہم بھی ہو آئے کراچی'، 'اور ابابلیں شرما گئیں' اور بچوں کے ادب کی صورت حال پر اظہار خیال کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر شہپر رسول نے دونوں کتابوں کے مصنفین کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ بچوں کے ادب پر جو لوگ کام کررہے ہیں یقیناً بہت بڑا کام ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مارچ 2017

■

عالمی اردو کانفرنس کی تصویری جھلکیاں

داستان گوئی کا ایک منظر

مشاعرے کا ایک منظر

محفل افسانہ

URDU DUNIYA Monthly, May-2017, Vol.19, Issue:05
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/04/2017
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

ماہنامہ 'خواتین دنیا' کا اجرا کرتے ہوئے مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند عزت مآب پرکاش جاوڈیکر

مہمانان کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025